خوفناک 5 کہانیاں

مقبول جہانگیر

وہ اکثر یاد آتا ہے

مقبول جہانگیر میرا دوست تھا ـــــ پیارا اور مخلص دوست ـــــ وہ ایک کھرا اور سچّا انسان تھا۔ اس کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا ہر مکتبِ فکر کے لوگ اس پر اعتبار کرتے اور اس سے پیار کرتے تھے۔ وہ ہر ایک کے کام آنے کی کوشش کرتا، ہر ایک کو مسرور و شادماں دیکھنے کی تمنا کرتا اور ہر ایک کے دُکھ درد سمیٹ لینے کی سعی کرتا۔

وہ قلم کا مزدور تھا۔ لکھنا اس کا پیشہ تھا۔ وہ اپنی تحریروں کے ذریعے ایک ایسی مثالی دنیا کی تخلیق کی خواہش رکھتا تھا جس میں کوئی دُکھی، کوئی غمزدہ نہ ہو۔ اس کے قاری اس کی تحریروں کے منتظر رہتے۔ اس نے ہزاروں صفحات لکھ ڈالے۔ اس کے قلم میں بلا کی روانی اور تحریر میں بلا کی شادابی تھی جس موضوع پر قلم اٹھایا اس کا حق ادا کر دیا۔

وہ ایک خوش طبع اور ہنس مکھ شخص تھا۔ وہ اپنے آزردہ خاطر اور پریشان حال دوستوں کے دُکھوں پر اپنے خوبصورت لفظوں کے پھاہے رکھتا تھا۔ اس کی محفل میں کوئی شخص غمگین نہیں رہ سکتا تھا۔

ـــــ لیکن وہ اپنی ذات میں ایک ٹوٹا ہوا شخص تھا۔ وہ اپنے ناتواں جسم میں بے شمار بیماریاں لیے پھرتا تھا ـــــ اور بالآخر ہسپتال کے بستر پر جا لیٹا ـــــ میں جب

اس کی عیادت کے لیے پہنچا تو وہ بیہوش پڑا تھا ـــــ پھر وہ اپنی جاں نثار بیوی اور دو معصوم بچیوں اور سینکڑوں دوستوں کو روتا بلکتا چھوڑ کر راہیِ ملکِ بقا ہوا۔ سدا رہے نام اللہ کا!

وہ جب بھی یاد آتا ہے تو دل سے اِک ہُوک سی اٹھتی ہے ـــــ اور وہ اکثر یاد آتا ہے!

سعید اے شیخ

قارئینِ کرام!

حسبِ وعدہ مقبول جہانگیر (مرحوم) کی نئی کتاب "پانچ خوفناک کہانیاں" پیشِ خدمت ہے۔ اس کے بارے میں کیا کہوں؟ وہی آپ کی جانی پہچانی تحریر اور وہی دلچسپ اندازِ بیاں کہ ایک مرتبہ پڑھنا شروع کر لیں تو کتاب ختم کیے بغیر چین نہ آئے۔ میں زیادہ دیر تک آپ کے اور کتاب کے درمیان حائل نہیں رہنا چاہتی۔ کتاب شروع کیجیے۔ آپ یقیناً حسبِ سابق اِس میں کھو کر رہ جائیں گے!

امینہ عنبریں

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

فہرست

آخری تصویر

تین سو برس پرانی وہ تصویر آج بھی ہمارے گھر میں موجود ہے۔ اس کا رنگ روغن، کاغذ، لکڑی کا وہ بیش قیمت فریم بھی ویسا ہی ہے جیسا تین سو برس پہلے تھا۔ماہ وسال کی اس طویل گردش نے تصویر کا کچھ نہیں بگاڑا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے مصور نے ابھی چند لمحے قبل اسے مکمل کرکے فریم میں جڑا ہے اور اگر ہمارے پاس قدیم کاغذات محفوظ نہ ہوتے تو یہ ثابت کرنا دشوار ہو جاتا کہ تصویر مغل شہنشاہ شاہ جہان کے زمانے کے شہرۂ آفاق مصور نادر زماں خان کے مُوقلم کا شاہکار ہے۔ جی ہاں، وہی نادر زماں جس کا فن مانی و بہزاد کے ہم پلہ تھا اور جس کے استاد تبریزی خاں مصور کا تذکرہ اس دور کی ہر مستند تاریخ کے اوراق کی زینت ہے۔

میں جس تصویر کا ذکر کرتا ہوں، وہ نادر زماں خاں کی آخری تصویر تھی۔ کہتے ہیں اس کے بعد اس نے اپنے تمام برش، قلم اور رنگ و روغن ضائع کر دیے تھے اور مرتے دم تک کوئی اور تصویر بنانے کی قسم کھالی تھی۔ اس کے قدر دانوں نے بہت کوشش کی کہ نادر زمان اپنی قسم توڑنے پر رضامند ہو جائے۔ اس کے لئے وہ اسے ہر وہ شے دینے کو آمادہ تھے جو نادر زماں ان سے طلب کر سکتا تھا لیکن بے سود --- دنیا کی بڑی سے بڑی قیمتی چیز، زر و جواہر اور ہر آسائش اس کے نزدیک ہیچ تھی۔ اس نے کہا وہ نادر زماں جو تصویریں بنایا کرتا تھا، مرچکا۔ اس کی روح

پژمردہ ہو چکی' اب اس کا قالب ایک ٹھنڈی راکھ ہے جس میں حرارت کی ایک چنگاری بھی نہیں ہے۔

نادر زماں نے مصوری کیوں ترک کی' اس کے پیچھے ایک المناک اور درد انگیز داستان پھیلی ہوئی ہے۔ ایسی داستان جو ابھی تک سینوں مین دفن تھی' لیکن اب تین صدیاں گزرنے کے بعد میں اسے کاغذ پر اتارنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

یہ داستان میرے جدِ اعلیٰ مرزا ترک تازخان کو خود نادر خاں نے سنائی تھی اور یہ تصویر بھی اسی نے انہیں عطا کی تھی۔ سر سری طور پر دیکھیں' تو اس میں کوئی خاص بات محسوس نہیں ہوتی' لیکن جوں جوں نظر گہری ہوتی ہے' توں توں تصویر کے خال و خط ابھرتے ہیں' آہستہ آہستہ تصویر کا ماحول جاندار ہونے لگتا ہے۔ لکیریں زاویے' قوسیں' دائرے اور رنگ سبھی سانس لیتے محسوس ہوتے ہیں اور تماشائی اپنے آپ کو اس جیتے جاگتے ماحول کا ایک حصہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور یہی اس تصویر کی خوبی ہے۔

پس منظر میں ایک عالی شان حویلی کا سجا سجایا کمرہ' فرش پر قالین بچھا ہوا' محراب نما دروازوں اور کھڑکیوں پر ریشمی پردے آویزاں' چھت گیری کے عین درمیان انتہائی بیش قیمت نفیس جھاڑ لٹکا ہوا۔ دائیں بائیں دیواروں پر کنول اور فانوس' کمرے کے وسط میں ایک پری چہرہ حور پیکر نازنین سر سے پاؤں تک سفید ریشمی لباس پہنے کھڑی ہے۔ اس کی عمر سولہ سترہ برس کی ہوگی۔ اس پر حیا اور معصومیّت کے ساتھ ساتھ کسی قدر گھبراہٹ کے آثار نمایاں ہیں۔ دلفریب چہرے پر باریک جالی کی نقاب ہے جس میں سے اس کا روئے تاباں جھلک رہا ہے۔ ترشے ہوئے حسین لبوں پر مصور نے نہایت چابک دستی سے کپکپاہٹ کا وہ جذبہ بھی ہمیشہ کے لئے قید کر دیا ہے جسے دیکھنے کے لیے بہت باریک بینی کی ضرورت ہے۔ پھیلے ہوئے سایوں سے پتا چلتا ہے کہ جھٹ پٹے کا وقت ہے۔ اس حسین لڑکی کے ہاتھ میں چھوٹا سا نازک شمع دان ہے جس میں شمع جل رہی ہے اور اس کی روشنی سیدھی اس کے چہرے پر پڑ رہی ہے۔کچھ فاصلے پر ایک قوی ہیکل ادھیڑ عمر

کرخت صورت آدمی سیاہ لباس پہنے موجود ہے۔ اس کی آنکھیں انتہائی چمک دار' ہونٹ خونِ کبوتر کی مانند سرخ اور ناک طوطے کی چونچ کی طرح مڑی ہوئی ہے۔سر پر چھوٹی سی سیاہ پگڑی ہے جس کی کلغی میں ایک نادر ہیرا جڑا ہے۔اس ہیبت ناک شخص کے دائیں پہلو میں تلوار لٹکی ہے اور اس کا جڑاؤ دستہ اس کے ہاتھ میں ہے اور اس کے انداز سے صاف پتا چلتا ہے کہ وہ میان سے تلوار کھینچنا چاہتا ہے' بلکہ غور سے دیکھا جائے' تو تلوار کسی قدر کھینچی ہوئی بھی نظر آجائے گی۔ اس شخص کے گلے میں موتیوں اور ہیروں کے کئی ہار بھی پڑے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے یہ شخص کوئی بڑا مغل عہدیدار ہے۔ چہرے کے نقوش اگرچہ واضح نہیں۔ تاہم صاف پتا چلتا ہے کہ اس کا تعلق منگول نسل سے ہے۔ وہی کلوں کی ابھری ہوئی ہڈیاں' وہی بھاری لمبی ناک' وہی موٹے موٹے ہونٹ اور غلافی آنکھیں' لیکن بے حد روشن--- ستاروں کی مانند چمکتی ہوئی۔ دیکھنے والا پہلی نظر میں ہی فیصلہ دے دے گا کہ یہ ایک ایسے شخص کا چہرہ ہے جو سفاکی' درندگی اور شقاوت میں اپنے ان آبا و اجداد کا ہم پلہ ہو گا جو مفتوح اور محکوم قوموں کے افراد کی کھوپڑیوں کے مینار اپنی فتح کی یادگار میں تعمیر کیا کرتے تھے اور جن کی لغت میں رحم' ہمدردی' شفقت اور محبت کے الفاظ کبھی شامل نہیں رہے۔ مصور نے اس کی شبیہہ اتارنے میں اپنے فن کا پورا زور صرف کر دیا ہے اور یہ بات کتنی حیرت انگیز ہے کہ اس نازنین کو دیکھ کر ناظر کے ذہن میں جو پاکیزہ اور اچھے جذبات پیدا ہوتے ہیں' اس مغل عہدیدار کی تصویر پر نگاہ ڈالتے ہی ہوا ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ نفرت اور حقارت کے جذبات ابھرنے لگتے ہیں۔ کوئی شخص بھی زیادہ دیر تک اس تصویر پر نگاہ جمانے کی تاب نہیں رکھتا۔

اور یہ حور وش نازنین فیروزہ تھی۔ تبریزی خان مصور کی حقیقی بھانجی' جسے اس نے باپ اور ماں بن کر پالا تھا۔ جس زمانے میں طاعون پھیلا اور بے شمار لوگ لقمہ اجل ہوئے' تبریزی خان کا سارا خاندان اس وبا کی لپیٹ میں آگیا تھا' پھر اچانک ایک ایک کر کے سبھی رخصت ہو گئے۔ بھرے پرے گھر میں صرف دو فرزند بچے۔ فیروزہ اور تبریزی۔ فیروزہ ان دونوں پانچ سال کی تھی۔ تبریزی دل و جان سے اپنی اس ننھی

بھانجی کو چاہتا تھا۔ اس نے بڑے ناز و نعم میں اس کی پرورش کی اور تعلیم و تربیت سے بھی آراستہ پیراستہ کیا۔ فیروزہ جوان ہوئی تو جیسے قیامت اپنے ساتھ لے کر آئی۔ بڑے بڑے جاگیردار' رؤسا اور نواب اس کی طلب گاری کے خواب دیکھنے لگے۔ یہاں تک کہ عظیم شاہی خاندان کے شہزادوں نے بھی فیروزہ کا ذکر سنا اور درباری مصوروں نے سو حیلوں بہانوں سے اس کی عمدہ سے عمدہ تصویریں کھینچ کر محلوں میں پہنچائیں.....

لیکن تبریزی کوئی معمولی آدمی نہ تھا۔ سب جانتے ... تھے کہ وہ شہنشاہ کا منظورِ نظر مصور ہے اور اگر اس نے کسی کی شکایت شہنشاہ گیتی پناہ سے کردی' تو اس کا زن بچہ کولہو میں پلوا دیا جائے گا۔ تبریزی جانتا تھا ابھی فیروزہ معصوم ہے' اسے دنیا کی اونچ نیچ اچھے بُرے کی تمیز نہیں ہوئی شعور ذرا پختہ ہو جائے' تب اس کی شادی کرے گا..... لیکن اسے کیا خبر تھی کہ فیروزہ کا دل کبھی کا گھائل بھی ہوچکا اور تبریزی خاں کے نوجوان شاگرد نادر زماں کو وہ روح کی گہرائیوں سے زیادہ چاہنے لگی ہے کچھ یہی کیفیت نادر زماں کی بھی تھی۔ اس نے لاکھ کوشش کی وہ فیروزہ کی طرف مائل نہ ہو' اس کا تصور' اس کا خیال ذہن سے جھٹک دے' مگر بے سود۔ اس کی ہر کوشش بری طرح ناکام ہو چکی تھی۔ وہ خوب جانتا تھا کہ تبریزی خاں اپنی بھانجی کی شادی کسی ایسے شخص سے کرے گا جس کی کوئی حیثیت ہو۔ اس حسین لڑکی کے لیے اونچے مالدار گھرانوں کے اچھے سے اچھے نوجوانوں کی کمی نہ تھی' پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ تبریزی خاں' فیروزہ کا ہاتھ نادر زماں کے ہاتھ میں دے دے جس کے پاس کھانے کو تھا نہ پہننے کو اور وہ اپنی ضروریات کے لیے ہر طرح اپنے استاد کا محتاج تھا۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ خود نادر زماں مردانہ حسن و صحت کا بہترین نمونہ تھا۔ خوش رَو' خوش نہاد' خوش اخلاق اور خوش جمال' اگر وہ مفلس نہ ہوتا تو بے شک فیروزہ کے لیے وہ بہترین شوہر ثابت ہوسکتا تھا' لیکن دولت مند بننے اور نام پیدا کرنے کے لئے بھی بڑی محنت کی ضرورت تھی۔ وہ اپنے کام میں کھو جاتا۔ دن رات تصویریں بناتا۔ کئی اور شاگرد بھی تبریزی خاں سے مصوری سیکھنے اس کے عالی شان مکان پر آیا کرتے'

لیکن جتنے ادب اور سعادت مندی سے نادر زماں اپنے استاد سے پیش آتا' ان میں سے کوئی بھی شاگرد پیش نہ آتا۔ یہی وجہ تھی کہ بہت جلد تبریزی خاں اس پر اعتماد کرنے لگا۔ اسے معلوم ہوگیا کہ نادر زماں شریف نوجوان ہے' اس پر بھروسا کیا جاسکتا ہے اور اسے کام سیکھنے کا شوق بھی ہے' چنانچہ اس نے نادر زماں کو اپنی حویلی کا ایک کمرہ دے دیا اور اس کی تمام ضروریات کا کفیل بن گیا۔

پھر وہ دن بھی آیا جب نادر اور فیروزہ کی آنکھیں چار ہوئیں۔ ایک نہ بجھنے والی آگ تھی جس میں دو ذی روح جلنے لگے۔ ملاقاتیں بڑھیں' بے تکلفی ہوئی' عہدوپیمان باندھے گئے' ہمیشہ ایک ساتھ رہنے اور مرنے کی قسمیں کھائی گئیں۔ سب کچھ جاننے اور سمجھنے کے باوجود ایک دوسرے سے محبت کیے چلے جارہے تھے اور ان کی اس محبت کا علم خدا کے سوا کسی کو نہ تھا۔

دن تیزی سے گزر رہے تھے۔ فیروزہ اور نادر کا عشق عروج پر آیا' لیکن اس میں کسی قسم کی نفسانیت کا شائبہ تک بھی نہ تھا وہ گھنٹوں آمنے سامنے بیٹھے باتیں کرتے رہتے اور وقت پَر لگا کر اڑنے لگتا۔ نادر زماں اس شام اکیلا اپنے تصویر خانے میں موجود تھا اور ایک تصویر بنانے میں ایسا منہمک کہ اسے دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہ تھی۔ وہ دراصل ایک مغل شہزادی کی تصویر کئی دنوں سے بنا رہا تھا اور عجیب بات تھی کہ ہمیشہ تصویر میں کہیں نہ کہیں خامی رہ جاتی یا کوئی ایسی غلطی سرزد ہو جاتی کہ پہلا خاکہ رد کرکے دوسرا خاکہ بنانا پڑتا۔ اب تک وہ چار پانچ خاکے بناکر ضائع کر چکا تھا اور چھٹا خاکہ بنانے میں لگا ہوا تھا۔ بہت دیر بعد اسے پتا چلا کہ خامی دراصل کہاں ہے۔ ہوتا یہ تھا کہ غیر ارادی طور پر وہ شہزادی کی آنکھیں' پیشانی اور ہونٹ بالکل فیروزہ کے سے بنا دیتا اور جونہی تصویر اپنے خدو خال سمیت ابھرنے اور نمایاں ہونے لگتی' نوجوان مصور گھبرا کر مُوقلم ہاتھ سے پھینک دیتا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر ہر بار فیروزہ ہی کی تصویر کیوں بن جاتی ہے جبکہ اس کی نگاہوں کے بالکل قریب ایک اونچی سی تپائی پر اس مغل شہزادی کی ایسی تصویر دھری تھی جسے کسی اور مصور نے بنایا تھا' لیکن یہ تصویر

شہزادی کو پسند نہیں آئی اور شہنشاہ نے تبریزی خاں کو حکم دیا تھا کہ وہ اس کی پیاری بیٹی کی نئی تصویر بنائے۔ تبریزی خاں نے یہ کام نادر خاں کے سپرد کر دیا تھا اور جتنی مہلت اسے دی گئی تھی' وہ بس ختم ہی ہونے والی تھی' چنانچہ نادر زماں اپنے تمام حواس مجتمع کر کے اور مصمم ارادے کے ساتھ کہ اب فیروزہ کا خیال بھی اپنے پاس پھٹکنے نہ دے گا' نیا خاکہ بنانے میں جسم اور جاں کی تمام توانائیوں کے ساتھ مصروف تھا۔ اسے خبر بھی نہ ہوئی کہ کب تبریزی خاں کے دوسرے شاگرد رخصت ہوئے' کب سورج غروب ہوا اور کب حویلی کا بوڑھا ملازم وہ شمع دان روشن کر کے وہاں رکھ گیا جس میں لمبی لمبی سفید چھ شمعیں جلا کرتی تھیں۔ اس دوران میں ایک بار بھی فیروزہ کا خیال نادر زماں کے ذہن میں نہ آیا۔ خاکہ مکمل کرنے کے بعد اس نے تنقیدی نگاہ ڈالی اور یہ دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا کہ اس مرتبہ وہ اپنی کوششوں میں سو فیصد کامیاب رہا۔ یہ خاکہ شہزادی کا تھا جو بلاشبہ حسین و جمیل تھی' لیکن فیروزہ کے حسن و جمال کی برابری نہ کر سکتی تھی۔

نادر زماں نے سرمئی چاک رکھ کر چینی کی پیالی اور ننھا سا برش سنبھالا۔ اس پیالی میں گلابی رنگ تھا اور وہ اب خاکے میں رنگ بھرنے کا آغاز کرنے والا تھا۔ ابھی اس نے دو تین مرتبہ ہی برش چلایا ہو گا کہ عقب میں ہلکی سی آہٹ سن کر وہ چونکا اور ایک دم مڑ کر دیکھنے لگا۔ اس کا خیال تھا یہ بے پاؤں کمرے میں آنے والا فیروزہ کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ شام کو' سورج چھپنے کے فوراً بعد چند لمحوں کے لیے وہ اس کے کمرے میں آتی تھی اور وہ بھی اس وقت جب کہ تبریزی خاں حویلی میں موجود نہ ہو۔ اپنے ماموں کی موجودگی میں اس کی مجال نہ تھی کہ حویلی کے مردانے حصے میں بغیر اجازت قدم بھی رکھ سکے' یہ اور بات تھی کہ تبریزی خاں نے اسے کبھی نادر زماں سے پردہ کرنے کا حکم نہ دیا تھا۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ وہ نادر زماں کو گھر کے اندر بلا لیا کرتا اور وہ تینوں رات کو کھانا ایک ہی دسترخوان پر بیٹھ کر کھاتے تبریزی خان کو اپنے نوجوان شاگرد پر کچھ ایسا ہی بھروسا تھا۔

نادر زماں نے جونہی مڑ کر دیکھا۔ اس کا بدن یک لخت پتھر کا ہو گیا۔ فیروزہ کے بجائے اس کے سامنے ادھیڑ عمر کا ایک قوی ہیکل' بدشکل شخص سر سے پاؤں تک سیاہ چغہ پہنے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں بے حد چمک دار' موٹے موٹے ہونٹ سرخ اور گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ اس کے سر پر سیاہ پگڑی تھی جس کی کلغی میں بیش قیمت ہیرا جڑا ہوا جگمگا رہا تھا۔ دائیں پہلو میں تلوار لٹک رہی تھی جس کا دستہ جڑاؤ تھا۔ یہ اجنبی کون ہے؟ کدھر سے آیا اور اس کمرے میں کیا کر رہا ہے؟ یہ تھے وہ سوال جو معاً نوجوان مصور کے ذہن میں ابھرے اپنے لباس اور صورت شکل سے وہ کوئی مغل سردار یا بڑا عہدیدار نظر آتا تھا۔ مصور نے یہ بھی دیکھا کہ اجنبی کے بائیں ہاتھ میں آبنوس کی خوبصورت چھڑی بھی ہے جس کی شام خالص سونے کی بنی ہوئی تھی۔

اجنبی سے نگاہ دو چار ہوتے ہی مصور کو یوں محسوس ہوا' جیسے اس کی کھوپڑی میں جسم کا سارا خون منجمد ہو گیا ہو۔ دہشت کی ایک انتہائی سرد لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں اترتی چلی گئی۔ عجیب بات تھی کہ حویلی کا صدر دروازہ اور دوسرے تمام چھوٹے دروازے کھڑکیاں اندر سے ہمیشہ بند رہتی تھیں اور کوئی پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔ پھر یہ شخص کدھر سے آیا؟

نادر زماں نے گھبرا کر منہ پھیر لیا۔ اس میں مزید آنکھیں چار کرنے کی ہمت نہ تھی۔ نووارد اب بھی بے حس و حرکت اسی انداز میں اپنی جگہ کھڑا رہا۔ اب اس کی نظریں اس خاکے پر جمی ہوئی تھیں جس میں مصور رنگ بھرنے والا تھا۔

"جناب کیا آپ آقا تبریزی سے ملاقات کے لیے تشریف لائے ہیں؟" مصور نے بہت ادب سے پوچھا۔

"ہاں اسی لیے آیا تھا۔" اجنبی نے کرخت اور بھاری آواز میں کہا۔ "لیکن اس وقت وہ مکان میں نہیں کیا تم اسے میرا پیغام دے سکتے ہو؟"

"ارشاد فرمائیے .... آپ کا پیغام من و عن ان تک پہنچاؤں گا"۔ نوجوان مصور نے گردن کو خم دے کر کہا۔ "آپ مجھ پر پورا بھروسا کر سکتے ہیں۔ میں

آقائے تبریزی کا ادنیٰ شاگرد نادر زماں ہوں۔"

"ہوں ....." اجنبی نے حقارت سے نادر زماں کو دیکھا اور اسی نخوت بھرے لہجے میں بولا "کہہ دینا اس سے کہ صوبے دار جلال آباد تشریف لائے تھے اور کل اسی وقت وہ اپنی حویلی میں حاضر رہے ہم پھر آئیں گے۔ ایک اہم معاملے پر ہم تبریزی سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

ان الفاظ کی ادائیگی کے ساتھ ہی وہ مڑا اور نپے تلے قدم اٹھاتا کمرے سے باہر چلا گیا۔ایک نرالی بات یہ تھی کہ جاتے ہوئے اس کے قدموں کی آہٹ بالکل پیدا نہ ہوئی۔تین چار لمحے نادر زماں سکتے کے عالم میں اپنی جگہ کھڑا رہا۔ ایسا پُر اسرار آدمی جیسا یہ جلال آباد کا صوبے دار تھا' پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس نے جلدی سے حویلی کے اندرونی صحن کی جانب کھلنے والی کھڑکی سے جھانکا۔ یہاں سے صدر دروازہ بخوبی نظر آتا تھا۔ نادر زماں کا خیال تھا وہ اس مہیب شخص کو باہر جاتے دیکھ سکے گا' لیکن وسیع صحن ویران پڑا تھا۔ بر آمدوں میں سناٹا اور صدر دروازہ اندر سے بند۔ ویسے بھی اسے کھولنا اکیلے آدمی کی قوت سے باہر تھا۔ دروازے کے دائیں پٹ کے نچلے حصے میں بنا ہوا چھوٹا سا کھڑکی نما دروازہ بھی بند تھا۔ نادر زماں نے اب دوڑ کر وہ کھڑکی کھولی جو اس کے کمرے کے بیرونی رخ پر تھی اور اس کھڑکی سے وہ گلی میں دور تک کا منظر دیکھ سکتا تھا۔ خاصی دیر تک وہ پلک جھپکائے بغیر گلی میں آتے جاتے اِکا دُکا لوگوں کو دیکھتا رہا' لیکن صوبے دار جلال آباد کا نام ونشان نہیں تھا۔

خدا ہی بہتر جانتا ہے اسے زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا' وہ آپ ہی آپ کہنے لگا۔ کسی صورت وہ میری نگاہوں سے بچ کر باہر نہیں جاسکتا .... لیکن وہ پھر کہاں گیا؟ اس سوال نے نادر زماں کو حیران و پریشان کر ڈالا۔ ممکن ہے حویلی اور دروازے کے مابین کوئی خفیہ راستہ بھی ہو۔ اس نے سوچا۔ ہاں ایسا ہی ہوگا۔ اس قسم کی عظیم الشان پرانی حویلیوں میں اکثر و بیشتر خفیہ راستے' سرنگیں اور تہہ خانے بنوائے جاتے ہیں تاکہ نازک اوقات میں ان کے ذریعے فرار ہوا جاسکے یا ان میں

پناہ لی جاسکے اور جلال آباد کا یہ صوبے دار یقیناً" ایسے ہی کسی خفیہ راستے سے ضرور آگاہ ہے تاہم یہ کتنی غیر مناسب بات ہے کہ کوئی شخص یوں چپ چپاتے حویلی میں داخل ہو اور .....

وہ اپنے تصویر خانے سے باہر نکلا۔ اس نے دروازہ بند کرکے لوہے کا بھاری قفل اس میں ڈالا اور کنجی بڑی احتیاط سے اپنے لمبے چغے کی اندرونی جیب میں رکھی پھر حویلی کے وسیع و عریض صحن کا بغور معائنہ کیا۔ دونوں طرف برآمدوں میں مشعلیں روشن تھیں جن کی روشنی پورے صحن میں پھیلی ہوئی تھی۔ نادر زماں نے دونوں بر آمدوں کی سنگین دیواروں کو ہاتھوں سے خوب ٹھوک بجاکر دیکھا۔ اس کا خیال تھا شاید انہی دیواروں میں کہیں خفیہ راستہ موجود ہوگا مگر بے سود ..... کہیں سے بھی دیوار نے کھوکھلے پن کا ثبوت نہ دیا۔ آخر میں وہ تیس ہاتھ اونچے اور دس ہاتھ چوڑے صدر دروازے کی طرف گیا جو لکڑی کے موٹے موٹے شہتیروں سے بنا تھا اور جس کے اوپر نیچے اور درمیان میں لوہے کی بھاری چادریں میخیں ٹھونک کر لگائی تھیں۔یہ دروازہ کوئی ڈیڑھ سو برس سے اسی طرح کھڑا تھا بہت کم مواقع ایسے ہوتے جب اسے پورا کھولا جاتا۔ وہ بھی اس وقت کہ کوئی امیر یا وزیر اپنے ہاتھی پر سوار ہوکر حویلی کے اندر آتا ورنہ آمدورفت کے لئے بغلی چھوٹے دروازے ہی استعمال کئے جاتے یا وہ چھوٹا سا کھڑکی نما دروازہ جو بڑے دروازے میں بنایا گیا تھا اور جس میں سے ایک اونچے قد کا آدمی گردن جھکائے بغیر اندر داخل نہ ہوسکتا تھا۔ سبھی دروازے اندر سے مقفل اور ان کی کنجیاں بوڑھے چوکیدار افضل بیگ کے پاس تھیں۔

اتنے میں افضل بیگ حویلی کے زنانہ حصے سے نکل کر مردانہ حصے میں آیا۔ اس نے نادر زماں کو صدر دروازے کے قریب کھڑے دیکھا' تو سخت حیران ہوا۔ قریب آکر کہنے لگا۔ "کیا بات ہے برخوردار' کچھ پریشان سے نظر آتے ہو۔ خیر تو ہے؟"

"کچھ نہیں بابا" اس نے گھبرا کر جواب دیا۔ "میں دیکھ رہا ہوں۔ اس حویلی

میں ان دروازوں کے علاوہ آنے جانے کا کوئی اور راستہ بھی ہے یا نہیں۔"

افضل بیگ نے گھور کر نوجوان مصور کو دیکھا۔ اس کی بوڑھی وفادار آنکھوں میں شک و شبے کے سائے لرزنے لگے ..... کوئی اور راستہ؟ بوڑھے نے بلند آواز سے کہا۔" کیا کہتے ہو نادر زماں۔ آخر تمہیں اس وقت یہ سوجھی کیا ہے؟"

"اوہ کچھ نہیں کچھ نہیں ..... بس یونہی"..... نادر نے بات ٹالنا چاہی۔ اس نے سوچا جلال آباد کے پر اسرار صوبے دار کی آمد کا قصہ آقائے تبریزی کے سوا ابھی کسی اور سے کہنا مناسب نہ ہوگا۔ "یہ بتاؤ بابا جان کہ آقا حویلی میں تشریف رکھتے ہیں یا نہیں؟"

"وہ آج ذرا دیر سے آئیں گے۔" بوڑھے نے جواب دیا۔ "کسی امیر کے ہاں ان کی دعوت ہے' کہہ گئے تھے کہ دستر خوان پر ان کا انتظار نہ کیا جائے۔ فیروزہ کی طبیعت بھی کچھ خراب ہے اس نے کہہ دیا ہے کہ وہ کھانا نہ کھائے گی' آپ کھانا اندر کھائیں گے یا باہر؟"

"فیروزہ کی طبیعت خراب ہے؟" نادر زماں ایک دم بے چین ہوگیا۔ "کب سے؟"

"ابھی کوئی نصف ساعت گزری ہوگی"۔ بوڑھے نے کہا۔ فیروزہ کو شاید وہ تبریزی سے بھی زیادہ چاہتا تھا۔ "وہ بیٹھی ایک کتاب دیکھ رہی تھی' یکایک اس پر کپکپی طاری ہو گئی کہنے لگی بابا' مجھے جلدی سے کمبل اوڑھا دو۔ میں نے اسے کمبل اوڑھا دیا۔ کپکپی پھر بھی نہ گئی' تب میں نے ایک اور کمبل اس پر ڈال دیا اور انگیٹھیاں بھی سلگا دیں' اس کا رنگ پیلا پڑگیا تھا اور وہ بار بار کہہ رہی تھی۔ 'بابا مجھے کیا ہوگیا ہے' میرا دل کیوں بیٹھا جارہا ہے'۔ میں وہاں سے آکر تمہیں بتانا چاہتا تھا' لیکن فیروزہ نے مجھے اپنے پاس سے ہلنے بھی نہ دیا پھر وہ آپ ہی آپ بڑ بڑانے لگی'۔ بابا خدا کے لیے یہاں سے نہ جاؤ..... اگر تم چلے گئے تو وہ یہاں آ جائے گا..... اس وقت وہ مکان میں موجود ہے ..... مجھے اس سے ڈر لگتا ہے ..... وہ بہت خوفناک ہے ..... بابا یہاں سے نہ جانا..... مجھے تنہا مت چھوڑنا.....'

فیروزہ کی یہ حالت دیکھ کر میں بے حد خوف زدہ ہوا۔ اس کے اندر سے کوئی اور ہی آواز آ رہی تھی ..... دفعتہ" وہ پرسکون ہوگئی' کپکپی جاتی رہی ..... اس نے کمبل اتار کر پرے پھینک دیئے اور ناراض ہوکر بولی' یہ دہکتی انگیٹھیاں یہاں کس لیے لائی گئی ہیں۔ انہیں فوراً ہٹادو.....' میں نے حکم کی تعمیل کی۔ اب وہ بستر میں لیٹی بے خبر سو رہی ہے"۔

"نادر زماں دم بخود یہ کہانی سنتا رہا۔ بوڑھے افضل بیگ کے ہر جملے پر اسے اپنے دل کی دھڑکن بند ہوتی ہوئی محسوس ہوئی ..... کوئی اس کے قلب کی اتھاہ گہرائیوں سے پکار رہا تھا ..... فیروزہ..... فیروزہ..... فیروزہ.....

افضل بیگ کے ساتھ وہ پہلی بار فیروزہ کی خواب گاہ میں داخل ہوا' تو اس کا تمام بدن مارے ہیبت کے پسینے میں تر تھا۔ ایک خوبصورت چھپرکٹ پر مخملی گدّوں اور ریشمی چادروں میں لپٹی ہوئی اس کی محبوبہ خوابِ ناز کے مزے لوٹ رہی تھی۔ اس کے معصوم چہرے پر سکون تھا اور کسی خوشگوار خواب کے زیر اثر اس کے لب مسکرا رہے تھے۔ نادر زماں مطمئن ہوکر دبے پاؤں اپنے کمرے میں لوٹ گیا۔

"صوبے دار جلال آباد؟" آقائے تبریزی نے نادر زماں کے تصویر خانے میں ٹہلتے ہوئے کوئی دسویں بار یہ جملہ دہرایا۔" صوبے دار جلال آباد؟ لیکن میں ایسے کسی صوبے دار کو نہیں جانتا ..... کیا حلیہ بتایا تم نے نادر؟ ہاں ..... مجھے یاد نہیں پڑتا میں کبھی ایسے شخص سے ملا ہوں ..... بالکل یاد نہیں آتا..... اس نے بتایا نہیں آخر وہ کس مقصد کے لیے مجھ سے ملنا چاہتا ہے' خیر' میں یہاں اس کا انتظار کر لیتا ہوں ..... کل جب وہ آیا تو کیا وقت ہوا تھا! مغرب کے فوراً بعد ..... سات بجے ....." اچھا اچھا ..... چلو ابھی سب بھید کھلا جاتا ہے اسے آنے تو دو..... لیکن میں دیکھتا ہوں کہ سات بجنے والے ہیں اور صوبیدار کا کہیں پتا نہیں"۔

جناب انہوں نے سخت تاکید سے فرمایا تھا کہ وہ کل اسی وقت تشریف لائیں گے انہیں کسی اہم معاملے پر آپ سے بات کرنی ہے' نوجوان مصور نے ادب سے عرض کیا۔ "میرا خیال ہے وہ آیا ہی چاہتے ہوں گے۔"

"ممکن ہے وہ اپنی یا اپنے کسی عزیز کی تصویر بنوانا چاہتے ہوں"۔ تبریزی نے کہا۔ یہی بات ہوگی۔ اس سے زیادہ اہم بات اور مجھ سے وہ کیا کریں گے؟ میں وزیر نہ امیر' نہ بڑا عہدے دار ایک معمولی مصور ہوں....."

نادر زماں نے کمرے کی دونوں کھڑکیاں کھلی چھوڑ دیں تھیں۔ ایک وہ جو گلی میں اور دوسری وہ جو اندرونی صحن کی جانب کھلتی تھی۔ وہ باری باری دونوں کھڑکیوں سے جھانکتا رہا' تاکہ صوبے دار جلال آباد کو آتے ہوئے دیکھے اور فوراً" اپنے استاد کو خبر دے لیکن ہربار اس کی نگاہیں ناکام پلٹ آتیں۔ آخر شہر کے گجر نے شام کے سات بجنے کا اعلان کیا' جونہی گجر کی آواز تھرتھراتی ہوئی فضا میں گم ہوئی۔ نادر زماں نے اپنے اعصاب میں ایک حیران کن تناؤ محسوس کیا۔ دل کی دھڑکن آپ ہی آپ تیز ہونے لگی۔ اپنی یہ کیفیت وہ آقائے تبریزی کی نگاہوں سے بچانے کے لیے گلی کی جانب کھلنے والی کھڑکی کے قریب جا کھڑا ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ جو کوئی بھی حویلی میں داخل ہونا چاہے' خواہ صدر دروازے سے' خواہ دائیں بائیں چھوٹے بغلی دروازوں سے' اسے بہرحال گلی ہی میں سے آنا ہوگا۔ ہر راہ گیر کے قدموں کی چاپ سن کر وہ چونک اٹھتا اور خوب غور سے دیکھتا' لیکن صوبے دار جلال آباد کا کہیں پتا نہ تھا۔

"بھئی وہ شخص ابھی تک نہیں آیا"۔ تبریزی نے بے چینی سے کہا۔ "کیا تم نے نہیں کہ سات بج چکے ہیں"۔ یہ کہہ کر وہ دوبارہ کمرے میں ٹہلنے لگا' پھر اس نے باری باری ان تصویروں پر نظر دوڑائی جو نادر زماں نے تیار کرکے ایک طرف سجادی تھیں۔ جلال آباد کا صوبے دار! خدا جانے کون شخص ہے ....." وہ پھر بولا۔ "حیرت ہے میں خود آج تک جلال آباد نہیں گیا..... اس نے اپنا نام بھی بتایا تھا؟"

"جی نہیں ..... صرف اتنا ہی کہا کہ وہ جلال آباد کے صوبے دار ہیں۔ اس سے پیشتر کہ میں ان سے کچھ دریافت کرنے کی جرأت کرتا' وہ ایک دم تشریف لے گئے' تاہم وہ اپنی چال ڈھال' لباس اور گفتگو سے واقعی معزز باوقار اور اچھی

حیثیت کے نظر آتے تھے۔ ان کی پگڑی میں جو ہیرا لگا تھا' میں نے آج تک اتنا بڑا اور قیمتی ہیرا نہیں دیکھا۔ میرا خیال ہے جناب اس ہیرے ...."

یکایک تصویر خانے کا دروازہ آواز پیدا کیے بغیر کھلا اور جلال آباد کا صوبے دار اندر داخل ہوا۔ اس کا لباس وہی تھا جو اس نے گذشتہ شام پہن رکھا تھا۔ نادر زمان نے اسے گلی میں سے آتے نہ دیکھا تھا' لیکن یہ موقع اس امر پر غور کرنے کا نہ تھا کہ پھر کدھر سے آیا۔ اس نے جلدی سے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"جناب' معزز ملاقاتی تشریف لے آئے ہیں"۔ پھر وہ آنے والے سے مخاطب ہوا۔ "یہ ہیں محترم آقائے تبریزی جن سے ملاقات کے آپ متمنی تھے"۔

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ آقائے تبریزی اپنی جگہ بت بنا کھڑا تھا۔ اس نے مصافحے کے لئے ہاتھ آگے بڑھانے کی جرأت بھی نہ کی۔ صوبے دار نے دہکتی نگاہیں تبریزی کے چہرے پر جما دیں۔ نادر زماں نے دیکھا کہ ان آنکھوں سے چنگاریاں سی پھوٹ رہی تھیں۔ چند لمحے کمرے میں بھیانک خاموشی چھائی رہی۔ ایسی خاموشی جس میں استاد شاگرد' دونوں ایک دوسرے کے دل کی دھڑکن بخوبی سن رہے تھے۔

"آقائے تبریزی' مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنا ہے"۔ نووارد نے بھاری' تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"فرمائیے جنابِ عالی' میں ہمہ تن گوش ہوں' لیکن کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ آپ میرے ساتھ دوسرے کمرے میں تشریف لے چلیں۔ وہاں آپ کے تشریف رکھنے کا شایانِ شان انتظام ہے"۔ آقائے تبریزی نے مرعوب ہوکر بھرائی ہوئی آواز میں درخواست کی۔ صوبیدار نے بے پروائی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"نہیں وہ بات یہیں ہوگی اور بیٹھنے کے لیے میرے پاس وقت نہیں ..... مجھے فوراً" واپس جانا ہے۔ سمجھے؟"

"سمجھ گیا عالی جاہ' حکم فرمائیے ..... میں ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں"۔

تبریزی نے تھر تھر کانپتے ہوئے کہا۔ چند لمحوں کے اندر اندر اس کی حالت میں ایک عظیم تغیر رونما ہوچکا تھا۔ اب وہ صوبے دار کے سامنے ادنیٰ غلام کی طرح دست بستہ کھڑا تھا' حالانکہ آقائے تبریزی وہ شخص تھا جو شہنشاہ کے سوا کسی کے سامنے جھکنا تو جانتا ہی نہ تھا۔ بڑے بڑے آدمیوں کو اپنے دروازے سے یہ کہہ کر لوٹا دیتا کہ ملاقات کی فرصت نہیں۔ یوں بھی اپنے زمانے کا لاثانی مصور تھا اور اسے خوشامد' تملّق اور چاپلوسی سے فطری طور پر نفرت تھی' مگر اب وہی تبریزی ایک معمولی صوبے دار کے سامنے پالتو کتے کی طرح دم ہلا رہا تھا۔ یہ سب باتیں نادر زماں کے ذہن میں ایک دم آئیں اور گزر گئیں۔ خود اس کی باطنی حالت تبریزی سے کم نہ تھی۔ صوبے دار جلال آباد کی شخصیت کا رعب اس پر بھی تو بیٹھ چکا تھا۔

"کیا حضور سے مجھے پہلے بھی ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے؟" تبریزی نے گردن جھکائے ہوئے پوچھا۔

"نہیں ..... یہ پہلا موقع ہے کہ تم ہمیں دیکھ رہے ہو"۔ صوبیدار مسکرایا' مگر اس کی آواز میں ابھی تک ویسا ہی تحکم تھا جیسے وہ مخاطب کو اپنا زر خرید غلام سمجھتا ہو۔ "ہم تمہیں اپنے علاقے میں بھی طلب کر سکتے تھے' لیکن پھر ہم نے یہی مناسب سمجھا کہ خود تمہارے پاس جائیں بات ہی کچھ ایسی ہے تبریزی"۔

"میری بڑی خوش نصیبی ہے عالی جاہ کہ آپ نے غریب خانے پر قدم رنجہ فرمایا۔ بے تکلیف ارشاد فرمایئے' میں کیا خدمت بجالاؤں"۔

صوبے دار نے نادر زماں کی طرف دیکھا جواب حددرجہ خوفزدہ ہو کر اپنے آقا کی پشت پر جا کھڑا ہوا تھا۔ "تبریزی' کیا یہ نوجوان قابلِ اعتماد ہے؟"

"بے شک سرکار' یہ میرا نہایت ہونہار شاگرد نادر زماں ہے اور ہر طرح بھروسے کے قابل ہے۔"

"بہت خوب ....." صوبیدار نے کہا اور اپنے لبادے میں ہاتھ ڈال کر ہاتھی دانت کا بے حد نازک اور بیش قیمت ڈبا برآمد کیا۔ اس میں کچھ جواہر اور زیور

ہیں"۔ اس نے بھاری آواز میں کہا۔ "اس نوجوان کو حکم دو کہ ابھی یہ ڈبا لے کر کسی اچھے جوہری کے پاس جائے اور ان تمام زر و جواہر کی مالیت کا اندازہ کروا کر واپس لائے۔ جتنی قیمت بھی ان کی لگے وہ ایک کاغذ پر لکھی ہونی چاہیئے۔"

یہ کہہ کر اس نے تبریزی کی طرف ڈبا بڑھادیا۔ اس نے بڑے ادب سے دونوں ہاتھوں میں اسے تھام لیا۔ اب وہ صوبے دار جلال آباد سے بے حد مرعوب ہوگیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پورا ڈبا جواہر اور سونے کے زیوروں سے بھرا ہے۔ تبریزی نے ڈبا کھولے بغیر نادر زماں کی طرف بڑھا دیا اور صوبے دار کے الفاظ دہرا دیئے۔ نوجوان نے اپنے چغے کے اندر ڈبا چھپا لیا اور گردن کو خم دے کر دروازے سے باہر نکلا۔ اس کے ہاتھ اور پیر بُری طرح لرز رہے تھے۔ اس کیفیت پر قابو پانے کی ہر کوشش ناکام ہو رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی بدروح اس کے تعاقب میں ہے۔ حویلی سے باہر نکل کر اس کے حواس کچھ قابو میں آئے اور ذہن کام کرنے کے قابل ہوا۔ وہ حیران تھا کہ صوبے دار جلال آباد کیا اسی اہم بات کے لیے تبریزی کے پاس آیا ہے؟ آخر اپنے اس زر وجواہر کی قیمت وہ خود بھی کسی جوہری سے لگوا سکتا تھا۔ پھر اس نے آقائے تبریزی کو اس کام کے لیے کیوں منتخب کیا؟ نادر زماں جتنا اس سوال پر سوچتا' اتنا ہی پریشان ہونے لگتا۔ یہ ایسا معاملہ تھا جو اس کے لئے ناقابلِ فہم ثابت ہو رہا تھا۔

دو تین بازاروں سے نکل کر وہ ایک چھوٹی سی تنگ گلی میں داخل ہوا جہاں فانوسوں اور مشعلوں کی روشنی میں گویا دن نکلا ہوا تھا۔ یہ شہر کا صرافہ بازار تھا اور نامی گرامی جوہریوں کی دکانیں یہیں تھیں۔ ان میں سے کئی جوہری اسے اچھی طرح جانتے پہچانتے تھے' کیونکہ وہ ان کی تصویریں بنا چکا تھا۔ اپنے شناسا ایک جوہری کی دکان پر پہنچ کر اس نے ہاتھی دانت کا ڈبا چغے کے اندر سے نکال کر اس کے سامنے دھردیا۔ جوہری نے اشتیاق بھری نظروں سے اس کا جائزہ لیا اور کہنے لگا۔

"آؤ میاں مصور کیسے آنا ہوا؟ اس ڈبے میں کیا لائے ہو؟"

"مجھے کچھ خبر نہیں اس میں کیا ہے"۔ نوجوان نے پھولا سانس درست کرتے ہوئے کہا۔ "آقائے تبریزی کے پاس ایک معزز مہمان تشریف لائے ہیں۔ یہ ڈبا ان کا ہے اور وہ فرماتے ہیں اس میں جو کچھ ہے اس کی مالیت ایک کاغذ پر لکھوا کر لے آؤ"۔

جوہری نے احتیاط سے ڈبے کا ڈھکنا کھولا اور حیرت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ڈبا اوپر تک لعل و یاقوت' الماس اور سونے کے بھاری زیوروں سے بھرا تھا۔ تیز روشنی ان جواہر پر پڑی تو آنکھیں چندھیانے لگیں۔

"خدا کی پناہ----- اس کی قیمت کا میں کیا اندازہ کروں"۔ جوہری چلّا اٹھا۔ "میرا خیال ہے۔ اعلیٰ حضرت شہنشاہ کے جواہر خانے میں بھی ایسے نادر اور نایاب پتھر نہ ہوں گے بہر حال ان کی قیمت کا سرسری اندازہ کئی لاکھ روپے کے لگ بھگ ہوگا۔ یہ ڈبہ بجائے خود خاصی قیمت کا ہے اور میں دیکھتا ہوں بے حد پرانا بھی' تاہم اسے بڑی حفاظت سے اب تک رکھا گیا ہے"۔

جوہری باری باری ایک ایک ہیرا اٹھاتا اور دیوانہ وار خوشی سے جھومتے ہوئے اس کی تعریف میں قصیدے کہنے لگتا: "غضب ہوگیا...... میاں ایسا نایاب الماس تو دنیا بھر میں کہیں نہ ملے گا....اور یہ زمرد...... اکیلا یہی ایک لاکھ روپے کا ہوگا...... اور یہ جڑاؤ ہار..... خالص سونے کا ہے...... اس میں کھوٹ برائے نام ہے .... کسی ماہر کاری گر کے ہاتھ کا شاہکار ہے ..... ایسے باکمال لوگ اب کہاں؟ بھئی یہ نادر خزانہ ہے ...."

"جناب مجھے واپس بھی جانا ہے"۔ نوجوان نے دبی آواز میں جوہری سے کہا۔ "آپ کی بڑی نوازش ہو اگر ایک کاغذ پر مالیت کے بارے میں کچھ تحریر فرمادیں"۔

"ابھی لو..... ابھی لو....." جوہری نے اپنی تجوری کھول کر خاص کاغذ نکالا اور ذرا سی دیر میں حساب کتاب کرکے نادر زماں کے حوالے کیا۔ نوجوان مصور نے احتیاط سے تمام زرو جواہر دوبارہ ڈبے میں ڈالے' اسے بند کیا، اپنے چغے کے اندر

رکھا اور سلام کرکے رخصت ہونے لگا۔ جوہری نے آہستہ سے کہا۔

"دیکھوں میاں' اگر اس مال کو بیچنے کا ارادہ ہو' تو سیدھے یہیں آنا..... میرا خیال ہے قیمت میں کچھ اور اضافہ بھی ہوسکتا ہے..... میں دوسروں سے کچھ زیادہ ہی دینے کو تیار ہوں....."

"جناب اس بارے میں کوئی فیصلہ آقا نے تبریزی کے مقتدر و معزز ملاقاتی ہی فرما سکتے ہیں جن کی ملکیت یہ جواہر ہیں۔ میں تو صرف قیمت کا اندازہ کروانے حاضر ہوا تھا"۔

جب وہ واپس حویلی میں پہنچا' تو اس نے اپنے کمرے میں آقائے تبریزی اور صوبیدار جلال آباد کو محوِ گفتگو پایا۔ اس نے ڈبا' ادب سے پیش کیا۔ پھر جوہری کی تحریر بھی حوالے کر دی۔ صوبے دار نے بے پروائی سے ڈبا ایک طرف رکھ دیا۔ کاغذ پر نگاہ ڈالی اور اسے تبریزی کی طرف بڑھا دیا۔ تبریزی نے اسے پڑھا۔ اس کے چہرے پر خوف کے پھیلے ہوئے آثار کے ساتھ ساتھ اب حیرت کے آثار بھی شامل ہوگئے۔

نادر زماں نے وہاں سے رخصت ہونے کی اجازت طلب کی مگر تبریزی نے اسے وہیں ٹھہرنے کا حکم دیا۔ ظاہر ہے ایسے قابلِ اعتماد نوجوان سے کوئی بات چھپائی نہ جا سکتی تھی وہ ادب سے ایک جانب کھڑا ہوگیا۔

"جناب والا' آپ نے ابھی تک ارشاد نہیں فرمایا کہ اس خادم کے غریب خانے تک زحمت فرمانے کی اصل وجہ کیا ہے؟" تبریزی نے کہا۔ "ظاہر ہے زر و جواہر کی قیمت کا تخمینہ تو آپ خود بھی کہیں سے لگوا سکتے تھے"۔

"بے شک .... میرے آنے کی ایک خاص وجہ ہے تبریزی۔" صوبیدار نے کہا۔نادر زماں نے دیکھا کہ وہ پلک جھپکائے بغیر تبریزی کو دیکھ رہا ہے اور اس کی نگاہوں میں عجب سحر کی سی تاثیر ہے۔ خود نادر زماں کو اپنی قوتِ ارادی سلب ہوتی محسوس ہوئی۔

"بیان فرمایئے' میں ہمہ تن گوش ہوں"۔

"سنو کوئی چار ماہ پہلے کا ذکر ہے تم ہماری جاگیر جلال آباد کے قریب سے گزرے تھے ..... بلاشبہ تم قصبے کے اندر داخل نہیں ہوئے ورنہ ہمارے آدمی تمہیں فوراً ہم سے ملادیتے ..... ہم نے تمہاری تعریف سنی ہے اور جانتے ہیں کہ تم بہت پائے کے مصور ہو ..... خیر' تمہارا قافلہ قصبے کے باہر ہی رک گیا تھا۔ ایک خاص وجہ کے باعث ہم تم سے ملنے کے لئے نہ آسکتے تھے ..... بہرحال تم مغرب کی نماز پڑھنے اس قدیم مسجد میں گئے تھے جو عرصۂ دراز سے غیر آباد اور ویران پڑی تھی۔ وہیں ہم نے تمہیں دیکھا تمہارے ساتھ ایک خادم تھا اور تمہاری نوجوان بھانجی فیروزہ بھی ..... ہم نے فیروزہ کو دیکھا اور پسند کیا..... وہ حسن و جمال میں یکتا ہے اور اس قابل ہے کہ کسی بڑے گھر میں بیاہی جائے' اگرچہ ہم بڑے جاگیردار نہیں' لیکن تم دیکھتے ہو کہ ہمارے پاس بادشاہوں سے کہیں زیادہ مال و دولت ہے' اگر تم فیروزہ کو ہمارے نکاح میں دے دو' تو وہ ہر طرح خوش رہے گی۔ فیروزہ کا نکاح تم کب تک میرے ساتھ کر سکو گے ..... میں پختہ وعدہ چاہتا ہوں اور اس سلسلے میں کسی تاخیر یا ٹال مٹول کو پسند نہ کروں گا۔"

آقائے تبریزی پر اس تحکمانہ تقریر اور بے جا مطالبے پر جو گزری' سوگزری' نوجوان مصور نادر زماں کا مارے طیش کے برا حال ہوگیا۔ اس کا بس چلتا تو وہ خبیث صورت جاگیر دار بڈھے کا سرپاش پاش کر دیتا۔ کیا وہ پتھر کے چند چمک دار ٹکڑوں کے عوض فیروزہ کو خریدنے آیا ہے ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ ہرگز نہیں ہوسکتا..... اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو گیا جیسے بدن کا سارا خون کھنچ کر چہرے اور آنکھوں میں سمٹ آیا ہو۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اب آقائے تبریزی کے صبر کی انتہا ہوچکی ہوگی۔ جلال آباد کے اس احمق صوبے دار کو اس کی موت ہی یہاں لے آئی ہے۔ کس گستاخی اور بے باکی سے وہ فیروزہ کا سودا کرنے آیا ہے۔ کوئی بھی غیرت مند آدمی اسے برداشت نہیں کر سکتا ---- لیکن --- اس نے دیکھا کہ آقائے تبریزی اسی طرح بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ اس کے منہ سے مخالفت یا انکار میں ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ البتہ اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی حیرت کے

آثار اب اور بھی گہرے ہوگئے تھے۔ خود اسے بھی صوبے دار جلال آباد سے اس قسم کے مطالبے کی توقع نہ تھی۔ آخر اس نے حد درجہ ندامت اور انکسار آمیز لہجے میں کہنا شروع کیا۔

"عالی جاہ میں نے آپ کا ارشاد سماعت کیا۔ میری عین خوش قسمتی ہے کہ آپ کی نگہِ انتخاب میری بھانجی فیروزہ پر پڑی ہے ..... یقیناً" اسے آپ سے بہتر شوہر نہیں مل سکتا اگر میرے اختیار میں ہو تو میں ابھی اسی وقت ہاں کر دیتا' لیکن آپ جانتے ہیں کہ میں نے آج تک فیروزہ پر اپنی رائے یا مرضی مسلّط نہیں کی ہمیشہ اسے اپنے معاملات میں آزادی سے سوچنے اور عمل کرنے کی اجازت دی ہے اور یہ تو اس کی زندگی کا سب سے اہم معاملہ ہے اس سے مشورہ کیے بغیر میں کیونکر وعدہ کر سکتا ہوں؟"

"بہانے بنانے کی کوشش مت کرو تبریزی"۔ صوبے دار غرایا اور اس کے نتھنے طیش کے باعث پھڑکنے لگے ۔ آنکھیں جو پہلے ہی سرخ تھیں' لال انگارہ ہوگئیں۔ اس کی خوفناک آواز حویلی کے درودیوار سے ٹکرا ٹکرا کر گونجنے لگی جیسے سینکڑوں بد روحیں چلّا رہی ہوں۔ "میں سب سمجھتا ہوں تمہاری ان چال بازیوں کو۔ تم اس کے ہر طرح سرپرست اور ولی ہو..... بولو کیا میں غلط کہتا ہوں؟ اگر تم چاہو' تو سب کچھ ممکن ہے۔ فیروزہ کو تمہارے حکم سے سرتابی کی مجال ہی نہیں ہوسکتی .....اور مجھے فیروزہ پسند آگئی ہے اور میں اسے حاصل کرکے رہوں گا۔"

"مجھے اس رشتے سے کوئی انکار نہیں ہے"۔ تبریزی نے کہا۔ "میں تو اس معاملے میں صرف فیروزہ کی رضا مندی حاصل کرنے کی بات کر رہا تھا ..... آپ دولت کے ذریعے فیروزہ کو تمام خوشیاں تو دے سکیں گے ..... لیکن رشتے ناطے کرنے میں صرف دولت ہی کو تو نہیں دیکھا جاتا' حسب نسب بھی کوئی چیز ہے اور ہم لوگ اس معاملے میں خاصے سخت ہیں۔ مجھے ابھی تک آپ کے حسب نسب کے بارے میں کچھ بھی جاننے کا موقع نہیں ملا"۔

صوبے دار مسکرایا اور اپنے سیاہ لبادے کے اندر ہاتھ ڈال کر پرانے کاغذوں کا ایک چھوٹا سا پلندہ بر آمد کیا۔

"میں جانتا تھا تم یہ سوال ضرور کرو گے' اس لیے اپنے شجرے کے کاغذات ساتھ ہی لے آیا"۔ یہ کہہ کر اس نے وہ پلندہ تبریزی کی طرف پھینک دیا۔ تبریزی نے جھک کر فرش سے کاغذ اٹھائے' انہیں ایک نظر دیکھا' اثبات میں کئی بار گردن ہلائی' جیسے مطمئن ہوگیا ہو۔ پھر یہ کاغذ اسے واپس کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے اطمینان ہوگیا ہے عالی جاہ کہ آپ بہت اعلیٰ حسب نسب کے مالک ہیں....."

"بس' تو پھر تاخیر نہ کرو"۔ بڈھے نے ایک اور کاغذ برآمد کرتے ہوئے کہا۔ یہ ہمارے اور تمہارے درمیان ایک معاہدہ ہے جس کے تحت میں اپنا زر و جواہر سے بھرا ہوا یہ ڈبا تمہارے پاس چھوڑے جا رہا ہوں۔ اس کی وصولیابی کی رسید مجھے دو اور کاغذ پر لکھ دو کہ فیروزہ کی شادی مجھ سے کر دو گے۔ میں زیادہ دھوم دھڑکا پسند نہیں کرتا..... یہ کام بالکل خاموشی سے ہونا چاہیے .....اب فوراً" اس پر دستخط کر کے میرے حوالے کردو"۔

"مگر.... حضور.....اتنی جلدی ..... مجھے کچھ غور کرنے کا موقع تو دیجئے"۔ تبریزی گڑگڑایا۔

"موقع! صوبے دار نے قہقہ لگایا ۔"میں نے ہر طرح تمہاری تسلی کردی ہے اور تم ہو کہ برابر بہانے بنا رہے ہو..... جلد دستخط کر دو۔ میرا خیال ہے ایک دن کی مہلت مناسب رہے گی"۔

اس نے ایک بار پھر اپنے سیاہ لبادے میں ہاتھ ڈالا اور ایک عمدہ قلمدان نکال کر سامنے رکھ دیا ۔

"اگر تمہارے پاس قلمدان نہیں' تو یہ موجود ہے' میں احتیاطاً" ساتھ لیتا آیا تھا۔"

تبریزی نے قلم روشنائی میں ڈبویا اور کپکپاتے ہاتھ سے دستخط کر دیئے۔

"ادھر آؤ نوجوان"۔ صوبے دار نے نادر زماں سے کہا ۔"تم اس کاغذ پر بطور گواہ دستخط کرو"۔

ایک سحر زدہ غلام کی مانند نادر زماں نے بھی اس پروانے پر دستخط ثبت کر دیئے جس کے تحت صرف ایک دن بعد جلال آباد کا صوبے دار ہمیشہ کے لیے فیروزہ کا مالک بن جانے کا حق رکھتا تھا۔ دستخط ہوتے ہی اس نے معاہدے کا کاغذ لپیٹ کر اپنے لبادے کی خفیہ اندونی جیب میں رکھ لیا اور دروازے کے قریب جاتے ہوئے بولا۔

"تبریزی میں کل رات ٹھیک نو بجے تمہارے مکان پر پہنچ جاؤں گا اور غالباً" یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہمارے مابین جو تحریری معاہدہ ہوا ہے' تم ہر طرح اس کی پابندی کرو گے ۔"

یہ کہتے ہی رخصتی سلام اور مصافحہ کیے بغیر وہ دروازے سے باہر نکل گیا۔ نادر زماں لپک کر گلی کی جانب کھلنے والی کھڑکی میں جاکھڑا ہوا۔ گلی سنسان پڑی تھی اور اسے پورا یقین تھا کہ اب وہ صوبے دار کو اس راستے سے جاتے ہوئے ضرور دیکھ سکے گا' لیکن وقت گزرنے لگا.... صوبیدار گلی میں نمودار نہ ہُوا..... اور نہ وہ صدر دروازے سے باہر گیا.... بلکہ وہ تو حویلی کے کسی بھی دروازے سے باہر نہ آیا..... سبھی دروازے بعد ازاں اندر سے مقفل پائے گئے۔ یہ ایک ایسی دہشت انگیز دریافت تھی' جس نے نوجوان مصور کو ہلا کر رکھ دیا۔ وہ سوچنے لگا یہ صوبے دار کون ہے؟ کہیں انسانی قالب میں کوئی بھوت پریت' شیطان یا جن تو نہیں؟ پھر اس نے اپنے آقا کو دیکھا جو گم صم اپنی جگہ کھڑا تھا۔ نادر زماں کو واپس آتے دیکھ کر وہ چونکا اور سرد آہ بھر کر بولا:

"میرا خیال ہے یہ شخص کچھ سنکی ہے ..... یہی جلال آباد کا صوبے دار..... لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ آدمی دولت مند اور خاندانی ہے .....میں حیران ہوں اس نے فیروزہ کو کیسے دیکھا؟ واقعی چار ماہ قبل میں حضرت خواجہ معین الدین اجمیری رحمتہ اللہ علیہ کے روضے کی زیارت کے لیے گیا تھا اور فیروزہ میرے

ساتھ تھی۔ مجھے یاد نہیں پڑتا راہ میں جلال آباد نام کی کوئی جاگیر بھی آئی تھی' لیکن وہ تو یہاں سے خاصی دور ہے ..... کیا خیال ہے تمہارا نادر..... فیروزہ کی شادی ایسے آدمی سے ٹھیک رہے گی نا؟"

کاش! آقائے تبریزی کو ان دونوں کی محبت کا حال معلوم ہوتا' تب وہ یہ سوال نادر زماں سے نہ کرتا۔ نوجوان نے بڑی مشکل سے اپنے آنسو ضبط کیے' لیکن اس ضبط کے باوجود اس کی اتھاہ گہرائیوں سے سرد آہ نکل ہی گئی۔ وہ لڑکھڑایا

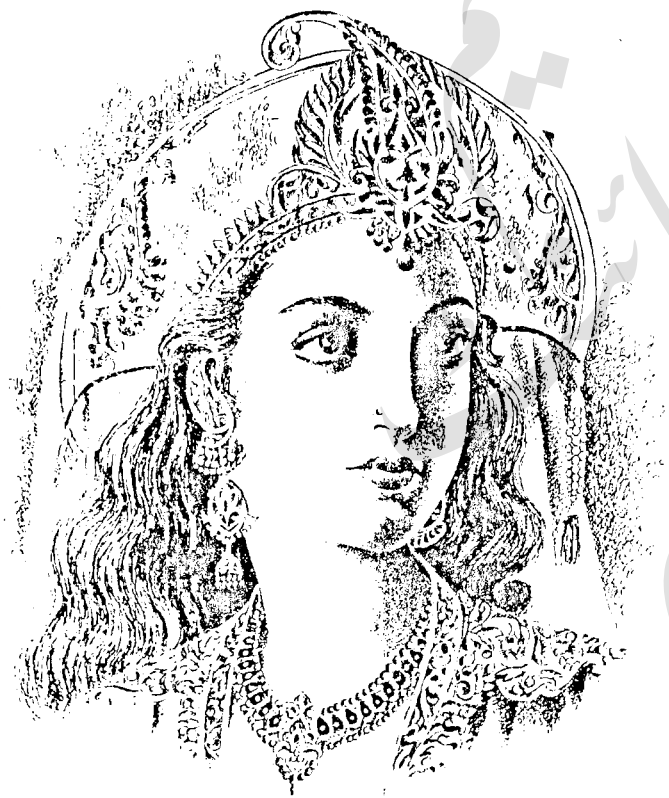

اور اگر تبریزی بڑھ کر اسے سنبھالا نہ دیتا' تو شاید وہ پختہ سنگین فرش پر اوندھے منہ جا گرتا۔

"تمہاری طبعیت تو ٹھیک ہے؟" تبریزی نے پوچھا۔ "تم نے آج کھانا بھی نہیں کھایا۔"

"مجھے آج بھوک لگی ہی نہیں جناب۔ بس ویسے ہی ایک چکر سا آ گیا تھا۔ اب آپ اپنے محل میں تشریف لے جائیں اور مجھے اجازت دیں۔ ایک ضروری کام سے مجھے باہر جانا ہے میں رات کو واپس نہ آسکوں گا۔ بابا افضل بیگ سے کہہ دیجئے گا وہ میرا انتظار نہ کرے"۔

وہ ڈرتا تھا کہیں اس کی اور فیروزہ کی محبت کا راز فاش ہی نہ ہو جائے۔ یقیناً" جذبات سے مجبور ہو کر وہ کوئی نہ کوئی ایسی حرکت کر بیٹھے گا جس سے یہ سربستہ راز کھل سکتا تھا۔ لہٰذا حویلی سے چلے جانا ہی مناسب تھا۔

تبریزی نے زر و جواہر سے بھرا ہوا وہ ڈبا ساتھ لیا اور سیدھا فیروزہ کی خواب گاہ میں پہنچا۔ اسے پورا بھروسا تھا کہ وہ اس کی بات نہ ٹالے گی۔

"فیروزہ بیٹی کیا حال ہے؟ نصیب دشمناں طبعیت تو خراب نہیں تمہاری....."

"اب تو میں ٹھیک ہوں ماموں جان۔ آپ کل اپنے اس طبیب دوست کو ضرور بلوالیجئے گا جنہوں نے پہلے بھی میرا علاج کیا تھا۔ کل سے آپ ہی آپ میرا جی گھبرا رہا ہے ..... کلیجا جیسے بیٹھا جاتا ہے ..... سر میں چکر آتے ہیں اور عجیب طرح کے ڈراؤنے خواب نظر آنے لگے ہیں ....."

"اچھا! کسی نے مجھ سے ذکر نہ ہی کیا"۔ تبریزی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "خیر' طبیب بھی کل آ جائے گا۔ اب تم ایک خوشخبری سنو۔ بیٹی تم جانتی ہو' مجھے تم دنیا کی ہر شے سے زیادہ عزیز اور پیاری ہو..... میں نے تمہارے لیے ایک ایسا آدمی چنا ہے جو تمہیں پسند کرتا ہے اور مجھے یقین ہے وہ ہمیشہ تمہیں خوش رکھنے کی کوشش کرے گا۔ اس کے پاس مال و دولت کی کمی نہیں ..... آج وہ میرے پاس آیا تھا..... یہ دیکھو..... تمہارے لیے وہ کتنے نادر

ہیرے اور کیسے عمدہ زیور لایا ہے ..... وہ جلال آباد کا صوبیدار ہے بیٹی..... بڑا وجیہہ..... میں اس کی شخصیت سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے وہ ڈبا کھول کر ہیرے دکھانے شروع کیے' مگر فیروزہ نے نظر اٹھا کر ایک مرتبہ بھی اس ڈبے کی طرف نہ دیکھا' بلکہ ایک دم اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور بری طرح رونے لگی۔ یہ تو اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اس طرح اس کے جذبات کچل دیئے جائیں گے اور یوں دولت کے عوض اس کے جسم و جاں کا سودا ہو گا۔

"میں نے یہ سب کچھ تمہارے شاندار مستقبل کے لیے کیا ہے بیٹی"۔ اس نے پھر کہا۔ "کہیں نہ کہیں آخر تمہاری شادی تو کرنی ہی تھی اور میں سمجھتا ہوں ایسا شوہر تمہیں نہ ملتا۔ وہ تمہیں بہت پسند کرتا ہے اور میں نے اس بھروسے پر کہ تم اپنے ماموں تبریزی کو ذلیل ہوتے دیکھنا نہ چاہو گی' ہاں کر دی ہے۔ اب وہ کل شب نو بجے آئے گا' اسی وقت تمہارا نکاح ہو گا اور پھر تم رخصت ہو جاؤ گی"۔

فیروزہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ جواب دینے کا موقع تھا بھی کہاں۔ اس کے حسین خواب چکنا چور ہو چکے تھے..... گویا نادر زماں سے اس کی شادی نہیں ہو سکتی تھی..... وہ مفلس اور قلاش تھا جو شاید فیروزہ کو ایک نیا جوڑا بھی سلوا کر دینے کے قابل نہ تھا..... مگر فیروزہ کو تو کچھ نہیں چاہیئے ..... زیور..... ہیرے ..... جواہر..... بیش قیمت کپڑے ..... اور کسی علاقے کا جاگیردار یا نواب ..... اسے ان میں سے کسی سے ذرّہ برابر دل چسپی نہ تھی۔ تبریزی نے اس کی آرزوؤں' امیدوں اور خواہشوں کا غلط اندازہ کیا تھا۔

اگلے روز بھی تبریزی نے وقت کا بڑا حصہ فیروزہ کو سمجھانے بجھانے اور مستقبل کی روشن تصویر دکھانے میں گزارا۔ لڑکی برابر گہرہائے اشک برسا رہی تھی۔ اس دوران اس نے ایک لفظ بھی منہ سے نہ کہا' نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ ایک دن میں اس کے چہرے کا رنگ روپ اور آب و تاب سب غائب ہو گئی اور وہ

برسوں کی بیمار دکھائی دے رہی تھی۔

دوپہر کو نادر زماں حویلی میں آیا۔ وہ اتنا مضمحل' اتنا نحیف' نظر آتا تھا کہ تبریزی اس کی حالت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ آنکھیں سوجی ہوئیں' بال بکھرے اور الجھے ہوئے اور لباس ازحد کثیف۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں۔ تبریزی نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑلیا اس کا سارا بدن بری طرح پھنک رہا تھا۔

"تمہیں تو خاصا تیز بخار ہے نادر"۔ تبریزی چلایا۔ "میں ابھی طبیب کو بلواتا ہوں۔ گذشتہ دوروز سے فیروزہ کی طبعیت بھی ٹھیک نہیں۔ کہتی ہے سر چکراتا ہے"۔

"آپ براہِ کرم' میرے لیے طبیب کو بلوانے کی زحمت نہ فرمایئے"۔ نوجوان نے رک رک کر نہایت ادب سے التجا کی۔ "میں اس قسم کی بیماریوں کا عادی ہوں' البتہ یہ درخواست ضرور کروں گا کہ فی الحال فیروزہ کے لیے بھی طبیب کو طلب نہ کیجئے۔ آپ صوبے دار جلال آباد سے جو وعدہ فرماچکے ہیں' اسے پورا کرنے کے انتظامات فرمایئے ... ممکن ہے طبیب اس میں مخل ہو اور اس طرح صوبے دار ناراض ہو جائے"۔

"سچ کہتے ہو..... سچ کہتے ہو"۔ تبریزی نے خوش ہوکر کہا۔ "ابھی تم اپنی نگرانی میں حویلی کی صفائی وغیرہ کروادو' نوکر وغیرہ آنے والے ہیں۔ اس کے بعد بڑے کمرے میں معزز مہمان کی نشست کا انتظام کرنا ہوگا۔ رات کے کھانے پر تم بھی ہمارے ساتھ شرکت کروگے ۔ باہر سے میرا ارادہ کسی کو مدعو کرنے کا نہیں"۔

نوجوان نے اپنے استاد کے تمام احکام کی تعمیل جان توڑ کر کی اور پوری حویلی کو آئینے کی مانند چمکا دیا۔ نشست کے کمرے میں نئے قالین بچھائے گئے اور ایک جانب شاندار مسند دولہا کے لیے تیار ہوئی۔ شاہی رکاب داروں سے جلدی جلدی کئی کھانے پکوائے اور انہیں معزز مہمان کے آنے سے پیشتر ہی رخصت کر دیا گیا۔ نو بجنے میں ابھی چند منٹ باقی تھے۔ حویلی میں اس وقت نکاح خواں قاضی' اس کے دو شاگردوں' تبریزی' بابا افضل بیگ اور نادر زماں کے سوا کوئی نہ تھا۔

قاضی سے طے پا چکا تھا کہ نکاح کی رسم ادا ہوتے ہی وہ تشریف لے جاسکیں گے۔

جونہی شب کے نَو کا گجر بجا' حویلی پر ایک ہیبت ناک سکوت طاری ہوگیا۔ شعلوں اور فانوسوں کی تیز روشنی کے باوجود ہر فرد ڈرا ڈرا سہما سہما نظر آرہا تھا۔ یکایک بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز آئی' دونوں بھاری دروازے گڑگڑاہٹ کے ساتھ الگ الگ ہوئے' پھر صحن میں قدموں کی آہٹ بلند ہوئی اور اگلے ہی لمحے نشست گاہ میں جلال آباد کا صوبیدار اپنی ساری آن بان لیے موجود تھا۔ حسبِ معمول اس کا لباس سر سے پیر تک سیاہ' ہاتھوں پر چڑھے ہوئے دستانے' جوتے اور جرابیں تک سیاہ۔ جو چھڑی اس کے دائیں ہاتھ میں تھی ، اس کا رنگ بھی سیاہ تھا۔

تبریزی لپک کر اس کے استقبال کو آگے بڑھا اور شاہانہ مسند پر لے جا کر بٹھا دیا۔ صوبے دار نے جوتے اتارنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی۔ حقارت کی نظر سے دائیں بائیں دیکھتا ہوا مسند پر جا بیٹھا اور کرخت آواز میں بولا۔

"تبریزی' میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ فوراً نکاح کی رسم ادا ہونی چاہیئے"۔

"بہت بہتر جناب۔ سب لوگ حاضر ہیں"۔ اس نے نادر زماں کو اشارہ کیا۔ وہ دوسرے کمرے سے نکاح خواں اور اس کے دو شاگردوں کو بلالایا۔ انہوں نے آتے ہی معزز مہمان کو فرشی سلام کیا۔ قاضی صاحب نے نکاح کا خطبہ پڑھا اور ایک لاکھ اشرفی مہر کے عوض فیروزہ کا نکاح صوبے دار جلال آباد سے ہوگیا۔ اس تمام عرصے میں صوبے دار نے ایک مرتبہ بھی پلک نہیں جھپکائی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کی پلکیں مصنوعی ہیں اور ان میں جھپکنے کی رس ہی نہیں۔ ایک پُراسرار سی ہیبت تمام حاضرینِ محفل پر چھائی رہی۔ نکاح کی رسم ادا ہوتے ہی اس نے لبادے میں ہاتھ ڈال کر چند اشرفیاں نکالیں اور نکاح خوان کی طرف پھینک دیں۔ ایک بار پھر تسلیمات اور آداب کے مرحلے طے ہوئے اور قاضی صاحب اپنے شاگردوں کو لے کر رخصت ہوگئے۔

"تبریزی' دلہن رخصتی کے لیے تیار ہے؟" صوبیدار نے پوچھا۔

"جی عالی جاہ--- لیکن آپ کھانا تو تناول فرمالیجیے"۔

"نہیں ..... ہمیں بہت جلدی ہے ..... تم جانتے ہو جلال آباد یہاں سے خاصی دور ہے اور راستے میں ڈاکوؤں' لٹیروں کا خطرہ بھی ہے' اس لیے ہم زیادہ تاخیر پسند نہیں کریں گے۔ حویلی سے باہر ہماری گھوڑا گاڑی ہے۔ فوراً" دلہن کو ہمارے ساتھ کردو"۔

(۳)

اب یہاں سے اس داستان کا وہ ہوشربا آغاز ہوتا ہے جس کا علم میرے جد امجد ترکتاز خان کو خود نادر زماں کی زبانی ہوا۔ فیروزہ اور صوبے دار کی شادی سے نوجوان مصور کی دنیا ویران ہوگئی' لیکن آفرین ہے اس کے صبرو استقلال پر کہ اس نے ایک لفظ بھی منہ سے شکایت کا نہ نکالا۔ تبریزی خاں پھر اپنی روز مرّہ کی مصروفیات میں گم ہوگیا۔ اسے مطلق احساس نہ تھا کہ نادر زماں کے دل ودماغ پر کیا بیت رہی ہے۔ اور وہ ایک ایسی آگ میں جل رہا ہے جو اس کی موت کے ساتھ ہی ٹھنڈی ہوسکے گی۔

نادر زماں نے اپنے آپ کو مصوری کے فن میں ڈبو دینے کی کوشش کی۔ وہ سولہ سولہ اور بیس بیس گھنٹے مسلسل اپنے تصویر خانے میں مصروف رہنے لگا۔ اس کی صحت روز بروز بگڑتی جارہی تھی' مگر اسے کوئی ہوش نہ تھا۔ حویلی کا بوڑھا چوکیدار افضل بیگ اسے کبھی کبھار سمجھاتا بجھاتا' لیکن بے سود۔ نادر زماں پند ونصیحت کا اب کوئی اثر قبول کرنے سے قاصر تھا۔ اس کی جان شمع کی مانند آہستہ آہستہ گھلتی جارہی تھی۔

وقت اپنی رفتار سے گزرنے لگا..... ایک مہینہ..... دو مہینے ..... تین مہینے .... اس تمام عرصے میں ایک بار بھی فیروزہ کی خیر خبر سننے میں نہ آئی اور نہ جلال آباد سے اس کے شوہر نے کوئی خط تبریزی کے نام ارسال کیا۔ کئی مرتبہ تبریزی نے رہی ہے۔ قریب ہی دو سیاہ رنگ کے شاندار گھوڑے بندھے چارہ کھا رہے ہیں۔

کچھ فاصلے پر بہت نفیس ایک بگھی کھڑی ہے۔ تبریزی نے فوراً" پہچان لیا کہ یہ وہی گھوڑے اور وہی گاڑی ہے جو جلال آباد کا پُراسرار صوبیدار شب کے نوبجے اپنے ساتھ لایا تھا اور اسی میں وہ فیروزہ کو سوار کر کے لے گیا تھا۔ دونوں نے اپنی اپنی تلواریں نیام سے کھینچ لیں۔ ان کا خیال تھا شاید یہاں صوبے دار کے آدمی ہوں اور کوئی فتنہ فساد برپا کریں' مگر چند لمحوں بعد ستر اسی برس کا ایک بوڑھا' مکان کے اندرونی کھنڈر سے باہر آیا اور انہیں دیکھ کر کہنے لگا۔

"آپ لوگ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟"

"مجھے صوبیدار جلال آباد سے ملنا ہے..... بڑے میاں کیا آپ ان کا پتا بتا سکتے ہیں؟"

"صوبے دار جلال آباد....." بوڑھے نے حیرت سے کہا۔"میں نہیں جانتا وہ کون ہے اور کہاں رہتا ہے"۔

"تم جھوٹ بول رہے ہو...." تبریزی چلّایا۔"یہ گھوڑے اور گاڑی کیا اسی کی نہیں؟"

"جناب' آپ اطمینان سے میری بات سنیں' تو عرض کروں"۔ بوڑھے نے کہا۔ "براہِ کرم یہ تلواریں نیام میں رکھ لیجیے۔ میرا کوئی ارادہ آپ سے جنگ وجدل کا نہیں۔ آیئے کمرے میں تشریف رکھیے"۔

وہ انہیں ایک صاف ستھرے کمرے میں لے گیا جہاں چند مونڈھے پڑے تھے اور ایک جانب بستر لگا تھا۔ " ان گھوڑوں اور بگھی کی داستان بھی عجیب ہے جناب۔" بوڑھے نے بستر پر بیٹھے ہوئے کہا۔ تبریزی اور نادر زماں اس کے قریب ہی مونڈھوں پر بیٹھ گئے ۔ میرا نام ضیغم ہے اور میں اس علاقے میں گذشتہ پچاس برس سے آباد ہوں۔ ایسا عجیب و غریب واقعہ مجھے کبھی پیش نہیں آیا۔ یہ کوئی ایک سال پہلے کی بات ہے۔ سورج غروب ہونے ہی والا تھا۔ میرے بیٹے اور پوتے اس روز کسی تقریب کے سلسلے میں جلال آباد گئے ہوئے تھے اور میں یہاں تنہا تھا اس علاقے میں سورج غروب ہونے کا منظر بہت حسین ہوتا ہے اور میں

اسے بڑے شوق سے دیکھنے کا عادی رہا ہوں' چنانچہ ٹہلتا ٹہلتا اپنے مکان سے ذرا دُور اس سڑک پر نکل آیا جو سیدھی جلال آباد کو جاتی ہے.....

"ابھی میں شفق کے سنہری' نارنجی اور سرخ رنگوں میں گم تھا کہ میں نے کچھ فاصلے پر گھوڑوں کے دوڑانے کی آوازسنی۔ ہر آن بڑھتے ہوئے اندھیرے میں مجھے ایک شاندار گھوڑا گاڑی دکھائی دی جو اسی سڑک پر آرہی تھی۔ اس میں سیاہ رنگ کے دوقد آور اور بیحد قیمتی گھوڑے جتے ہوئے تھے۔ گاڑی کا رنگ بھی سیاہ تھا۔ دیکھتے دیکھتے گاڑی میرے قریب آکر رک گئی۔ گھوڑے پسینے میں نہا رہے تھے اور پتا چلتا تھا کہ بہت دور سے آرہے ہیں۔ کوچبان کی نشست پر سیاہ لبادہ پہنے' ہاتھوں میں لمبا سا چابک تھامے ایک ادھیڑ اور بھاری مضبوط جسم کا آدمی تھا۔ وہ چھلانگ لگا کر نیچے اترا۔ پہلے اس نے دونوں گھوڑوں کی پشت اور گردن پر باری باری ہاتھ پھیرا۔ میں نے دیکھا۔ گھوڑے نامعلوم دہشت سے کانپ رہے تھے۔ پھر اس کوچبان نے گاڑی کا دروازہ کھول کر ہاتھ اندر بڑھایا اور چند لمحے بعد ایک حسین و جمیل نازنین کو سہارا دے کر باہر نکالا۔ میں نے ایسی خوبصورت عورت زندگی میں کبھی نہیں دیکھی۔ وہ عروسی جوڑا پہنے ہوئے تھی' لیکن یہ دیکھ کر مجھے ازحد تعجب ہوا کہ وہ زارو قطار رو رہی ہے"۔

"فیروزہ..... میری فیروزہ....." تبریزی نے کہا اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ "مجھے معاف کر دینا فیروزہ' میں نے تم پر بڑا ظلم کیا"۔

"کیا وہ لڑکی آپ کی کوئی عزیزہ یا بیٹی تھی؟" بوڑھے ضیغم نے پوچھا۔

"ہاں' وہ میری حقیقی بھانجی تھی۔ میں اسی کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں"۔ تبریزی نے فرطِ غم سے نڈھال ہوتے ہوئے جواب دیا۔ "جس شخص کو تم نے دیکھا' وہی اپنے آپ کو جلال آباد کا صوبے دار کہتا تھا اور میں نے اپنی بھانجی کی شادی اس سے کردی تھی۔ خیر' تم آگے سناؤ' پھر کیا ہوا؟"

"لڑکی اس کے پنجے سے آزاد ہونے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگی اور اس کے رونے کی آواز مزید بلند ہوگئی۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے آواز دے کر کہا۔

"کون ہو تم اور اس بیچاری سے ایسا سلوک کیوں کر رہے ہو؟" جواب میں اس شخص نے اس زور سے طمانچہ میرے منہ پر مارا کہ میں الٹ کر زمین پر گرا اور پھر مجھے تن بدن کا کچھ ہوش نہ رہا۔ آنکھیں کھلیں' تو میں ابھی تک اسی جگہ پڑا تھا۔ آسمان پر تارے جھلملا رہے تھے اور تھوڑی دیر بعد پچھلے پہر کا چاند بھی نکل آیا۔ میں نے گردن گھما کر دائیں بائیں دیکھا۔ آپ لوگ میری حیرت کا اندازہ نہیں کر سکتے جب میں نے سیاہ گاڑی اور دونوں گھوڑوں کو اسی مقام پر کھڑے پایا۔ خدا جانے وہ پُراسرار کوچبان اس معصوم صفت لڑکی کو لے کر کہاں غائب ہوگیا تھا۔ اس کے طمانچے کی ضرب سے میری گردن اور جبڑا بری طرح دکھ رہا تھا۔ قصہ مختصر میں اٹھ کر گاڑی کے قریب گیا اور کھلے دروازے سے اندر جھانکا، اس میں کوئی نہ تھا۔ پھر میں نے گھوڑوں کی باگ پکڑی۔ اور انہیں گاڑی سمیت اپنے مکان پر لے آیا--- یہ ہے وہ داستان۔ آپ نے گھوڑے صحن میں بندھے دیکھے ہوں گے۔ گاڑی بھی وہیں موجود ہے۔ وہ دن اور آج کا دن میں اس شخص کا منتظر ہوں جو اپنی گاڑی اور گھوڑے چھوڑ کر نہ جانے کہاں چلا گیا۔ میرے بیٹے اور پوتے واپس آئے' تو میں نے انہیں سارا قصہ سنایا۔ انہوں نے میلوں تک ایک ایک کھنڈر اور ایک ایک کونا کھدرا دیکھ ڈالا' نہ اس لڑکی کا کہیں پتا چلا نہ اسے گھسیٹ کر لے جانے والے کا۔"

اس داستان نے تبریزی اور نادر زماں دونوں پر عجیب اثر کیا۔ ایک کی آنکھیں تر تھیں' دوسرے کی خشک۔ ایک فیروزہ کا سب کچھ تھا اور دوسرا کچھ بھی نہیں۔ ایک کا غم ظاہری تھا دوسرے کا باطنی۔ جب وہ واپس عالی شان حویلی میں پہنچے' تو اندوہ والم سے ان کی حالت مُردوں سے بھی بدتر تھی۔ اس سفر میں تبریزی پر یہ حقیقت بھی منکشف ہوئی تھی کہ نادر زماں کے تصورات اور خیالات پر کس کی حکمرانی ہے۔

(۴)

کئی مہینے مزید بیت گئے۔ تبریزی اپنی بھانجی اور اس کے پُراسرار شوہر کی تلاش

میں آئے دن مارا مارا پھرتا' لیکن کہیں سے سراغ نہ ملتا۔ تلاش کی ہر ایسی مہم میں نادر زماں اس کا رفیق ہوتا۔ سردیوں کے دن تھے' استاد اور شاگرد دونوں رات کے کھانے سے فارغ ہوکر آتش دان کے قریب گردنیں جھکائے بیٹھے تھے۔ یکایک صدر دروازے کی جانب سے مسلسل دستکوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہ دونوں چونک کر ایک دوسرے کی طرف تکنے لگے۔ بوڑھا چوکیدار جلدی سے دروازے کی طرف دوڑا۔ یہ دونوں بھی کمرے سے نکل کر حویلی کے صحن میں آ گئے۔

دستکیں برابر دی جارہی تھیں۔ جونہی چھوٹا دروازہ کھلا' کوئی اندر آیا..... تبریزی اور نادر زماں دونوں کی نگاہیں بیک وقت آنے والے پر پڑیں ..... اور ان کے بدن میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔ یہ فیروزہ تھی..... اس کا لباس پھٹا ہوا اور جابجا چیتھڑے سے لٹک رہے تھے..... پھول سا چہرہ کملا گیا تھا' آنکھیں زرد اور اندر دھنسی ہوئیں ..... وہ دھڑام سے فرش پر گری اور بے ہوش ہوگئی۔

تبریزی اور نادر زماں دونوں بے اختیار اسے اٹھانے کے لیے لپکے۔ انہوں نے اسے کمرے میں لاکر آتش دان کے پاس لٹادیا۔ فیروزہ کا جسم یخ ہورہا تھا اور ہونٹ نیلے پڑ چکے تھے۔ چند لمحوں بعد اس نے ہوش میں آکر آنکھیں کھول دیں اور خوف سے کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

"پانی ...پانی ...خدا کے لیے مجھے پانی پلاؤ... پیاس سے جان نکلی جاتی ہے ..."

انہوں نے جلدی سے اسے پانی پلایا۔ سانس لیے بغیر وہ سارا پیالہ پی گئی۔ نہ معلوم کب کی پیاس تھی۔

"اب مجھے کچھ کھانے کو دو..... فوراً..... ورنہ میں مرجاؤں گی ۔"

نعمت خانے سے اسی وقت بھنے ہوئے گوشت کا ایک بڑا سا ٹکڑا لایا گیا۔ نادر زماں نے اسے چھری سے کاٹ کر فیروزہ کو کھلانا چاہا' لیکن اس میں صبر کی اتنی بھی تاب نہ تھی اس نے نوجوان کے ہاتھ سے جھپٹ کر گوشت کا ٹکڑا چھین لیا اور دانتوں سے کاٹ کاٹ کر چبائے بغیر نگلنے لگی' پھر وہ اپنے حواس میں آئی اور اس

نے پہلی بار اپنے ماموں تبریزی اور اپنے محبوب نادر زماں کو پہچانا' پھر شرم سے چہرہ ہاتھوں میں ڈھانپ کر رونے لگی۔

"فیروزہ بیٹی' یہ کیا حال ہے؟ اور وہ تمہارا شوہر کہاں ہے؟" تبریزی نے پوچھا۔

"وہ ....وہ .... ماموں جان..... خدا کے لیے اس کا ذکر نہ کیجئے"... فیروزہ نے تھر تھر کانپتے ہوئے کہا۔ "میں بڑی مشکل سے اپنی جان بچاکر آئی ہوں ..... وہ تو نہ جانے کون ہے ..."

"اس وقت وہ کہاں ہے؟" تبریزی نے پوچھا۔ "میں اسے اس سنگدلی کا مزا چکھادوں گا"۔

"آہ.... ماموں جان دیر نہ کیجئے .... جلد کسی کو بھیجئے ... یہاں شہر میں کوئی اچھا سا عامل ضرور ہوگا..... اسے بلوا لیجئے' ورنہ وہ مجھے کبھی نہیں چھوڑے گا.... وہ لازماً یہاں آئے گا....."

"عامل کا یہاں کیا کام فیروزہ بیٹی۔ میں اس بدمعاش سے نپٹنے کے لیے اکیلا ہی بہت ہوں۔ اگر وہ زیادہ تیزی دکھائے گا' تو شہنشاہ سے کہہ کر اسے سزا دلوا دوں گا"۔

"ہائے ماموں جان..... آپ سمجھتے کیوں نہیں..... وہ گوشت پوست کا آدمی نہیں' ایک شریر جن ہے جس نے انسانی قالب میں آکر یہ شیطانی چکر چلا رکھا ہے .....جلد کسی عامل کو طلب فرمائیے اور ہاں مجھے ایک لمحے کے لیے بھی اکیلا نہ چھوڑا جائے .... یہ سختی سے ہدایت کرتی ہوں ..... اگر آپ نے مجھے تنہا چھوڑ دیا' تو وہ مجھے پھر پکڑ کرلے جائے گا....."

تبریزی اور نادر زماں حیرت سے فیروزہ کے یہ اکھڑے اکھڑے اور بے معنی جملے سن رہے تھے ...... شریر جن..... شیطانی قالب..... عامل...... نادر زماں کی نگاہوں کے سامنے صوبے دار جلال آباد کی بھیانک شبیہہ رقص کرنے لگی۔ بند دروازوں میں سے اس کا ایک دم نمودار ہونا اور اچانک غائب ہو جانا.... آہٹ

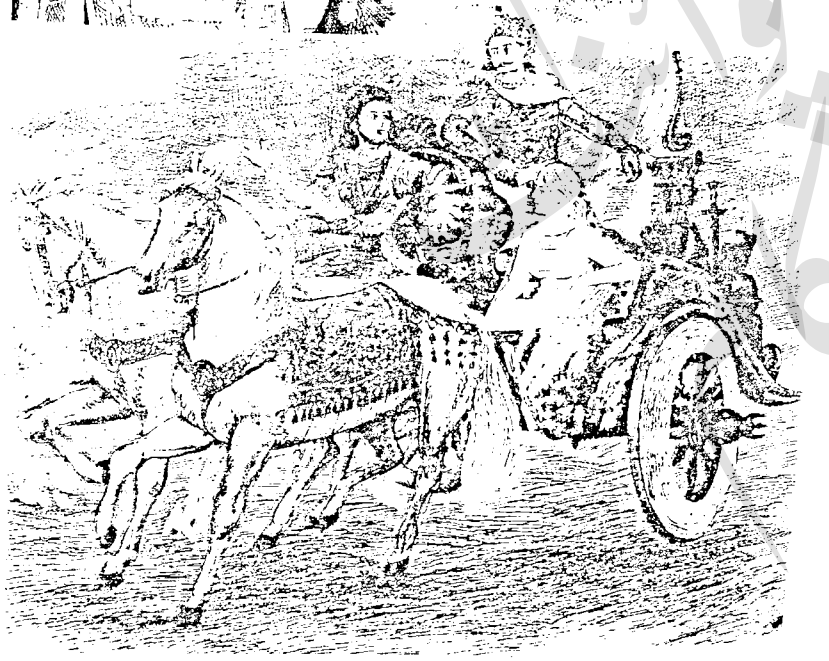

پیدا کیے بغیر چلنا..... اپنے لبادے میں سے یک لخت قلمدان برآمد کرلینا..... پھر یہ نادر ہیرے اور زیور..... کیا دنیا میں ایسا جناتی وجود بھی ممکن ہے جو حسین و جمیل انسانی دوشیزہ سے شادی کرے' اسے اپنے ساتھ لے جائے .... آخر کیوں؟

"گھبراؤ نہیں فیروزہ..... اب وہ خبیث اس حویلی میں داخل ہونے کی جرأت نہ کرے گا"۔ تبریزی نے کہا۔ "مجھے پہلے بھی شبہ تھا کہ وہ کوئی بہت بڑا ساحر ہے ..... میں ابھی افضل بیگ کو بھیجتا ہوں۔ یہاں شہر میں ایک بزرگ عملیات و تعویزات کے فن میں کامل ہیں۔ امید ہے ان کے عمل سے سحر کا اثر زائل ہو جائے گا"۔

انہوں نے فیروزہ کو اس کی خواب گاہ میں پہنچا دیا۔ وہ اتنی متوحش اور بے کل تھی کہ تبریزی کو اس کے پاگل ہو جانے کا شبہ پیدا ہوا۔ وہ بار بار یہی کہتی کہ اسے اکیلا بالکل نہ چھوڑا جائے۔ انہوں نے جھٹ پٹ کمرے میں سارے فانوس اور شمعیں روشن کر دیں اور ہر کھڑکی اور ہر دروازے کو اچھی طرح بند کر دیا۔

ابھی وہ اس کارروائی سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ دفعتہ" فیروزہ نے نہایت مدھم آواز میں جیسے کوئی سرگوشی کرتا ہے' یہ کہا۔ "خدا کی پناہ..... وہ حویلی میں آگیا..... وہ حویلی میں آگیا..... ماموں جان اسے روکیے ..... وہ مجھے لینے آیا ہے ..... میں اس کے ساتھ ہرگز نہ جاؤں گی..... دیکھو..... دیکھو..... وہ رہا ..... اب وہ صحن سے گزر کر ماموں جان کے کمرے میں جا چھپا ہے ....." ان الفاظ کے ساتھ ہی اس کے بدن میں تھرتھری چھوٹ گئی' آنکھیں اُبل پڑیں۔ ہونٹوں کے کنارے جھاگ سے بھرگئے اور وہ بے حس و حرکت ہوگئی۔

نادر زماں نے تبریزی کو وہیں رہنے کا اشارہ کیا اور خود تلوار کھینچ کر باہر نکلا۔ اسے یوں لگا جیسے ایک انسانی ہیولا سا صحن سے ہوتا ہوا آقائے تبریزی کے کمرے کی طرف چلا گیا..... نادر زماں اُدھر دوڑا' اس نے کمرے کا ایک ایک گوشہ اچھی طرح دیکھا بھالا' مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ البتہ وہ یہ حلفیہ بیان دینے کے لئے تیار تھا کہ اس نے ایک پُر اسرار انسانی سائے کو حرکت کرتے ضرور دیکھا ہے۔ دہشت

سے نادر زماں کا بدن بھی کانپنے لگا۔ ایسا لگتا ہے جیسے اس عظیم الشان حویلی میں کسی جگہ کوئی نادیدہ وجود بھی حاضر ہے اور ان کی تمام حرکات وسکنات کا بخوبی جائزہ لے رہا ہے۔

نادر زماں نے رومال نکال کر چہرے پر اس سردی میں آیا ہوا پسینہ پونچھا اور دوبارہ فیروزہ کی خواب گاہ میں آیا۔ تبریزی اس کے چھپرکٹ کے قریب ایک آرام دہ کرسی پر مستعد بیٹھا تھا۔ اس نے سوالیہ نگاہوں سے نادر زماں کی طرف دیکھا۔ اس دوران میں فیروزہ بھی ہوش میں آچکی تھی اور پلک جھپکائے بغیر نادر زماں کی جانب تک رہی تھی۔

"جناب میں نے حویلی کا ایک ایک کونہ چھان مارا' وہاں تو کوئی بھی نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے فیروزہ بیگم کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی تھیں' شاید یہ اسی کا اثر ہے"۔

"ہرگز نہیں ....." فیرزوہ نے کہا۔ "میں نے خود اسے حویلی میں داخل ہوتے دیکھا ہے یہ اونچی اونچی دیواریں اور بڑے بڑے بھاری دروازے اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتے.... میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں ..... آہ..... وہ اب اس کمرے میں آگیا ہے.... وہ دیکھو..... وہ میرے سامنے کھڑا ہے...." اس نے بری طرح چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ تبریزی اور نادر زماں دونوں حد درجہ مضطرب ہو کر تلواریں ہاتھوں میں لیے ادھر ادھر پھرنے لگے۔ انہیں وہ پُراسرار وجود دکھائی تو نہ دے رہا تھا لیکن وہ اس کی موجودگی محسوس کر سکتے تھے۔

"ہائے ..... اسے باہر نکالیے ماموں جان..... میں مرجاؤں گی۔ خدا کے لئے مجھے اکیلا نہ چھوڑیئے ..... ورنہ وہ مجھے گھسیٹ کرلے جائے گا.... کیا آپ کو خبر نہیں کہ آگ اور مٹی کا میل کبھی نہیں ہوسکتا؟" اس کے ساتھ ہی فیروزہ نے بستر سے اُٹھ کر تبریزی خاں کا ہاتھ پکڑلیا..... میں آپ کو یہاں سے جانے نہ دوں گی ماموں جان..... آپ یہیں رہیں گے .....اسی کمرے میں .....ورنہ یاد رکھیے' پھر آپ کبھی میری صورت نہ دیکھ سکیں گے"۔

انہوں نے بڑی مشکل سے فیروزہ کو دوبارہ بستر پر لٹایا۔ اس کی حالت لحہ بہ لحہ غیر ہوتی جارہی تھی اور جنوں کے آثار عروج پر نظر آنے لگے تھے۔ اتنے میں ایک سفید پوش بزرگ جن کے چہرے پر نورانیت جلوہ فگن تھی' افضل بیگ کی معیت میں اندر داخل ہوئے۔ ان کے آتے ہی فیروزہ ایک دم خاموش ہوگئی اور کہنے لگی۔

"وہ بھاگ گیا..... اس کمرے سے چلاگیا..... لیکن وہ حویلی سے باہر جانے کا ارادہ نہیں رکھتا....."

تبریزی خاں اور نادر زماں نے سفید ریش بزرگ کو ادب سے سلام کیا ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ پھر تبریزی نے مختصرانداز میں فیروزہ اور صوبے دار جلال آباد کے واقعات بیان کیے۔ یہ سفید ریش بزرگ جن کا نام سید اکمل بنوری تھا' زہد وتقویٰ اور علمیت میں ممتاز مقام رکھتے تھے ان کے بارے میں مشہور تھا کہ بھوت پریت اور شریر جنات ان کی صورت دیکھتے ہی راہِ فرار اختیار کرتے ہیں۔ سید صاحب نے کچھ پڑھ کہ فیروزہ پردم کیا' پھر ایک تعویذ مرحمت فرمایا کہ اسے گلے میں ڈالا جائے۔ اس کے بعد انہوں نے لوہے کی چند میخیں طلب فرمائیں۔ ان پر کچھ پڑھ کر دم کیا اور کہا کہ حویلی کے چاروں گوشوں میں یہ میخیں ٹھونک دی جائیں۔

جب تک سید اکمل بنوری وہاں موجود رہے فیروزہ پُرسکون نظر آئی' لیکن ان کے رخصت ہوتے ہی اس نے آنکھیں کھول دیں اور دوبارہ چیخنے چلانے لگی۔ اتنے میں گجر نے آدھی رات ہونے کا اعلان کیا۔ گجر کی آخری آواز کے ساتھ ہی حویلی میں بے پناہ شور اٹھا جیسے آندھی آگئی ہو۔ دروازے اور کھڑکیاں آپ ہی آپ کھلنے اور بند ہونے لگے تصویریں دیواروں پر سے گر کر ٹوٹنے لگیں۔ برتن اور فرنیچر آپس میں ٹکرا گئے۔ جھاڑ اور فانوس دھماکوں سے فرش پر گر پڑے اور ایک ایک کرکے سب بجھ گئے۔ حویلی میں قبر کی سی تاریکی پھیل گئی۔ اس شور میں فیروزہ کے چیخنے کی آواز برابر سنائی دے رہی تھی۔

"ماموں جان..... نادر زماں ..... جلد روشنی کرو..... وہ اندھیرے میں وار کرے گا جلدی روشنی کرو..... اندھیرا خطرناک ہے ....."

وہ دونوں فیروزہ کی خواب گاہ میں تھے اور بیک وقت چراغ جلانے کے لئے اُٹھے۔ ان کے کمرے سے باہر جاتے ہی ہولناک آواز کے ساتھ فیروزہ کی خواب گاہ کا دروازہ آپ ہی آپ بند ہوگیا۔ پھر انہوں نے فیروزہ کی لرزہ خیز چیخیں سنیں۔ وہ دروازے کی طرف بھاگے' اتنے میں یہ طوفان بلا خیز تھم چکا تھا۔ افضل بیگ شمع دان روشن کر کے لایا۔ فیروزہ کی خواب گاہ کا دروازہ بند تھا۔ انہوں نے اسے کھولنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگادیا' مگر بے سود۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کوئی نادیدہ قوت اس دروازے کے پیچھے ہے۔ فیروزہ کی چیخیں مسلسل ان کے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی مانند اتر رہی تھیں' لیکن وہ دونوں کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ پھر انہوں نے اس کمرے میں وہ کھڑکی کھولنے کی آواز سنی جو گلی کی جانب تھی۔ اس کے ساتھ ہی فیروزہ کی آخری چیخ بھی سنائی دی۔

"جلدی کرو..... نادر زماں..... ادھر جاؤ....." تبریزی چلایا۔ "وہ شاید فیروزہ کو ادھر سے لے جانے کی کوشش کر رہا ہے۔" لیکن نادر زماں جب ایک طویل چکر کاٹ کر بیرونی کھڑکی کے قریب پہنچا' تو وہاں کوئی نہ تھا' البتہ تیز ہوا میں کھڑکی کے کھلے پٹ باربار ٹکرا رہے تھے۔ واپس آیا اور ابھی وہ دروازے توڑنے کی تدبیر عمل میں لا ہی رہے تھے کہ دروازے خود بخود کھل گیا۔ وہ دیوانوں کی طرح کمرے میں داخل ہوئے ..... فیروزہ کا چھپرکھٹ خالی پڑا تھا۔ انہوں نے کھڑکی میں سے جھانکا..... آدھی رات کے اس بے کراں سناٹے میں گلی ویران اور سنسان پڑی تھی۔

(۵)

یہ واقعہ ایسا نہ تھا کہ چھپا رہتا۔ بہت جلد آگ کی طرح فیروزہ کے غائب ہونے کی خبر پھیل گئی۔ شہنشاہ نے تبریزی کو طلب کرکے سارا واقعہ سنا اور ازحد تعجب کا اظہار کیا۔ پھر شہنشاہ کے حکم سے جاسوس پورے ملک میں پھیل گئے .....

لیکن ساری کوششیں ناکام ثابت ہوئیں ..... بڑے بڑے عالموں کی خدمات حاصل کی گئیں اور انہوں نے بھی سیکڑوں ہزاروں جتن کیے' مگر لاحاصل۔ تبریزی اسی غم میں سوکھ کر کانٹا ہوگیا اور گھل گھل کر مرگیا۔ مرنے سے پہلے اس نے اپنی ساری دولت اور جائداد نادر زماں کو سونپ دی تھی' لیکن نادر زماں اس دولت کا کیا کرتا؟ اسے اپنا کچھ ہوش نہ تھا۔ دیوانوں کی طرح چاکِ گریباں' دیدۂ گریاں اور سینہ بریاں' گلی کوچوں' شہروں اور قصبوں میں آوارہ پھرتا کہ شاید کہیں اس محبوبۂ دل نواز کی ایک جھلک دکھائی دے۔ کوئی ترس کھا کر کھانے کے لیے کچھ دے دیتا' تو کھالیتا' ورنہ بھوکا ہی کسی جگہ پڑا رہتا۔

اسی طرح گھومتے گھومتے وہ جلال آباد کے نواح میں اسی جگہ جانکلا جہاں اس کی اور تبریزی کی ملاقات بوڑھے ضیغم سے ہوئی تھی۔ ضیغم مرچکا تھا' لیکن اس کے بیٹے اور پوتے اسی کھنڈر حویلی میں موجود تھے۔ نادر زماں کو وہ سیاہ گھوڑے اور بگھی یاد آئی ضیغم کے بیٹوں نے اسے بتایا کہ ایک رات کسی شخص نے ان کی حویلی کا دروازہ کھٹکھٹایا دروازہ کھولا گیا' تو سیاہ لبادہ سر سے پاؤں تک اوڑھے ایک ادھیڑ عمر کا آدمی کھڑا تھا۔ رات کی تاریکی میں اس کی آنکھیں اس طرح چمکتی تھیں جیسے دوقندیلیں روشن ہوں۔ اس کے دائیں پہلو میں تلوار لٹک رہی تھی۔ اس نے پوچھا' ضیغم کہاں ہے؟ ضیغم اس وقت بہت بیمار تھا' تاہم اس اجنبی کے حکم پر اسے حویلی کے باہر لایا گیا۔ ضیغم نے جونہی اس کی صورت دیکھی' خوف سے تھر تھر کانپنے لگا۔ اجنبی نے کرخت آواز میں کہا۔

"او بڈھے! ہمارے گھوڑے اور بگھی کدھر ہے؟"

"جناب آپ کی امانت اس خادم کے پاس ہر طرح محفوظ ہے۔" ضیغم نے جواب دیا یہ سن کہ اجنبی مسکرایا اور بولا۔ "جلدی حاضر کرو"۔ چنانچہ گھوڑے' گاڑی میں جوتے گئے اور وہ انہیں لے کر چلا گیا۔ ہاں' جاتے جاتے اس نے بوڑھے ضیغم کو ایک تھیلی دی جس میں سونے کی ایک سو اشرفیاں تھیں۔

نادر زماں کو جلال آباد کے نواح میں بڑی راحت ملتی تھی۔ یہاں ویرانہ ہی

ویرانہ تھا۔ کہیں کہیں قدیم عمارتوں کے کھنڈر تھے۔ پرانے وقتوں کا ایک قبرستان بھی دکھائی دیا جس میں خود رو جھاڑیاں تھیں اور حشرات الارض نے اپنے بل رکھے تھے۔ اس قبرستان کے آخری کنارے پر خاصی پرانی ایک مسجد کے آثار بھی نادر زماں کو دکھائی دیئے۔ مسجد پر حسرت برس رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا یہاں برسوں سے کسی نے اذان دی ہے نہ نماز پڑھی۔ خدا جانے نادر زماں کو کیا جوش آیا۔ اس نے کنویں سے پانی کھینچ کر نکالا' وضو کیا اور نماز کی نیت باندھ لی۔ رات گئے تک وہ خدا کے حضور جھکا رہا' سجدے میں گرا روتا رہا۔ حیرت انگیز طور پر اس کی روح اور بدن کو تسکین پہنچ رہی تھی پھر اس پر نیند نے غلبہ کیا اور وہ وہیں مسجد کے سنگین فرش پر لیٹ کر سوگیا۔ نہ جانے کتنی دیر وہ سویا رہا' پھر کسی نے اس کا بازو ہلا کر جگایا۔ نادر زماں نے آنکھیں کھولیں' تو اسے ایک سفید سفید انسانی سایہ اپنے قریب دکھائی دیا۔ یہ ایک عورت کا ہیولا تھا جس نے سفید چادر اپنے جسم پر لپیٹ رکھی تھی۔ اس کا چہرہ نقاب سے ڈھکا ہوا' بائیں ہاتھ میں تانبے کا چھوٹا سا شمع دان۔ وہ نادر زماں سے کچھ فاصلے پر خاموش کھڑی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس کا دل دھڑکنے لگا۔

"کون ہو تم اور رات گئے یہاں مسجد میں کیا کر رہی ہو؟" نادر زماں نے پوچھا۔ عورت نے کوئی جواب نہ دیا اور مسجد سے باہر نکل کر ایک طرف کو چل پڑی۔ پھر اس نے رک کر نادر زماں کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا کہ میرے پیچھے چلے آؤ۔ نادر زماں اس کے عقب میں ہو لیا۔ عورت ایک ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈی پر چلی جا رہی تھی۔ یہ پگڈنڈی اسی قدیم قبرستان میں سے گزر رہی تھی۔ چاروں طرف موت کی سی خاموشی چھائی تھی اور نادر زماں شکستہ قبروں کے بیچ میں سے مڑتا' بل کھاتا پھلانگتا برابر عورت کے پیچھے چلا جا رہا تھا۔ دور ایک سیاہ عمارت کے کھنڈر دکھائی دیئے۔ جس کے اردگرد اونچے اونچے درختوں کا گھنا جھنڈ تھا۔ نادر زماں نہ پہچان سکا کہ یہ درخت کس قسم کے تھے' وہ تو عورت کے قدموں پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ ان دونوں کا درمیانی فاصلہ دس بارہ ہاتھ سے زیادہ نہ تھا' کبھی

کبھی وہ مڑکر دیکھ لیتی کہ نادر زماں آرہا ہے یا نہیں' پھر مطمئن ہوکر آگے چل پڑتی۔

عمارت کے قریب پہنچ کر وہ رک گئی۔ نادر زماں اس کے بالکل نزدیک پہنچ گیا۔ شمع دان ابھی تک عورت کے ہاتھ میں تھا۔ دائیں ہاتھ سے اس نے ایک دم سیاہ نقاب الٹ دی۔

"فیروزہ.....!!" نادر زماں کے حلق سے گھٹی گھٹی سی چیخ نکلی۔

"شش.... خاموش....." فیروزہ نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ نادر زماں کے ذہن میں سینکڑوں سوالات ابھرنے لگے' لیکن وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ فیروزہ نے اسے چپ رہنے کا حکم جو دیا تھا۔ پھر فیروزہ نے پھونک مار کر شمع بجھادی۔ دھوئیں کی ایک پتلی سی لکیر بجھی ہوئی شمع سے نکلی اور فضا میں تحلیل ہوگئی۔

نادر زماں صرف اتنا سمجھ سکا کہ یہ عمارت کسی بادشاہ کا مقبرہ ہے جو امتدادِ زمانہ کے باعث کھنڈر میں تبدیل ہوگیا ہے' لیکن سوال یہ تھا کہ فیروزہ یہاں کیا کر رہی ہے۔ اب وہ پھر چل پڑی تھی۔ ایک لمبی غلام گردش سے گزر کر وہ کھلے صحن میں داخل ہوئی۔ یہاں بھی قبریں ہی قبریں اور خود رُو جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں۔ اس سے پرے ایک گول چبوترہ سا بنا ہوا تھا۔ چبوترے کے اوپر رات کی تاریکی میں کسی ہیبت ناک دیو کے سر کی مانند ایک گنبد سا دکھائی دیا۔ فیروزہ چند سیڑھیاں چڑھ کر چبوترے پر گئی۔ ایک گوشے میں سنہری رنگ کا چھپر کھٹ پڑا تھا۔ اس کے اردگرد سیاہ چادریں تنی ہوئی تھیں۔ چھپر کھٹ کے قریب پہنچ کر اس نے نادر زماں کو اشارے سے نزدیک بلایا' پھر پردے کا ایک گوشہ اٹھا دیا۔ نادر زماں نے بڑی مشکل سے چیخ روکی۔ کیا دیکھا کہ صوبے دار جلال آباد بستر پر لیٹا گہری نیند سو رہا ہے۔ نادر زماں نے اسے پہچاننے میں ذرا دیر نہ لگائی۔ ابھی وہ اس کا بھیانک سراپا دیکھ ہی رہا تھا کہ صوبے دار نے آنکھیں کھول دیں۔ نادر زماں بے ہوش ہوکر وہیں گر پڑا۔

علی الصبح ادھر سے گزرنے والے چند کسانوں نے نادر زماں کو وہاں سے اٹھایا۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ پاگلوں کی طرح ادھر ادھر دوڑتا رہا۔ وہ یہ یقین کرنے کو کسی طرح آمادہ نہ تھا کہ اس نے کوئی خواب دیکھا ہے۔ وہ بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار تھا کہ یہ سب کچھ عالمِ بیداری میں ہوا ہے اور فیروزہ یہیں کہیں کسی کھنڈر میں قید ہے' لیکن کس کھنڈر میں؟ وہاں تو میلوں تک شکستہ عمارتوں کے کھنڈر پھیلے ہوئے تھے۔

نادر زماں کو یقین کامل تھا کہ اس نے خواب ہرگز نہیں دیکھا۔ کیا وہ خواب اور بیداری کے معاملات میں تمیز نہیں کر سکتا تھا؟ وہ یقیناً "گوشت پوست کی بنی ہوئی فیروزہ ہی تھی۔ تبریزی خاں مرحوم کی بھانجی اور نادر زماں کی روح میں رچی بسی فیروزہ۔ اس کا دل گواہی دیتا تھا کہ فیروزہ مری نہیں' زندہ ہے اور جلال آباد کا وہ پُراسرار صوبے دار دولت خاں' جو نہ جانے کون تھا' فیروزہ کو وہیں کہیں زمانۂ قدیم کے ان کھنڈروں میں چھپائے ہوئے ہے جو جلال آباد کے نواح میں کوسوں دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ نادر زماں کی حالت ان دیوانوں کی سی تھی جسے اپنے تن بدن کا بھی ہوش نہیں رہتا اور جو اپنی دھن میں دنیا و مافیہا سے بے پروا ایک ایسی منزل کی جانب رواں دواں رہتے ہیں جس کی خبر خود انہیں بھی نہیں ہوتی کہ کہاں ہیں۔ ہاں ایک ہی صورت اس کے سامنے ہر دم رقصاں رہتی اور وہ صورت فیروزہ کی تھی۔ وہ خوب جانتا تھا کہ فیروزہ کو فراموش کر دینا اس کے لئے ناممکن ہے۔ بعض اوقات خود فراموشی کے ایسے لمحات بھی نادر زماں پر آتے جب اسے یہ بھی یاد نہ رہتا کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے' تاہم اس عالم میں بھی اس کی روح میں سے فیروزہ فیروزہ کی آوازیں اٹھتی رہتی تھیں۔

نادر زماں کی خواہش تھی کہ ایک مرتبہ پہلے کی طرح فیروزہ اسے پھر دکھائی دے اور وہ اس سے پوچھے کہ صوبیدار جلال آباد کا ٹھکانہ کہاں ہے اور تمہیں اس کے شیطانی پنجے سے کیونکر چھڑایا جاسکتا ہے، اسی دھن میں وہ ویرانوں کے چکر کاٹتا رہتا۔ تھک جاتا' تو کسی بوسیدہ سی قبر کے پاس لیٹ کر سوجاتا۔ کوئی

راہ گیر ادھر سے گزرتا تو نادر زماں کو رحم کی نگاہوں سے دیکھتا اور اسے بیدار پاکر کچھ کھلانے پلانے کی کوشش کرتا۔ اس کوشش میں بہت کم لوگ کامیاب رہتے۔ وہ کسی سے سوال کرتا نہ کسی کے گھر جاتا اور نہ کسی سے بات کرتا۔ آہستہ آہستہ گردو نواح میں اس کی شہرت ایک مجذوب اور پہنچے ہوئے فقیر کی حیثیت سے پر لگا کر اڑنے لگی۔ اس کی زبان میں حیرت انگیز تاثیر آگئی تھی۔ عالمِ بے ہوشی میں جو کچھ اس کی زبان سے نکلتا' پورا ہو جاتا۔ دنیا کے ستائے ہوئے اور اپنی خواہشوں کے مارے ہوئے بے شمار افراد دن رات اسے گھیرے رہنے لگے۔ کوئی حاجت مند اس کے پاؤں دباتا' کوئی پنکھا جھلتا' کوئی اس کے لئے عمدہ مٹھائیاں اور لذیذ کھانے پکوا کر لاتا اور کوئی زروجواہر نچھاور کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا' لیکن یہ مجذوب ایسا نرالا تھا کہ کسی شے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔ اگرچہ اس کے بدن پر چیتھڑے لٹک رہے تھے' ڈاڑھی' مونچھوں اور سر کے بال بڑھ کر ایک ہوگئے تھے' ہاتھ پیروں پر خاک دھول اَٹی تھی' لیکن چہرے پر جلال کی وہ کیفیت تھی کہ کسی کو اس سے آنکھیں چار کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔ وہ ہمہ وقت گردن جھکائے آپ ہی آپ پُراسرار آواز اور انوکھے لہجے میں کسی نادیدہ ہستی سے باتیں کرتا دکھائی دیتا۔ عقیدت مند خیال کرتے کہ فقیر نہ جانے کس مقام پر ہے اور معرفت و حقیقت کی کونسی منزلیں سر کر رہا ہے۔ ان خیالوں کے ساتھ ساتھ عقیدت بھی بڑھتی جاتی حتیٰ کہ دن رات کا کوئی لمحہ ایسا نہ تھا جب دو چار حاجت مند اور اپنی مرادیں پوری کرانے والے نادر زماں کے گرد دست بستہ نہ کھڑے ہوں۔

اس رات بھی یہی کیفیت تھی۔ نادر زماں نے ایک مرتبہ اپنے عجیب و غریب مراقبے سے چونک کر جھرجھری سی لی' آنکھیں کھولیں' تو ارد گرد چند افراد ادب سے حلقہ باندھے خاموش بیٹھے دکھائی دیئے۔ فقیر نے جونہی آنکھیں کھولیں سب نے ہاتھ جوڑ دیے اور اپنی اپنی رام کہانی کہنے لگے۔ نادر زماں نے اپنا پھٹا پرانا کمبل جسم پر لپیٹا اور کسی سے کچھ کہے بغیر ایک طرف چل پڑا۔ لوگوں نے اس

کے پیچھے آنے کی کوشش کی لیکن اس نے کرخت آواز میں ڈانٹ ڈپٹ کر سب کو بھگا دیا' کوئی غیر مرئی طاقت اسے نہ جانے کدھر لیے جارہی تھی۔ آسمان پر گہرے بادل چھا رہے تھے اور مغرب کی جانب سے تیز ہوا کا طوفان آنے ہی والا تھا۔ جب وہ قبرستان میں سے گزرا تو یکایک سیاہ رنگ کی ایک بہت بڑی بلی ایک شکستہ قبر میں سے اچھل کر نکلی اور جبڑا کھول کر بری طرح غرّانے لگی۔ نادر زماں نے اتنی بڑی بلی پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ وہ فوراً" رک گیا۔ بلی چند گز دور کھڑی مسلسل غرّا رہی تھی۔ اس کے سفید نوکیلے دانت اندھیرے میں چمک رہے تھے اور سبز آنکھیں مشعلوں کی مانند روشن تھیں۔ آہستہ آہستہ اس کی چیخیں اور غراہٹیں تیز ہونے لگیں اور ان بھیانک آوازوں سے زمین لرزنے لگی۔ نادر زماں اپنی جگہ پتھر کا بت بنا کھڑا رہا۔ بلی آگے بڑھی' اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے اور وہ نادر زماں پر حملہ کرنے کے لیے تیار نظر آتی تھی۔ نادر زماں کے پاس اپنی مدافعت کے لیے کوئی ہتھیار نہ تھا۔ اس نے جلدی سے ایک پتھر اٹھایا اور پوری قوت سے بلی کی کھوپڑی پر دے مارا۔ پتھر لگتے ہی بلی کے سر سے خون کا فوارہ اُبل پڑا اور وہ بری طرح چیختی غراتی پلٹ کر بھاگی۔ دیر تک اس کی لرزہ خیز آوازوں سے قبرستان گونجتا رہا۔ نادر زماں کے بدن پر کپکپی طاری ہوگئی اور وہ بغیر سوچے سمجھے ایک طرف بھاگنے لگا۔ رات ازحد تاریک اور سرد تھی' ہوالمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جارہی تھی۔ پھر آسمان کے سوتے کھل گئے موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ بجلی کی کڑک اور بادل کی گرج نے ہرشے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ نادر زماں پانی میں بھیگتا اور ٹھنڈ سے کانپتا ہوا پناہ کی تلاش میں بھاگتا رہا۔ نہ جانے کتنی بار وہ ٹھوکریں کھا کر زمین پر گرا' اٹھا اور پھر دوڑا۔ اب وہ قبرستان سے نکل کر آگرے کو جانے والی سڑک پر دوڑ رہا تھا۔ دائیں جانب پہاڑی ٹیلوں کا ایک طویل و عریض سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ فیروزہ کی تلاش میں دن کے وقت وہ بارہا ان ٹیلوں کی جانب آیا تھا اور یہاں کا ایک ایک چپہ چپہ اس کا دیکھا بھالا تھا۔

دفعتہ" اس کی نگاہ اٹھی اور اس نے اپنے بالکل سامنے ایک جھونپڑی میں

چراغ جلتا ہُوا پایا۔ وہ وہیں ٹھٹھک کر کھڑا ہوگیا اور حیرت سے سوچنے لگا یہ جھونپڑی کس کی ہے اور اس خوفناک طوفان میں یہ کیسا چراغ ہے جو برابر روشن ہے اور بجھتا نہیں۔ وہ حد درجہ تجسّس کے ساتھ آہستہ آہستہ جھونپڑی کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچا ہی تھا کہ اندر سے ایک پُر جلال آواز آئی۔

"نادر زماں' اندر چلے آؤ"۔

یہ آواز سنتے ہی اس کا کلیجہ کانپ گیا۔ اس آواز میں اور صوبیدار جلال آباد کی آواز میں کتنی مشابہت تھی۔ ایک لمحے کے لئے اسے یوں لگا جیسے اس کے قلب کی حرکت رک گئی ہو۔ وہ وہاں سے بھاگنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ وہی مہیب آواز پھر اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"ڈرو نہیں نادر زماں۔ بے خوف ہوکر اندر آجاؤ"۔

اس نے پھر بھاگنا چاہا' لیکن زمین نے جیسے پاؤں تھام لیے تھے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے اپنے آپ کو جھونپڑی میں پایا۔ ایک شکستہ بوریے پر نہایت کہن سال بزرگ گردن جھکائے دو زانو بیٹھے تھے۔ ان کی سفید ریش ناف تک لمبی تھی۔ بھنویں اور پلکیں بھی انڈے کی طرح سفید تھیں۔ قریب ہی ایک پتھر پر دیا روشن تھا۔ ان پیر مرد کی عمر کا کوئی اندازہ نادر زماں کو نہ ہوسکا۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی بزرگ نے گردن اٹھائی۔ ان کی نگاہوں میں ہیبت اور جبروت کی بجلیاں سی کوند رہی تھیں۔ نادر زماں بے اختیار ان کے قدموں پر گر پڑا اور سسکیاں لے لے کر رونے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ رونے سے چھاتی پر رکھا ہوا بے انداز بوجھ ہلکا ہورہا ہے۔ جب وہ گنگا جمنا بہاچکا' تو بزرگ نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر کر کہا۔

"نادر زماں کیا خدا کی رحمت سے مایوس ہوچکے ہو؟ مرد کو یوں رونا زیب نہیں دیتا"۔

غریب شکستہ حال شکستہ دل مصور نے پھر ان پیر مرد کے پاؤں پکڑ لیے اور عقیدت سے بوسہ دے کر بولا:

"حضور پر میرا حال سب روشن ہے۔ میں اپنی کج زبان سے کیا عرض کروں"۔

"نہیں تم خود بیان کرو۔ ہم کوئی صاحبِ کشف نہیں۔" پیر مرد نے محبت سے کہا۔ "ہم نے تمہارا ذکر لوگوں سے سنا ہے اور ایک آدھ مرتبہ تمہیں ادھر سے گزرتے بھی دیکھا۔ جب اس طوفانی شب میں ہم نے کسی انسان کے دوڑنے کی آواز سنی' تو سمجھ گئے کہ یہ نادر زماں کے سوا اور کوئی شخص نہیں ہو سکتا' اس لیے ہم نے بے تکلف اپنے قیاس پر اعتبار کر کے آواز دی اور خدا کا شکر ہمارا قیاس صحیح نکلا۔ ہم کسی قدر تمہاری مصیبت سے بھی آگاہ ہیں' لیکن تفصیلات تمہاری زبانی سننے کے مشتاق ہیں"۔

اور تب نادر زماں نے آنسوں' آہوں اور ہچکیوں کے ساتھ ساتھ اپنی بپتا الف سے ے تک کہہ سنائی۔ پیر مرد ضبط و تحمل سے سنتے رہے۔ ایک دوبار انہوں نے اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے نادر زماں کو دیکھا' آپ ہی آپ مسکرائے اور کچھ کہے بغیر گردن جھکا کر اس کی الم ناک داستان سننے لگے۔ آخر میں نادر زماں نے قبرستان کی سیاہ بلی کا ذکر کیا' تو وہ ایک دم چونک پڑے اور کہا:

"اس کا مطلب ہے کہ وہ خبیث ابھی تک جلال آباد کے نواح میں موجود ہے"۔

"کیا آپ کی مراد صوبیدار جلال آباد سے ہے؟" نادر زماں نے پوچھا۔

"ہاں۔ وہ نہایت شریر جن ہے اور میری معلومات کے مطابق اس نواح میں بہت عرصے سے رہ رہا ہے۔ اس سے پیشتر بھی وہ انسانی بھیس میں آن کر کئی حسین لڑکیوں کو لے جا چکا ہے اس کے پاس بعض قوتیں ایسی ہیں جو اس قسم کے شیطانی کاموں میں اس کی مدد کرتی ہیں۔ سیاہ بلی کے بھیس میں وہی تھا۔ تم نے بہت اچھا کیا کہ پتھر اس کی کھوپڑی پر مارا۔ آئندہ وہ اس شکل میں آئے تو بے دریغ اسے ہلاک کر ڈالنا" یہ کہہ کر پیر مرد نے اپنے بوریے کے نیچے سے ایک چھوٹا سا خنجر نکال کر نادر زماں کو دیا۔

"اسے اپنے پاس حفاظت سے رکھو۔ وہ دوبارہ کسی نہ کسی روپ میں پھر تمہیں دکھائی دے گا۔ جونہی موقع ملے' یہ خنجر اس کے جسم میں گھونپ دینا..... خواہ وہ سیاہ رنگ کی صورت میں ہو یا سیاہ بلی کی شکل میں۔ یہ دونوں اجسام ایسے خبیث جنات کو زیادہ پسند ہیں اور وہ اکثر انہی میں حلول کر کے انسانوں کو ڈرایا کرتے ہیں۔ تمہارا واسطہ جس جن سے ہے' وہ خود بہت بڑا عامل ہے اور یہی سبب ہے کہ معمولی درجے کے عمل اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ پہلے وہ دکن کی جانب واقع پہاڑی غاروں میں سے ایک میں رہتا تھا لیکن جب سے حضرت خواجہ محمد گیسو درازؒ وہاں تشریف لے گئے' تو ان کے قدموں کی برکت سے یہ شریر جن فرار ہوا' اور جلال آباد کے نواح میں ایک بوسیدہ مسجد کے قریب اپنا ٹھکانا بنا لیا۔ علاقے کی حسین عورتوں کو برسوں اس نے پریشان کیا اور اب اس کے حوصلے یہاں تک بڑھے کہ انسانوں کی شکل اختیار کر کے عورتوں کو اٹھا کر لے جانے لگا ہے۔ فیروزہ اسی کی قید میں ہے اور جب تک وہ مر نہیں جائے گی یہ جن اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ یہ نامراد کئی صدیوں سے انہی شیطانی حرکتوں میں مصروف ہے' لیکن شاید اب اس کا وقت پورا ہونے والا ہے"۔

"حضرت' کیا کوئی طریقہ ایسا نہیں جس سے فیروزہ کو آزاد کرایا جا سکے؟" نادر زماں نے پوچھا۔

"طریقہ صرف یہ ہے کہ اس ناری مخلوق پر جس کی حکومت ہے' اس سے سارا حال بیان کیا جائے' وہی اسے سزا دے سکتا ہے اور اسی کے حکم سے فیروزہ واپس انسانوں کی دنیا میں صحیح سلامت آ سکتی۔ ہم صرف اس سے ملاقات کا قاعدہ تمہیں تلقین کر سکتے ہیں' باقی کام تمہیں خود کرنا ہوگا' لیکن یہ سوچ لو کہ اس میں جان کا خطرہ ہر وقت لاحق ہے، اگر ذرا بھی اپنی حفاظت سے غافل ہوئے یا اس عمل میں ناکام رہے جو ہم تمہیں بتائیں گے' تو یہ شریر جن حاوی ہو جائے گا۔ پھر تم اس کے رحم و کرم پر ہو گے"۔

ان الفاظ کی برکت ایسی تھی کہ نادر زماں کے دل میں جرأت و ہمت کی بجھی

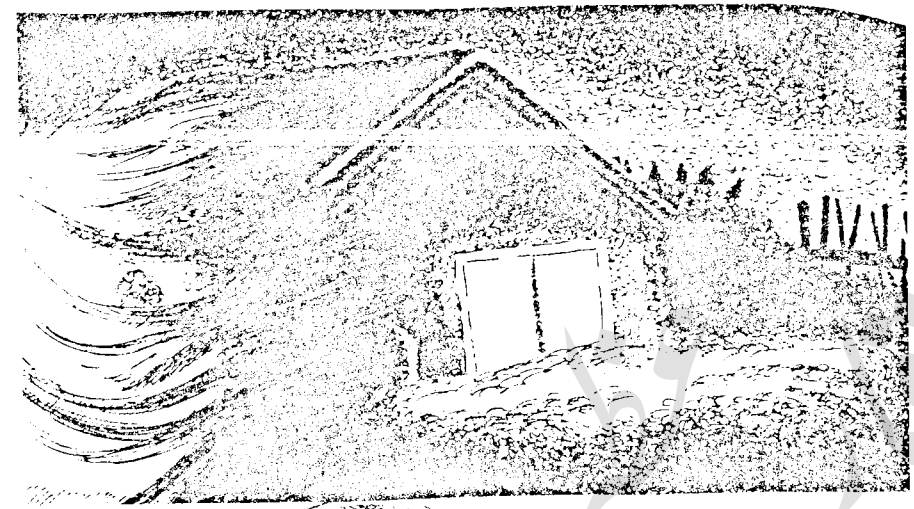

ہوئی چنگاری روشن ہو گئی ۔ فیروزہ کے لیے وہ اپنی جان پر کھیل جانا ایک معمولی بات سمجھتا تھا' چنانچہ اس نے پھر اُن بزرگ کے قدموں کو بوسہ دیا اور کہا کہ عمل ارشاد فرمائیں' وہ ہر ممکن کوشش کرکے اس پر پورا اترے گا۔ پیر مرد نے یہ سن کر کہا کہ پہلی شرط اس میں یہ ہے کہ ہر دم پاک صاف رہنا ہوگا تاکہ شریر روحیں اور جنات اس کے قریب نہ آسکیں۔ پھر جلال آباد کی پرانی مسجد میں بیٹھ کر اسم ذات تین راتوں میں سوا لاکھ مرتبہ پڑھنا ہوگا جو اس مقصد کے لیے بتایا جائے گا۔ اس میں کامیابی کے بعد راستہ آسان ہے۔ اس عمل کو خراب کرنے کی پوری کوشش جنات کی جانب سے کی جائے گی اور وہ عامل کو بھی طرح طرح سے دھوکہ دے کر حصار سے باہر نکالنے کی جد و جہد کریں گے' لیکن عامل کو ان کی کوئی پروا نہ کرنی چاہیئے ۔ جنات حصار کے اندر داخل ہونے کی جرأت نہ کریں گے۔ جب عمل پورا ہو جائے گا تو شاہِ جنات سے رابطہ قائم کرنا کچھ دشوار نہ ہوگا۔

ان بزرگ کا نام سیّد صالح تھا اور اس وقت ان کی عمر ایک سو پچیس برس کی تھی۔ نادر زماں نے اس جھونپڑی میں رہنا شروع کر دیا اور سیّد صالح سے اس عمل کے تمام قواعد اچھی طرح معلوم کرکے ذہن نشین کیے۔ اس دوران میں ایک عجیب انکشاف یہ ہوا کہ جب تک وہ جھونپڑی میں رہتا کسی قسم کا خوف اس کے نزدیک نہ آتا' لیکن جونہی وہ جھونپڑی سے باہر قدم رکھتا' طرح طرح کے وسوسے' وہم اور اضطراب انگیز تصوّرات اس پر حاوی ہونے لگتے۔ فضا میں پُراسرار آوازیں سنائی دیتیں اور کبھی ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی نادیدہ دشمن اس کے دائیں بائیں موجود ہے جو نادر زماں کی ہرحرکت پر گہری نظر رکھے ہوئے ہے۔ ایسے وقت میں وہ سید صالح کا عطا کردہ خنجر نکال کر اپنے ہاتھ میں تھام لیتا۔ سید صالح کی ہدایت کے مطابق اس نے سر' مونچھوں اور داڑھی کے غیر ضروری بال ترشوا دیئے اور پاکیزگی و صفائی کا نہایت خیال رکھنے لگا۔ آخر وہ شب آئی جب اسے جلال آباد کی پرانی مسجد میں داخل ہوکر ٹھیک بارہ بجے اپنا عمل شروع کرنا تھا۔ سید

صالح نے اسے شب و روز میں سورج اور چاند کی نقل و حرکت کا ایک واضح زائچہ بنا کر دیا تھا جس کے حساب سے نادر زماں کو حصار میں بیٹھ کر عمل کا آغاز کرنا تھا۔

نادر زماں نے میرے جدِ امجد ترکتاز خاں کو اپنی آخری تصویر کے ساتھ کاغذوں کا ایک بھاری پلندہ بھی دیا تھا۔ یہ پلندہ برسوں ایک کوٹھڑی میں پڑا رہا اور کسی نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔ آخر ایک روز کسی ضرورت سے یہ تاریک کوٹھڑی کھولی گئی تب یہ پلندہ دکھائی دیا۔ اکثر کاغذ ایسے تھے جنہیں دیمک چاٹ چکی تھی، تاہم توجہ دی گئی، تو اکثر کاغذوں کی عبارت پڑھنے میں آگئی۔ یہ نادر زماں کا روزنامچہ تھا جسے اس نے فصیح اور شستہ فارسی میں قلم بند کیا تھا۔ اس کے اوراق ترتیب دیئے گئے تو ایک حیرت انگیز مگر ہولناک داستان سامنے آئی۔ بہتر یہی ہے کہ ہم ان اوراق کا خلاصہ اردو زبان میں پیش کریں تاکہ ہمارے قارئین اس داستان سے اچھی طرح لطف اندوز ہو سکیں۔

۱۰ر شعبان ۱۰۵۱ ہجری:

سید صالح کی جب سے مجھے زیارت ہوئی ہے، میری زندگی میں عجیب انقلاب برپا ہوا ہے۔ یہ شخص علوم ظاہری و باطنی کا بہت ماہر ہے اور اس کی عمر کا بڑا حصہ سیر و سیاحت میں بسر ہوا ہے۔ میں نے شیخ کی زبانی انتہائی تعجب خیز کہانیاں سنی ہیں جو لفظ بہ لفظ بیان کروں تو ایک نئی الف لیلیٰ تیار ہو سکتی ہے۔ شیخ صالح نہ صرف عارفِ کامل ہے، بلکہ بہت بڑا کیمیاگر بھی ہے اگرچہ وہ اس فن کو مردود قرار دے کر ترک کر چکا ہے، لیکن اس نے ایک روز مجھے اس خام کو کندن میں بدل کے دکھایا۔ اس کے علاوہ اسی قبیل کے بقیہ چار علوم کا بھی جاننے والا ہے جنہیں لیمیا سیمیا اور ریمیا کہتے ہیں۔ شیخ کا بیان ہے کہ یہ پانچوں علوم ایسے ہیں کہ ان سے دنیا کی کایا پلٹی جا سکتی ہے، مگر ان کا جاننا، سیکھنا اور ان پر عمل کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ شیخ نے مجھے بتایا کہ ان پانچوں علوم کے ابتدائی حرفوں سے ایک کلمہ بنتا ہے کلمہ سرے یعنی یہ تمام علوم سِتری ہیں .... چھپے ہوئے ہیں اور ہر کس و

ناکس کو عطا نہیں کئے جاتے۔ انہی میں وہ علم بھی ہے جو شیخ نے مجھے سکھانے کا ارادہ کیا ہے، یعنی روح کو ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل کرنے کا عمل۔ اس کا عملی مظاہرہ بھی شیخ نے میرے سامنے کیا اور میں بڑی مشکل سے اپنے دل کو حرکت بند کرنے سے روک سکا۔ اتنی دہشت مجھ پر طاری رہی کہ پناہ بخدا۔ شیخ نے ایک شب اپنی روح اپنے پالتو طوطے میں منتقل کر دی۔ اس دوران میں شیخ کا جسم ایک مقام پر بے حس و حرکت پڑا رہا اور طوطے نے شیخ کی زبان میں بولنا شروع کیا، اگر یہ تماشا مزید چند لمحے جاری رہتا، تو شاید پھڑ پھڑا کر میرا دم نکل ہی جاتا۔ میں تھر تھر کانپنے لگا۔ اتنے میں شیخ الا اللہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے عرض کیا کہ طوطے کی روح کہاں تھی؟ فرمایا "میرے بدن میں۔" شیخ نے حبسِ دم کی بھی جوانی میں بڑی مشق کی تھی اور ابھی تک یہ مشق چھوڑی نہیں۔ میرا خیال ہے ان کی درازی عمر کا راز بھی اسی حبسِ دم کی مشق میں پنہاں ہے۔ مجھے اس نے ازراہِ کرم اسمِ ذات کے عمل کی تلقین اور اجازت دی ہے۔

شب سخت تاریک اور ڈراؤنی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فضا کسی کے سوگ میں ویران اور خاموش ہے۔ آسمان پر کوئی تارہ بھی جھلملاتا دکھائی نہیں دیتا۔ میں شیخ صالح کی بابرکت جھونپڑی سے نکل کر جلال آباد کی اس پرانی مسجد کی طرف بڑھ رہا ہوں جو قبرستان کے کنارے واقع ہے اور جس کی بوسیدہ چھتوں میں چمگادڑوں نے پناہ لے رکھی ہے۔ مجھے اندازے کے مطابق، وہاں تک پہنچنے میں کوئی ڈھائی کوس کا فاصلہ طے کرنا ہے۔ میرے اردگرد پہاڑی ٹیلے پھیلے ہوئے ہیں اور اندھیرے میں ان کی شکلیں ہر لمحہ بدل رہی ہیں، کبھی کچھ، کبھی کچھ۔ آس پاس سخت پتھریلی بنجر زمین پر ناگ پھنی قسم کے پودے بھی کثرت سے ہیں۔ اونچے اونچے، چھوٹے چھوٹے، پھیلے پھیلے، سمٹے سمٹے، میں ان پر نگاہ جماتا ہوں، یہ پودے بھی عجیب بھیانک شکلیں اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ یکایک پودا میرے سامنے سمٹا، پھر اونچا اٹھنے لگا، پھر ناگ بن کر اس نے اپنا چوڑا پھن پھیلایا اور قد آدم ہو کر جھومنے لگا۔ اس کی دوشاخہ زبان بھی لہراتی، تڑپتی ہوئی میں نے

دیکھی اور ننھی ننھی سرخ آنکھیں انگاروں کی مانند دہکتی پائیں۔ میری سماعت نے اس کی پھنکار بھی اچھی طرح سنی' لیکن مجھ پر خوف کا ذرہ برابر بھی اثر نہ ہوا۔ میں شیخ صالح کا خنجر ہاتھ میں تھامے ہوئے ہوں اور آیتہ الکرسی کا ورد کرتا چلا جارہا ہوں۔ آگے بڑھ کر میں اس ناگ کو غور سے دیکھتا ہوں اور خنجر کے ایک ہی وار سے اس کا پھن کاٹ ڈالتا ہوں۔ چشم زدن میں وہ ناگ دوبارہ پودے میں ہوکر چھوئی موئی کی مانند سمٹ کر زمیں بوس ہو جاتا ہے۔ اس کی ایک شاخ کٹ کر الگ پڑی ہے۔ ابھی میں نے نصف فاصلہ طے کیا ہے کہ یکایک ایک پہاڑی ٹیلے کے عقب سے بچے کی رونے کی آواز آتی ہے۔ میں حیران ہوں کہ اس اجاڑ بیابان میں نصف شب کے وقت' یہ بچہ کہاں سے آیا' میں اس آواز پر کوئی توجہ نہیں دیتا اور تیزی سے اپنا راستہ طے کرتا ہوں کہ اتنے میں بچے کے رونے اور چیخنے کی آواز میرے بالکل قریب آ جاتی ہے۔ میں تھم جاتا ہوں۔ مجھ سے کوئی دس ہاتھ آگے تین چار سال کا ایک بچہ کھڑا رو رہا ہے۔ اس کے رونے کی آواز میرے دماغ کو برمے کی مانند چھیدتی ہوئی گزر رہی ہے۔

"مجھے گھر لے چلو..... مجھے گھر لے چلو..... مجھے گھر لے چلو....." بچہ رو رو کر کہہ رہا ہے۔ اس نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے ہیں۔ یک بیک یہ ہاتھ لمبے ہونے لگتے ہیں اور میری گردن دبوچنے کے لئے حرکت میں آتے ہیں۔ میں خنجر کا وار کرتا ہوں۔ دونوں بازو مولی کی طرح کٹ کر زمین پر گرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ پُراسرار بچہ' جو کوئی شریر جن ہے اور صوبیدار جلال آباد کا بھیجا ہوا معلوم ہوتا ہے' ویرانے سے چیختا چلاتا بھاگ جاتا ہے۔ اس کے قدموں کی آواز دیر تک زلزلے کی مانند بیاباں میں گونجتی رہتی ہے۔ میں مسلسل کلام الٰہی کی زیرلب تلاوت کرتا مسجد کی طرف بڑھ رہا ہوں اور اب دوڑنا شروع کرتا ہوں۔ دفعتہً مسجد سے کچھ دور مجھے ہلکی ہلکی روشنی نظر آتی ہے اور یوں لگتا ہے جیسے وہاں دس بارہ چراغ روشن ہیں۔ یہ چراغ گردش میں ہیں۔ نزدیک جاتا ہوں' تو حیرت اور خوشی کی انتہا نہیں رہتی۔ وہاں فیروزہ اپنی تمام رعنائیوں اور حسن وجمال کے جلو

میں کھڑی ہے۔ ایک سنہری تھالی میں کئی چراغ جل رہے ہیں اور یہ تھالی فیروزہ کے ہاتھ میں ہے۔

"آؤ نادر زماں..... میں کتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ اُف خدایا..... یہ تمہارے ہاتھ میں خون آلود خنجر کیسا ہے؟ اسے پھینک دو جانِ من' مجھے اپنے بازوؤں میں لے لو۔ میں تم سے ملنے کے لئے تڑپ رہی ہوں..."

"فیروزہ ..... تم یہاں اس ویرانے میں کیا کر رہی ہو.....؟" میں کہتا ہوں' جلد بتاؤ وہ خبیث صوبیدار جلال آباد کہاں ہے؟ اب وہ مجھ سے بچ کر نہیں جاسکتا"۔

فیروزہ کی مترنم ہنسی فضا میں گونجتی ہے۔ آہستہ آہستہ وہ میرے قریب آ رہی ہے۔ ایک بار پھر میں اس کا چہرہ دیکھتا ہوں۔ یہ خال وخط' یہ قوسیں' یہ لکیریں' یہ آبرو' یہ رخسار یہ لب یہ زنخداں بے شک سب اسی کے ہیں' لیکن نہ جانے کیوں میرے دل میں کراہت اور نفرت کا ایک الاؤ خود بخود سلگ اٹھا ہے۔ میں کلام الٰہی پڑھ کر پھونک مارتا ہوں اور دفعتہً" تھالی میں رکھے ہوئے تمام چراغ گل ہو جاتے ہیں۔ پھر ایک مکروہ بھیانک قہقہہ ہوا کے دوش پر سوار ہوکر آتا ہے اور میرے کانوں سے مسلسل ٹکراتا ہے۔ میں یہ آواز پہچان لیتا ہوں۔ یہ وہی صوبیدار جلال آباد ہے۔ اس کا یہ فریب بھی ناکام ہوگیا ہے۔ میں جلدی سے مسجد میں داخل ہو جاتا ہوں۔ ہر طرف اب گہرا سناٹا ہے۔ اس نواح میں حشرات الارض اَن گنت ہیں۔ برابر ان کے بولنے اور چیخنے کی آوازیں سنتا رہا ہوں' لیکن اس وقت سب کو سانپ سونگھ گیا ہے۔ جھینگر بھی چپ ہیں اور مینڈک بھی نہیں ٹرا رہے۔ مسجد کے در و دیوار پر حسرت برس رہی ہے۔ میں شیخ صالح کی ہدایت کے مطابق ساعتوں کا اندازہ کرکے مسجد کے ایک کچے حجرے میں اپنے خنجر کی نوک سے ایک وسیع دائرہ کھینچتا ہوں یہ حصار ہے۔ شیاطین سے میری سلامتی اور حفاظت کا حصار اور مجھے اسی کے اندر بیٹھ کر اسم ذات کا عمل پورا کرنا ہے اور یہ وقت طلوع آفتاب سے پہلے تک کا ہے۔

حصار کے اندر داخل ہوکر میں ہمیانی میں ہاتھ ڈال کر ایک چراغ اور کچی

سے سرسوں کا تیل نکالتا ہوں' پھر چقماق پتھروں کو رگڑ کر چراغ روشن کرتا ہوں۔ اس کی روشنی میں مسجد کا صحن' اندرونی حصہ اور دروازہ سبھی بخوبی دکھائی دے رہے ہیں۔ خنجر اپنے سامنے رکھ کر میں چغے میں تسبیح نکال کر ورد شروع کر دیتا ہوں۔ حسبِ ہدایت مجھے اپنی آنکھیں پورے عمل کے دوران کھلی رکھنی ہیں۔ اس عمل میں نیند کا آنا سخت مہلک ہے۔ چراغ کی روشنی میں میرا سایہ سامنے والی دیوار پر پڑ رہا ہے اور جب میں معمولی سی بھی حرکت کرتا ہوں' تو یہ سایہ بڑی طرح تھرتھراتا ہے' حالانکہ چراغ کی لَو بالکل سیدھی ہے اور مسجد کے اس حصے میں اونچی اونچی دیواروں کی وجہ سے ہوا کا دباؤ بھی زیادہ نہیں۔ میں اپنی توجہ اس طرف سے ہٹا کر اپنے عمل کی جانب مرکوز کرتا ہوں۔ جوں جوں میرے عمل میں تیزی آرہی ہے' توں توں میرے دائیں بائیں عجیب وغریب آوازیں پیدا ہو رہی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں ایک پُر ہجوم بازار میں ہوں اور لوگ طرح طرح کی باتیں ایک دوسرے سے کر رہے ہیں۔ میں بڑی مشکل سے اپنی سماعت پر قابو پاکر ان پُراسرار آوازوں کو ذہن سے جھٹک دیتا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد یہ آوازیں ختم ہو جاتی ہیں۔ اور اب ایسا لگ رہا ہے جیسے اَن دیکھے بعض اجسام میرے قریب ہی موجود ہیں۔ میں ان کے سانس لینے کی آوازیں بھی سن سکتا ہوں۔ پھر یکایک میری نگاہ دیوار پر تھرتھراتے ہوئے اپنے ہی سائے پر پڑتی ہے اور یہ دیکھ کر میرا کلیجہ کانپ اٹھتا ہے کہ سایہ دائیں دیوار سے ہٹ کر بائیں دیوار پر منتقل ہوگیا ہے۔ یہ ایسا خلافِ توقع شعبدہ ہے کہ چند لمحوں کے لئے میری زبان گنگ ہو جاتی ہے۔ دیکھتے دیکھتے میرا سایہ سمٹ کر انسانی شکل اختیار کرتا ہے اور دیوار سے اتر کر عین میرے سامنے' مگر حصار سے باہر بیٹھ جاتا ہے' یہ ایک دوسرا نادر زماں ہے جو مجھے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا ہے جب میں اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا' تو اس کی صورت بدل کر بھیانک ہو جاتی ہے' آنکھوں سے شعلے اٹھ رہے ہیں اور سر کا ایک ایک بال کھڑا ہے۔ مجھ پر ہیبت طاری ہو رہی ہے۔ آنکھیں بند کرنے کا حکم نہیں' مجھے لازماً یہ سب تماشا دیکھنا اور اپنے ہوش وحواس بھی

برقرار رکھنے ہیں' لیکن حلق خشک ہو رہا ہے اور عمل پڑھنے میں سخت اذیت ہو رہی ہے۔ چند لمحوں بعد یہ حالت ہوئی کہ الفاظ زبان سے نکلنے دشوار تھے۔ میں نے گردن دوسری جانب موڑی تو وہ چہرہ پھر سامنے تھا۔ کوئی دو ساعتوں تک یہی کیفیت رہی۔ آخر وہ منحوس صورت نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ اس کے بعد طلوعِ سحر تک میں نے اطمینان سے اپنا عمل پڑھا' پھر چراغ گل کرکے حصار سے باہر آگیا۔

شیخ صالح مجھے مسجد سے باہر ہی مل گئے۔ انہوں نے گلے سے لگالیا اور مبارکباد دی کہ پہلے امتحان میں سرخرو رہا۔ خدا نے چاہا تو آئندہ دو راتیں بھی کامیابی سے عمل پڑھوں گا۔ خود مجھے بھی اللہ کی ذات سے ایسی ہی امید ہے۔

۱۱ شعبان المعظم ۱۰۵۱ ہجری: دوسری شب میں شیخ کی جھونپڑی سے نکل کر مسجد کی طرف چلا۔ نصف راہ تک کسی نے مجھے حیران نہ کیا۔ خوش ہوں کہ بلائیں ٹل رہی ہیں اور عمل پورا ہونے کے بعد فیروزہ مجھے مل جائے گی اور میں اس شریر جن کا قصہ ہمیشہ کے لئے پاک کر دوں گا۔ جونہی میں مسجد کے نزدیک پہنچتا ہوں ایک بہت بڑی چمگادڑ مغرب کی جانب سے نہایت نیچی پرواز کرتی ہوئی آتی ہے اور مجھ پر ایک دم حملہ کر دیتی ہے میں دایاں ہاتھ اوپر اٹھاکر خنجر اسے دکھاتا ہوں اور وہ ہولناک آوازیں نکالتی ہوئی مشرق کی جانب چلی جاتی ہے۔

مسجد میں جاکر اسی جگہ حصار کھینچتا ہوں اور مقررہ ساعت پر وِرد شروع کر دیتا ہوں۔ کل کی نسبت آج میرے اوسان بھی بحال ہیں اور اعصاب بھی مضبوط۔ میں یقین کئے ہوئے ہوں کہ حصار کے اندر کوئی شے داخل ہو کر مجھے نقصان پہنچانے پر قادر نہیں' لہٰذا بے فکری سے عمل جاری رکھنا چاہئے۔ ابھی یہ تصورات میرے ذہن ہی میں ہیں کہ حجرے کے روشن دان سے کوئی پرندہ پھڑ پھڑاتا ہوا اندر آتا ہے۔ ایک لمحے کے لئے بالکل غیر اختیاری طور پر گردن گھما کر دیکھتا ہوں۔ یہ پرندہ نہیں' میری ہی مشکل و صورت کا ایک آدمی ہے۔ دیکھتے دیکھتے وہ دو ہو گئے' پھر تین .... پھر چار.... ان سب کی صورتیں ایک جیسی ہیں۔ وہ

میری طرف دھیان دیئے بغیر آپس میں کانا پھوسی کر رہے ہیں پھر زور زور سے گردنیں ہلا کر ہنسنا اور قہقہے لگانا شروع کر دیتے ہیں۔ ان کی بھیانک اور مکروہ آوازوں سے مسجد گونج رہی ہے۔ میرے عمل میں ایک دو لمحوں کے لئے خلل پڑتا ہے۔ اس کے بعد میں ان کی طرف سے دھیان ہٹا کر عمل کی جانب متوجہ ہو جاتا ہوں۔ جب دل پر گھبراہٹ طاری ہونے لگتی ہے' تو خنجر ہاتھ میں لے کر ان شکلوں کو ڈراتا ہوں۔ خنجر ہاتھ میں لیتے ہی وہ خوف زدہ ہو کر حصار سے پرے ہٹ جاتے ہیں اور پھر آپس میں سرگوشیاں شروع کر دیتے ہیں۔

یکایک بیرونی دروازے سے ایک قوی ہیکل حبشی اندر آتا ہے۔ اس نے اپنی پشت پر لوہے کا ایک بڑا کڑاہو اٹھا رکھا ہے اس کا وزن کسی طرح بھی دس پندرہ من سے کم نہ ہوگا۔ حبشی لال لال زبان اور سفید سفید دانت نکال کر میری طرف دیکھتا ہے اور دھڑام سے وہ آہنی کڑاہو مسجد کے صحن میں پٹخ دیتا ہے۔ پھر دوسرا حبشی اندر آتا ہے۔ اس کی پشت پر منوں لکڑیاں لدی ہیں۔ وہ لکڑیوں کا یہ بھاری گٹھا صحنِ مسجد میں پھینک کر باہر نکل جاتا ہے۔ میری شکل و صورت کے چاروں آدمی جلدی سے وہ لکڑیاں جمع کر کے آگ لگا دیتے ہیں۔ شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ اب جو دیکھتا ہوں' تو وہ آہنی کڑاہو آگ پر دھرا ہے' پھر ایک قوی ہیکل حبشی آیا اور اس نے ہاتھ سے نہ جانے کیا اشارہ کیا کہ کڑاہو میں تیل بھر گیا' آناً فاناً تیل کھولنا شروع ہوا اور آگ کی لپٹیں حصار تک پہنچنے لگیں۔ مسجد کے درو دیوار تپتے ہوئے دکھائی دیے۔ خود میں محسوس کر رہا تھا کہ نارِ جہنم میں کچھ ایسی ہی تپش ہوئی ہوگی۔ معاً وہ سب صورتیں غائب ہو گئیں اور ان کی جگہ صوبے دار جلال آباد نمودار ہوا۔ اس کا لباس ویسا ہی تھا جیسا میں نے اول مرتبہ دیکھا۔ وہ نہایت اطمینان سے اپنی جگہ کھڑا مجھے گھورتا رہا' پھر غضب ناک لہجے میں بولا۔

"اے نوجوان! اب بھی وقت ہے' یہ ڈھونگ چھوڑ دے اور اپنی جان سلامت لے کر یہاں سے نکل جا۔ شاید تو میری قوت سے آگاہ نہیں۔ ایسے ایسے

سینکڑوں عمل میں خود جانتا ہوں اور ان سب کا توڑ بھی میرے پاس ہے اگر کہے' تو تماشا دکھاؤں؟"

میں خاموش رہا۔ دل ہی دل میں اپنا وظیفہ برابر پڑھے جاتا تھا۔ گاہ گاہ خنجر پر بھی نگاہ ڈال لیتا۔ صوبے دار نے تالی بجائی اور مجھے یوں لگا جیسے کسی نے آہنی گرز میرے سر پر دے مارا ہو۔ پلک جھپکتے میں وہی حبشی غلام سید صالح کو گھسیٹتے ہوئے مسجد میں لے آیا۔ شیخ کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے' سفید ریش لہو سے رنگین تھی۔ بدن پر جابجا زخم تھے جن سے مسلسل خون رس رہا تھا۔ ان کی حالت سخت ابتر تھی۔ میں عمل بھول کر ان کی طرف حیرت و خوف سے تکنے لگا۔ شیخ صالح نے بے حد نحیف آواز میں کہا۔

"نادر زماں ..... میں تمہیں حکم دیتا ہوں' یہ عمل ترک کر دو اسی میں تمہاری بھلائی ہے میں اپنی ہار تسلیم کرتا ہوں۔ صوبیدار کا حکم ہے کہ اگر تم نے ایسا نہ کیا' تو نہ صرف وہ مجھے مار ڈالے گا۔ بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فیروزہ کو بھی تم سے چھین لے گا"۔

اگر خدا کی رحمت میرے شاملِ حال نہ ہوتی تو میں اس فریب میں ڈوب ہی گیا تھا۔ غیر شعوری طور پر میں نے خنجر اٹھایا۔ خنجر اٹھانا تھا کہ صوبیدار نے چلا کر حبشی کو حکم دیا شیخ صالح کو کھولتے تیل میں ڈال دو۔ یہ الفاظ ابھی اس کے منہ سے ادا ہوئے ہی تھے کہ میں نے شیخ کو تیل کے کڑاہو میں پایا۔ آناً فاناً اس کا بدن جل کر کوئلہ ہو گیا۔ صوبے دار نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ "اب اس بے وقوف مصور کا بھی یہی حشر کیا جائے گا۔" حبشی قدم بڑھاتا ہوا میری جانب آیا۔ ایسا لگا جیسے اس نے ایک پاؤں حصار میں رکھ دیا ہو۔ میں نے خنجر پوری قوت سے اس کے پاؤں پر مارا۔ ایک ہولناک آواز کے ساتھ سب کچھ غائب ہو گیا۔ نہ کڑاہو رہا' نہ آگ کے شعلے' نہ صوبیدار جلال آباد اور نہ وہ مکروہ صورت حبشی۔ میں بدستور اپنے حصار میں بیٹھا تھا اور چراغ روشن۔

۱۲ شعبان ۱۰۵۱ ہجری: آج اس عمل کی تیسری اور آخری رات ہے۔ گذشتہ

روز صبح جب میں مسجد سے باہر نکلا تو شیخ صالح کو اپنا منتظر پایا۔ انہوں نے فرمایا۔
"بس اب کامیابی سمجھو۔ جنات نے تمہیں ڈرانے دھمکانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی' مگر آفرین ہے تمہاری ہمت اور استقلال پر' تم نے ان کا ہر داؤ ناکام بنادیا۔ اب پوری توجہ اور حواس کی تمام بیداری کے ساتھ عمل پڑھنا۔ ممکن ہے جنات آج رات تمہیں ورغلانے اور عمل سے ہٹانے کے لئے کوئی نیا حربہ آزمائیں۔ وہ خواہ کچھ کریں' تم ہرگز ہرگز وقت مقررہ سے پہلے حصار نہ چھوڑنا۔
میں نے شیخ سے وعدہ کیا کہ انشاء اللہ تعالیٰ ایسا ہی ہوگا اور کوئی شیطانی قوت مجھ پر غالب نہ آسکے گی۔

شیخ نے ایک تعویذ بھی میرے گلے میں باندھا۔ یہ رات پچھلی دو راتوں سے کہیں زیادہ وحشت انگیز اور تاریک تھی۔ قدم قدم پریوں لگتا جیسے ہزاروں اَن دیکھے اجسام میرے تعاقب میں ہیں۔ میں ان کے قدموں کی آہٹیں اور آوازیں بھی سن رہا تھا' لیکن نظر کوئی نہ آتا تھا۔ جوں جوں مسجد کی جانب بڑھتا گیا' توں توں ان پُراسرار اور نہ دکھائی دینے والے اجسام کی قربت کا احساس زیادہ ہوتا چلا گیا۔ پھر میرے کانوں میں رونے اور بین کرنے کی ڈراؤنی آوازیں آنے لگیں۔ سینکڑوں عورتوں کے بین کرنے کی آوازیں' جیسے کسی کا ماتم ہو رہا ہو۔ یہ آوازیں نہیں' نادیدہ برچھیاں سی تھیں جو میرے دل میں کبھی جاتی تھیں۔ یہ شور میرے آگے پیچھے' دائیں بائیں اتنی شدت سے ہورہا تھا کہ کانوں کے پردے پھٹنے لگے اور آنکھوں کے آگے ستارے سے ناچتے نظر آئے۔ میں نے اونچی آواز میں کلام الٰہی کی تلاوت شروع کی اور رفتار تیز کردی۔ دیر تک چلنے کے باوجود بھی مسجد نگاہوں سے اوجھل رہی۔ رونے اور بین کرنے کی دماغ پاش آوازیں ابھی تک کانوں میں آرہی تھیں۔ میں نے گھپ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اردگرد دیکھا۔ یہ ایسا راستہ تھا جس پر میں کبھی نہ آیا تھا۔ اب پہلی مرتبہ دہشت سے رونگٹے کھڑے ہوئے۔ میں نے سوچا کیا شریر جنوں اور شیطانی روحوں نے مجھے راہ سے بھٹکا دیا ہے؟ ایک جگہ رک کر میں نے اپنے حواس درست کئے شیخ کا عطا کردہ تعویذ گردن میں ٹٹولا۔ اسے چھونے سے عجب طرح کی تسکین دل کو ہوئی اور خوف کی وہ حالت یکسر جاتی رہی۔ یکایک میں نے ایک روشن سائے کو بیاباں میں حرکت کرتے دیکھا۔ یہ انسانی قد وقامت کا سایہ تھا۔ غیر ارادی طور پر میں اس کے تعاقب میں چل پڑا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے خود کو مسجد کے دروازے پر پایا۔ میرے دیکھتے دیکھتے وہ سایہ مسجد کے اندر داخل ہوا اور ٹھیک اس حجرے کے پاس رکا' جس میں حصار باندھ کر میں اپنا عمل پڑھا کرتا تھا۔ مجھے اس سائے سے کوئی ڈر نہ لگا اور خود بخود یہ بات دل میں جم گئی کہ یہ سایہ میری حفاظت اور نگہبانی کے لئے ہے۔ ابھی میں چراغ روشن کرکے خنجر کی نوک سے حصار باندھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ لرزہ خیز چیخ مسجد کے صحن میں گونجی اور میں نے دیکھا کہ صوبے دار جلال آباد اوندھے منہ وہاں پڑا ہے۔ اس کا جسم آہنی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا اور شعلوں کا ایک دائرہ اس کے گرد رقص کر رہا تھا۔ صوبے دار کے حلق سے بھیانک چیخیں نکل رہی تھیں جیسے وہ سخت اذیت میں ہو۔ یہ منظر دیکھ کر میں پتھر ہوگیا اور حصار باندھنا یاد نہ رہا۔ عین اسی وقت کسی نے میرے کان میں کہا۔
"نادر زماں کیا غضب کرتے ہو۔ جلد حصار مکمل کرکے اس میں پناہ لو' ورنہ دشمن وار کیا ہی چاہتا ہے۔" خدا کی پناہ! یہ آواز آقائے تبریزی کی تھی۔ جی ہاں ..... میں یہ آواز کبھی نہیں بھول سکتا.... آقائے تبریزی تو مرچکا تھا.... پھر یہ آواز .... میں نے جلدی سے حصار باندھا اور اس میں محصور ہوگیا۔ حصار کے اندر جانے کی دیر تھی کہ صوبے دار جلال آباد کی چیخیں اور بلند ہو گئیں۔ در و دیوار لرزنے لگے اور حجرے کی بوسیدہ چھت یوں گڑگڑائی جیسے ابھی میرے سر پر آن گرے گی۔ شعلوں کا دائرہ غائب ہوگیا اور وہ زنجیریں بھی ٹوٹ گئیں جن میں یہ شریر جن جکڑا ہوا تھا۔

میں نے اپنا ورد شروع کیا اور صوبیدار نے رونا چلانا۔ وہ بری طرح چیخ رہا تھا کہ یہ عمل بند کردو' ورنہ میں جل جاؤں گا۔ جس طرح تم کہو گے ویسا ہی کروں گا۔ اگر فیروزہ کو چاہتے ہو' تو ابھی اسے آزاد کئے دیتا ہوں۔ اسے اپنے ساتھ لے

جاؤ اور سلیمانؑ اعظم کی قسم کھا کر عہد کرتا ہوں کہ دوبارہ اسے یا تمہیں اور تمہاری آئندہ ذریّت کو تنگ نہ کروں گا۔ وہ عاجزی اور انکساری سے توبہ کر رہا تھا کہ مجھے اس پر رحم آنے لگا۔ دل کے کسی دور افتادہ گوشے سے صدا آئی کہ نادر زماں، تمہیں فیروزہ سے مطلب ہے اگر یہ شریر جن عہد کرتا ہے کہ آئندہ ایسی حرکت نہ کرے گا تو تمہیں عفو سے کام لینا چاہیے۔ ایک لمحے کے لیے میں نے عمل ترک کرکے صوبیدار کی جانب نگاہ اٹھائی۔ اس کا سارا بدن لہولہان تھا جیسے کوئی نادیدہ قوت اسے مسلسل زخمی کر رہی ہو۔ ہر بار وہ مرغِ بسمل کی طرح فرش پر تڑپتا، لوٹتا اور بھیانک آواز میں روتا۔

دفعتہ" وہ روشن انسانی سایہ دیوار سے اتر کر حصار کے نزدیک آیا اور پھر میں نے وہاں آقائے تبریزی کو کھڑے پایا۔ تبریزی جو کئی ماہ پہلے مرچکا تھا۔ فنا ہوچکا تھا..... اب پھر میرے سامنے موجود تھا یا شاید اس کی روح تھی۔ میں نے دیکھا صوبیدار جلال آباد کا رونا چلانا یکدم رک گیا اور اب اس پر ویسی ہی ہیبت طاری ہونے لگی جیسی پہلی مرتبہ صوبیدار کو اپنی حویلی میں دیکھ کر آقائے تبریزی پر طاری ہوئی تھی۔

"تحویل جن، شاید تمہارا آخری وقت آن پہنچا۔" تبریزی کے وجود یا روشن ہیولے میں سے آواز نکلی۔ "تم نے صدیوں تک انسانوں کو اذیتیں دی ہیں اور تم اپنی سیہ کاری میں اس حد تک آگے بڑھے کہ دھوکے اور فریب سے ہماری بہو بیٹیوں کو بھی انسانوں کے بھیس میں آن کرلے جانے لگے۔ تم بھول گئے کہ بدی بدی ہے اور نیکی نیکی، بدی کبھی نیکی پر غالب نہیں آسکتی۔ تم نے اس خدائے قہارو جبار کو بھی فراموش کر دیا جو ایک ایک ذرے کا علم رکھتا ہے اور جس کے قبضۂ قدرت میں انسانوں اور جنوں کی جانیں ہیں۔ تم نے جو کچھ پایا، وہ انہی خاکی انسانوں سے پایا، تم نے سارے عمل انہی سے سیکھے جن کی عزتوں پر وار کیا۔ تمہیں اپنے علم پر بڑا غرور ہے ایسا ہی غرور جیسا تمہارے استادِ ازل، ابلیس لعین کو تھا۔ کیا تم نہیں جانتے کہ وہ راندۂ درگاہ اسی تکبر کے باعث ہوا۔ تمہاری موت

اب قریب ہے۔ بہتر یہی ہے کہ انسانی لبادہ اتارو اور اپنے اصل روپ میں سامنے آؤ۔"

اب مجھے معلوم ہوا کہ اس شریر جن کا نام تحویل ہے۔ آقائے تبریزی کے روشن سائے نے آہستہ آہستہ جن کی طرف قدم بڑھائے اور وہ خوف کے مارے سکڑنے لگا۔ سکڑتے سکڑتے ایک ننھے چوہے میں بدل گیا۔ اسے راہِ فرار نہیں مل رہی تھی۔ مسجد کے کونوں کھدروں میں پناہ لینے کے لئے اِدھر سے اُدھر بھاگا پھرنے لگا ..... تبریزی کا سایہ اس کے تعاقب میں تھا۔ آنِ واحد میں دونوں نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ میں نے اطمینان سے باقی عمل پورا کیا۔ اُدھر صبح صادق کی روشنی مشرقی افق پر پھیلی اِدھر میں حصار سے باہر آیا میرا عمل کامیاب ہوچکا تھا۔

نادر زماں کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ منزل مقصود قریب تھی اور وہ فیروزہ کو پانے کے لیے بے تاب تھا۔ شیخ صالح اسے اپنی جھونپڑی میں لے گئے۔ نادر زماں نے تبریزی کی روح کے آنے اور تحویل سے مکالمہ کرنے کا سارا قصہ کہہ سنایا۔ شیخ غور سے سنتے رہے۔ ان کے جھریوں بھرے بوڑھے چہرے پر حیرت اور تجسّس کے آثار تھے۔ انہوں نے نوجوان کو تلقین کی کہ اگر دوبارہ تبریزی کا ہیولا نظر آئے تو وہ اس سے فیروزہ کا احوال ضرور معلوم کرے۔ اس طرح کام زیادہ آسان ہو جائے گا۔ تحویل جن اس اثنا میں فیروزہ کو جلال آباد کے نواح سے کہیں اور لے جانے کی کوشش کرے گا، مگر ہم اسے ایسا موقع ہی نہ دیں گے۔ شیخ نے اپنے پُراسرار علوم میں سے ایک کو آزمانے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے گوشت کے ایک لوتھڑے پر کچھ پڑھ کر دم کیا، پھر نادر زماں سے کہا۔ "یہ لوتھڑا اپنے تھیلے میں رکھو اور مغرب کی طرف ناک کی سیدھ میں روانہ ہو جاؤ۔ تین کوس کے فاصلے پر بے شمار پہاڑی چٹانیں اور غار پائے جاتے ہیں۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ جنات کا مسکن ہیں۔ رات تو کیا، وہاں دن کو بھی کوئی نہیں جاتا۔ سورج جب نصف النہار پر ہو، تو اس میدان کے عین درمیان کھڑے ہوکر آٹھ مرتبہ

اصحابِ کہفؓ کے کتے قطمیر کو آواز دینا۔ جونہی آٹھویں بار تم یہ نام پکارو گے ہر طرف سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آئیں گی۔ خبردار' ان آوازوں سے خوف مت کھانا۔ تھوڑی دیر بعد ایک گرانڈیل سفید کتا نمودار ہوگا۔ فوراً" گوشت کا یہ لوتھڑا اس کے آگے ڈال دینا۔ جب وہ اسے کھا چکے گا' تو خود بخود ایک طرف کو روانہ ہو جائے گا۔ تم بے خوف و خطر اس کے پیچھے چلے جانا۔ اس کے بعد خدا کی قدرت کا تماشا ملاحظہ کرنا"۔

نادر زماں نے ان ہدایات پر عمل کیا۔ ٹھیک اس وقت جب سورج سر پر تھا اور نادر زماں کا سایہ اس کے قدموں میں آگیا تھا' وہ چٹانوں سے گھرے ہوئے اس میدان میں داخل ہوا۔ یہاں پر ہول سناٹا طاری تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ہزاروں برس سے اس علاقے میں کسی انسان نے قدم نہیں رکھا۔ سیاہ رنگ کی مخروطی چٹانیں گردنیں اٹھائے سینہ تانے نہ معلوم کب سے کھڑی تھیں۔ ان چٹانوں کے اندر کثرت سے غار دکھائی دیے۔ نادر زماں نے وقت ضائع کیے بغیر آٹھ مرتبہ اصحابِ کہفؓ کے کتے قطمیر کو آواز دی۔ اس کی آواز چٹانوں میں گونجتی ہوئی پرے ہٹتی گئی۔ پھر چند لمحے بعد ایسی ہی آوازیں مسلسل سنائی دینے لگیں۔ یہ قطمیر کو پکار رہی تھیں۔ یہ نادر زماں ہی کی صدائے بازگشت تھی۔ آپ ہی آپ' اپنی آواز سن کر نادر زماں پر دہشت طاری ہونے لگی۔ اسے شش جہت سے قطمیر قطمیر کی پکار سنائی دینے لگی۔ آواز رکی تو ہر طرف سے کتوں کے بھونکنے کا شورِ عظیم بلند ہُوا۔ یہ ایسی بھیانک آواز تھی کہ نادر زماں کا خون رگوں میں جمنے لگا۔ ایسا محسوس ہُوا جیسے ہزاروں' لاکھوں کتے چٹانوں کی عقب سے بھونکتے اور لپکتے ہوئے چلے آ رہے ہیں' اس پر حملہ کرنے کے لیے۔ اسے کچا چبا جانے کے لیے لیکن آہستہ آہستہ یہ مہیب شور تھمتا گیا اور ایک بار پھر اس بیابان میں ہولناک سناٹا چھاگیا۔ یکایک ایک غار میں سے سفید رنگ کا بڑا سا کتا بر آمد ہُوا اور دوڑتا ہوا نادر زماں کی طرف آیا۔ اس کی کھال دھوپ میں خوب چمک رہی تھی۔ ایسا خوبصورت اور قوی ہیکل کتا نادر زماں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ سر سے لے

کر دم تک انڈے کی مانند سفید اس کا قد ایک عام گدھے کے برابر ہو گا۔ جونہی وہ نزدیک آیا ، نادر زماں نے تھیلے میں سے گوشت کا لوتھڑا نکال کر اس کے آگے پھینک دیا۔

کتے نے دم ہلائی۔ تھوڑی دیر محبت کی نگاہ سے نادر زماں کو دیکھا۔ پھر اطمینان سے گوشت کھانے میں مصروف ہوگیا۔ گوشت کھانے کے بعد دو تین مرتبہ ڈکار لی' پھر ہلکی چال چلتا ہوا ایک جانب روانہ ہوا۔ نادر زماں اس کے پیچھے کچھ بھاگنے' کچھ چلنے اور کچھ لمبے لمبے ڈگ بھرنے کی سی کیفیت کے ساتھ چلا۔ کتا وقفے وقفے سے مڑکر نادر زماں کو دیکھتا اور یہ جان کر کہ وہ تعاقب میں ہے' پھر آگے چلنے لگتا۔ بہت جلد وہ اسے چٹانوں کے اندرونی حصے میں لے گیا یہاں تاریک غار کثرت سے تھے۔ زمین اتنی بھربھری اور خشک تھی کہ جونہی کوئی پتھر نادر زماں کے قدموں تلے آتا' پس کر ریزہ ریزہ ہو جاتا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کرۂ ارضی سے نکل کر کسی اور سیارے میں پہنچ گیا ہے جہاں کی دنیا ہی نرالی ہے۔

دفعتہ" کتا ٹھہر گیا۔ اب وہ ایک غار کے دہانے پر کھڑا تھا۔ جس کی اونچائی نادر زماں کے اندازے کے مطابق دلی کے قطب مینار سے کسی طرح کم نہ تھی اور اس عمودی چٹان پر چڑھنا کسی انسان کے بس میں نہ تھا۔ نادر زماں سوچنے لگا اگر اس پر چڑھنا ہے' تو یہ بظاہر ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ ویسے بھی ایک ایسے شخص کے لیے جس کی زندگی کا بڑا حصہ رنگوں اور برشوں میں کٹا ہو' چٹانوں اور پہاڑوں کی چڑھائی ایک دشوار گزار عمل ہے۔ ابھی وہ اسی سوچ میں گم تھا کہ سفید کتے نے اپنے اگلے پنجوں سے نرم نرم زمین کھودنی اور مٹی اڑانی شروع کی۔ نادر زماں حیرت سے یہ کارروائی دیکھتا رہا۔ کتا بڑی تیزی سے زمین کھود رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے وہاں ایک دروازہ سا ظاہر ہوا اور کتا اس کے اندر داخل ہوکر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ نادر زماں کے سامنے تجسس اور اسرار کی ایک نئی دنیا آگئی تھی۔ دوسرے ہی لمحے وہ بھی اس دروازے میں قدم رکھ کر اپنے آپ کو اندھیرے کے سپرد کر چکا

تھا۔ غار میں داخل ہونے کے بعد اس کے احساسات و تاثرات کیا تھے' بہتر ہے کہ میں اسی کے روز نامچے سے مدد لوں۔

"جب میں سفید کتے کے پیچھے پیچھے خدا کو یاد کرتا ہوا اس دروازے میں داخل ہوا تو زندہ واپس آنے کی ساری توقعات ختم ہوچکی تھیں۔ میں جنات کی بستی میں جا رہا تھا اور یہ بالکل ممکن تھا کہ وہاں تک شیخ صالح کی رسائی نہ ہوتی۔ اب تک میں اسی کے اعمال کی برکت سے ان شریر جنوں اور شیطانی روحوں سے محفوظ رہا تھا۔ شاید میں بھی ہمیشہ کے لیے فیروزہ کی طرح اس خوفناک جن کا قیدی بن جاتا جو صدیوں سے اپنے اِن مکروہ عزائم کی تکمیل کرتا چلا آیا تھا ، جنہیں روکنے والا کوئی نہ تھا۔ غار میں داخل ہوتے ہی میری بینائی نے جواب دے دیا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے باوجود مجھے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ صرف اتنا محسوس ہوتا تھا کہ میرے قدموں تلے نرم ریتلی زمین ہے۔ جہاں تک میرے ہاتھ پہنچ سکتے تھے' میں نے آس پاس کا حال جاننے کی کوشش بھی کی' مگر ناکام رہا۔ میرے ہاتھوں نے کسی شے کا لمس محسوس نہ کیا۔ سفید کتا نہ جانے کہاں غائب ہوگیا تھا۔ غالباً" اس کا فرض اتنا ہی تھا کہ مجھے اس تاریک قبر میں پہنچادے جس کی وسعتوں کا کوئی اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ تب مجھے یاد آیا کہ میں اسم ذات کا عامل ہوں اور جو ایسے عظیم اسم کا عامل ہو اس کے لیے کیا دشواری ہے۔ میں نے فوراً" دل ہی دل میں اس اسم اعظم کا ورد شروع کیا۔ جوں جوں اسے پڑھتا جاتا' توں توں اپنے اِردگرد ایک ہالہ سا بنتا ہوا نظر آنے لگا۔ حتیٰ کہ اس اسم پاک کے نور سے اتنا اجالا ہوگیا کہ میں نہ صرف اپنے وجود کا تعین کرنے کے قابل ہوگیا' بلکہ اس تاریک غار میں بکھری اور پھیلی ہوئی انوکھی دنیا کا نظارہ بھی کرنے لگا۔۔۔

"کیا بیان کروں میں نے کیا دیکھا؟ ہر طرف سونے اور چاندی کے انبار لگے تھے۔ اشرفیاں اور زر و جواہر۔ میں نے اس عظیم ڈھیر میں سے چند اشرفیاں اور سکے اٹھائے اور اس ہالے کی روشنی میں انہیں غور سے دیکھا۔ یہ مختلف زمانوں اور پرانے ادوار کے سکے تھے۔ بڑے' چھوٹے' بھاری' ہلکے غرض ہر حجم کے سکے

اور ٹھوس سونے کی اشرفیاں۔ ان میں اکثر سکے سلطان محمود غزنوی کے دورِ حکومت کے تھے' بیشتر سلاطینِ دکن کے عہد کے قطب شاہیوں اور بہمنیوں کی مہریں صاف پڑی جاتی تھیں۔ ان کے علاوہ خلجیوں' لودھیوں اور راجپوت بادشاہوں کے استعمال میں آنے والے سونے چاندی کے برتن جن کی تعداد کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ یہ سب ڈھیر میری نظروں کے سامنے تھا۔ جوں جوں میں آگے بڑھتا گیا' اسرار کی نئی سے نئی دنیائیں سامنے آتی گئیں۔ ایک گوشے میں انسانی اور حیوانی ہڈیوں کا عظیم انبار لگا تھا' قریب ہی کوئلے اور جانوروں کی سڑی سوکھی لید کے ڈھیر دکھائی دے رہے تھے۔ مجھے یاد آیا کہ ہڈیاں کوئلے اور جانوروں کی لید' جنات کی مرغوب غذائیں ہیں۔ - - -

"میں دولت کا یہ بے انداز خزانہ دیکھنے میں محو تھا۔ جس کی مثال میں کسی بڑے سے بڑے بادشاہ کا خزانہ بھی ہیچ تھا۔ ہر شے پر گردو غبار کا ایک انبار تھا اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ خزانہ صدیوں سے اسی جگہ پڑا ہے۔ اس میں بیش قیمت ہیرے جواہر بھی تھے۔ پھر مجھے ہاتھی دانت کا وہ ڈبا یاد آیا جو صوبیدار جلال آباد آقائے تبریزی کو دے گیا تھا۔ اس میں بھی ایسے ہی نادر و نایاب جواہر تھے۔ جی میں آیا کہ جتنے اٹھا سکوں اٹھا کر اپنے تھیلے میں ڈال لوں' مگر اسی لمحے فیروزہ کا خیال آ گیا اور میں اس ڈھیر پر نفرت کی نگاہ ڈال کر آگے بڑھ گیا۔ اب دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی اور میں آس پاس نادیدہ اجسام کی نقل و حرکت محسوس کر رہا تھا۔ ایک مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ کسی نے مجھے پشت کی طرف سے دھکا دیا' اگر میں سنبھل نہ جاتا' تو اوندھے منہ زمین پر گرتا اور لازماً" ایک آدھ دانت ٹوٹ جاتا۔ میں نے اونچی آواز سے اسم ذات کا ورد شروع کر دیا اور اسی وقت یہ پراسرار نقل و حرکت رک گئی۔ کچھ فاصلے پر ایک پرانی عمارت کے آثار دکھائی دیئے اور میں اسے دیکھ کر نقش حیرت بن گیا۔ یہ وہی عمارت تھی جس میں ایک مرتبہ فیروزہ مجھے لے گئی تھی اور جہاں میں نے ایک چھپر کھٹ پر صوبیدار جلال آباد کو محو خواب پایا تھا۔ وہی چبوترا تھا' وہی وسیع و عریض دالان اور اس سے

پرے ہشت پہلو مقبرہ جس کی کالی کالی اینٹیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ مقبرے کے اوپر سیاہ رنگ کا نارنگی گنبد۔ یقیناً" یہ کسی بادشاہ کا مقبرہ تھا۔ میں بے تحاشا اس طرف دوڑنے لگا۔ آہ......! مقبرے کے اندرونی صحن میں ایک طرف وہی منحوس چھپر کھٹ بچھا تھا جس کے چاروں طرف پردے لٹکے ہوئے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر ایک پردہ نوچ ڈالا...... پھر جیسے حواس نے ساتھ چھوڑ دیا...... چھپر کھٹ پر خون ہی خون تھا...... تازہ...... گہرا سرخ خون...... وہاں دو لاشیں پڑی تھیں ......ایک لاش صوبیدار جلال آباد کی اور دوسری فیروزہ کی تھی۔ ان کے سر تن سے جدا تھے۔ بازو اور ٹانگیں الگ الگ ...... وہ مقبرہ تیزی سے گھومتا ہوا محسوس ہوا...... پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا"۔

نادر زماں کی آنکھ کھلی' تو اس نے اپنے آپ کو شیخ صالح کی جھونپڑی میں پڑے پایا۔ وہ دیر تک شیخ کا چہرہ تکتا رہا۔ پھر بے اختیار رونے لگا۔ شیخ نے اسے صبر کی تلقین کی اور بتایا کہ اس شریر جن نے جس کا نام تحویل تھا' اپنے ساتھ فیروزہ کو بھی مار ڈالا۔ وہ اپنی شکست برداشت نہیں کر پایا۔ نادر زماں کی نظروں میں اب دنیا اندھیر تھی۔ کچھ عرصے تک وہ شیخ صالح کی صحبت میں رہا اور اس سے کسبِ علم حاصل کرتا رہا۔ جب شیخ کا وصال ہو گیا' تو وہ آگرے واپس آیا۔ آقائے تبریزی کی حویلی ویران پڑی تھی۔ بابا افضل بیگ زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہا تھا۔ نادر زماں کے آتے ہی اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ لوگوں کو نادر زماں کی آمد کا پتا چلا تو جوق در جوق آئے' لیکن اس پر دیوانگی طاری تھی۔ اس نے کسی سے بات نہ کی بلکہ بہت سوں کو پہچاننے سے بھی انکار کر دیا۔ دن بھر اپنے تصویر خانے میں بند رہتا۔ انہی دنوں اس نے زندگی کی آخری تصویر بنائی۔ ایک شام میرے جدِ امجد ترکتاز خاں شہنشاہ کے حکم سے آقائے تبریزی کی حویلی میں گئے تو انہوں نے دیکھا کہ نادر زماں بڑی محویت سے تصویر کشی میں مصروف ہے۔ تصویر مکمل کر کے اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر پہلی بار ترکتاز خاں کو اپنی زندگی کی المناک اور نہایت حیرت انگیز کہانی سنائی۔ ترکتاز خاں نے خیال کیا

کہ مصور کا دماغ جواب دے گیا ہے' لیکن جب نادر زماں نے انہیں اپنا لکھا ہوا روزنامچہ دکھایا اور انہوں نے اسے شروع سے آخر تک پڑھا' تو انہیں یقین آگیا۔ انہوں نے نادر زماں سے بہت اصرار کیا کہ شہنشاہ کے حضور میں چلے اور یہ داستان خود اپنی زبانی عرض کرے' مگر وہ بے نیازی سے مسکرایا اور بولا۔

"نہیں..... اب میں کہیں اور جانے کی تیاریاں کر رہا ہوں۔ یہ تصویر اور یہ کاغذات میں تمہارے سپرد کرتا ہوں۔ حویلی آقائے تبریزی مرتے وقت میرے سپرد کر گیا تھا۔ اس کا تمام مال اسباب بھی تمہیں دیتا ہوں اور دیکھنا اس میں ہاتھی دانت کا ایک چھوٹا سا ڈبا بھی ہے جس میں دنیا کا بیش قیمت خزانہ بند ہے۔ اسے فروخت کرکے تمام دولت غریبوں میں تقسیم کر دینا"۔

اس واقعے کے تین دن بعد خبر مشہور ہوئی کہ نادر زماں وفات پاگیا۔ اس رات جو لوگ اس کے قریب تھے اور جنہوں نے اسے نزع کے عالم سے گزرتے دیکھا' ان کا بیان ہے کہ وہ کسی عورت سے باتیں کر رہا تھا اور بار بار اس سے کہتا کہ گھبراؤ نہیں' مَیں آرہا ہوں ..... مَیں آرہا ہوں ..... اور یہی کہتے کہتے اس نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں موندلیں۔ نادر زماں کا جنازہ جب قبرستان میں لے جایا گیا اور اسے قبر کے سپرد کرکے لوگ جب واپس پلٹے' تو انہوں نے ایک حسین و جمیل نوجوان عورت کو دیکھا۔ وہ قبر کے پاس کچھ دیر تک کھڑی رہی' پھر آہستہ آہستہ ہوا میں تحلیل ہوگئی۔

اِنسانی بھیڑیا

وہ لرزہ خیز خون منجمد کر دینے والی' ہولناک چیخ جنگل کے وسط سے اٹھی تھی۔

ڈان جیفرسن کے ہاتھ سے بندوق چھٹ کر لمبی لمبی گھاس میں گر پڑی۔ ایک لمحے کے لیے اسے یوں لگا جیسے چیخ کسی درندے کی آواز ہو' مگر ایسی آواز پہلے کبھی نہ سنی تھی۔ آواز..... جو اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ بن کر اتر گئی اور اس کے اعصاب شل کر گئی۔ پتھر کے بے جان بت کی مانند وہ نہ جانے کتنی دیر وہاں کھڑا رہا۔

ڈان جیفرسن نے یکایک جھُرجھُری سی لی۔ اسے حساس ہُوا وہ آواز شاید خوفناک بھیڑے کی ہے' مگر نہیں' بھیڑے اس طرح نہیں چلّایا کرتے۔ ہاں .... ممکن ہے کوئی آدمی کوشش کرکے بھیڑیے کی آواز حلق سے نکالے تو شاید وہ آواز ایسی ہوگی جیسے ابھی چند لمحے پیشتر اُبھری تھی۔ خدا رحم کرے۔ اس تصور کے ساتھ ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے..... وہ ڈرنے والا آدمی ہرگزنہ تھا دنیا کی کوئی طاقت' کوئی بھیانک سے بھیانک چیز اسے خوفزدہ نہ کرسکتی تھی۔ اس کے اعصاب فولادی تھے۔ اس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا' اپنے آپ کو جنگل میں پایا۔ سینکڑوں خطرے' ہزاروں حادثے' اَن گنت بلائیں اس نے دیکھی تھیں اور وہ کبھی خوف زدہ نہ ہُوا' لیکن آج اسی جانے پہچانے جنگل میں ایک پُراسرار آواز

سن کر اس پر لرزہ طاری ہوگیا تھا۔ آخر اس کی تمام حسیات یک لخت جاگ اٹھیں۔ اب وہ ہر قیمت پر جاننا چاہتا تھا کہ جنگل کے وسط میں سے اٹھنے والی نئی اور ہولناک آواز کس کی تھی۔

آسمان پر چودھویں کا چاند روشن تھا۔ اس کی تیز دودھیا چمکیلی روشنی میں ڈان جیفرسن دور تک دیکھ سکتا تھا۔ یوں بھی اسے جنگل کے چپے چپے کا اچھی طرح علم تھا۔ کون سا درخت کہاں اور کون سی جھاڑی کدھر ہے۔ جنگل کس طرف زیادہ گھنا اور کدھر آسانی سے راستہ نکالا جاسکتا ہے۔ جس حصے میں وہ آدھی رات کے وقت تن تنہا موجود تھا' وہاں درخت کچھ زیادہ ہی ایک دوسرے سے قریب تھے۔ اتنے قریب قریب کہ شاخیں ایک دوسرے میں الجھی ہوئی اور جب تیز ہوا کا جھونکا آتا' تو سب درختوں کے پتے مل کر زور زور سے تالیاں بجاتے جیسے وہ ڈان جیفرسن کا مزاق اُڑا رہے ہوں۔

کوئی آدھ فرلانگ دور اس سے زیادہ گھنا' اونچے اونچے درختوں کا جھنڈ تھا۔ اس جھنڈ کے اوپر جیفرسن نے دیکھا بہت سی چمگادڑیں فضا میں خاموشی سے چکر کاٹ رہی ہیں۔ ایک ہی دائرے میں' بڑی بڑی چمگادڑیں ایک دو بار اس کی طرف بھی آئیں لیکن ڈر کر آگے نکل گئیں۔ اس نے چمگادڑوں کی آنکھیں بھی چاندنی میں چمکتی ہوئی دیکھیں۔ عجیب رنگ تھا ان آنکھوں کا! کبھی سرخ' کبھی زرد جیسے ہیرے چمک رہے ہوں یا سرخ ننھی ننھی قندیلیں روشن ہوں۔ جیفرسن کو آج یہ سب کچھ نہایت عجیب لگ رہا تھا۔ ایسا کیوں تھا' یہ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ گرد و پیش ہیبت ناک سناٹا۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے جنگل میں کوئی شے ہے ہی نہیں۔ یکایک اس نے محسوس کیا' ہوا بھی تھم گئی ہے۔ درختوں کے وہ پتے جو چند لمحے پیشتر تیز ہوا کے جھونکوں میں تالیاں بجا رہے تھے' یک لخت گم صم ہوگئے۔

اس نے اپنی بارہ بور کی بندوق جھک کر گھاس میں سے اٹھائی۔ ابھی سیدھا بھی نہ ہُوا تھا کہ ایک بار پھر جنگل کی فضا اسی بھیانک چیخ سے لرز اُٹھی۔ اس بار دہشت سے جمنے لگا۔ جھکی ہوئی کمر اور بندوق کی طرف بڑھا ہوا دایاں ہاتھ جیسے

پتھر کا ہوگیا تھا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے پھوٹنے لگے۔ اس مرتبہ آواز زیادہ گونج دار' واضح اور صاف تھی۔ جیسے..... جیسے بہت سے بھیڑیے بیک وقت چلّائے ہوں۔ جیفرسن نے یہ بھی محسوس کیا کہ آواز کچھ اور قریب آگئی ہے یا ممکن ہے یہ اس کا وہم ہی ہو۔ اس نے پوری قوتِ ارادی سے کام لے کر بندوق مضبوطی سے تھام لی اور تن کر کھڑا ہوگیا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے درختوں کا وہی جھنڈ تھا جس کا ایک ایک درخت برسوں سے اسی کا جانا پہچانا تھا۔ وہ اَن گنت بار شکار کے لئے آیا تھا اور اس کو آج تک کوئی حادثہ پیش نہ آیا تھا۔ وہ نہایت قوی ہیکل اور بہادر تھا۔ کم از کم اردگرد کی بستیوں کے لوگ اس کے بارے میں یہی سوچتے تھے کہ اس سے زیادہ طاقت ور اور نڈر شخص کوئی اور نہیں۔ خطروں سے کھیلنا اس کی عادت تھی' مگر اب یہ دو بھیانک آوازیں سن کر اس کی جو حالت ہوئی اس پر اسے خود شرم آنے لگی۔ پھر اس نے اپنی بارہ بور کی انتہائی مضبوط' وفادار دونالی بندوق پر نظریں جما دیں جس کا سیفٹی کیچ کھلا ہُوا تھا۔ صرف لبلبی دبانے کی دیر تھی اور دو گولیاں.....

ڈان جیفرسن بے دھڑک درختوں کے اس جھنڈ کی طرف بڑھا۔ اس کا خیال تھا کوئی نہ کوئی..... آدمی..... یا..... درندہ..... انہی درختوں میں چھپا ہُوا ہے اور پھر اس نے اسے دیکھ لیا۔

صنوبر کے بہت پرانے درخت کے قریب' جس کے اردگرد لمبی گھاس اُگی تھی' سفید سفید سی کوئی چیز حرکت کر رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے اس کو اپنی آنکھوں پر دھوکا ہُوا' مگر نہیں..... ضرور وہاں کوئی موجود تھا اور تب اسے یاد آیا اس حصے کے بارے میں عوام میں طرح طرح کی مضحکہ خیز کہانیاں مشہور ہیں' اور سب کا مرکزی خیال یہی کہ صنوبر کا یہ درخت آسیب زدہ ہے۔ اُدھر سے کوئی گزرتا ہی نہ تھا۔ چاند کی تیز روشنی میں جیفرسن نے صنوبر کے اس بوڑھے درخت کو دیکھا۔ اس کا تنا خاصا بڑا اور اس میں سے دائیں بائیں نکلی ہوئی دو شاخیں تھیں' جیسے بازو کسی چیز کو پکڑنے کے لیے پھیلے ہوئے ہوں۔ ان شاخوں

کے اوپر تنے نے دیو کے سر کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اُس نے پہلے کبھی اِس نظر سے درخت کو نہ جانچا تھا۔ اب احساس ہُوا کہ گذشتہ پچاس برس کی گردشِ لیل ونہار نے صنوبر کے بوڑھے درخت کو آہستہ آہستہ ایک عجیب سی انسانی ہیئت میں لانے کی کوشش کی ہے۔

ممکن ہے وہ اس درخت کے جائزے ہی میں محو رہتا کہ دفعتاً گھاس میں دو چمکتی ہوئی آنکھیں اُبھریں۔ عین اسی لمحے بادل کے ایک آوارہ ٹکڑے نے چاند کا روشن چہرہ ڈھانپ دیا۔ جیفرسن اپنی جگہ بے حِس و حرکت کھڑا تھا۔ وہ چمکدار آنکھیں، جن کا رنگ گہرا زرد تھا، برابر اسے گھور رہی تھیں۔ پھر جیفرسن نے اسے اچھی طرح دیکھ لیا شاید یہ کوئی زبردست بھیڑیا تھا یا مکار چیتا یا جنگلی بلا۔ وہ فیصلہ نہ کر سکا ان میں سے کونسا درندہ ہے۔ گھاس میں دبکا ہُوا اور جیفرسن کو صرف اس کا سر، پیشانی اور پیشانی کے نیچے دو زرد زرد بڑی بڑی آنکھیں نظر آئیں۔ بادل کا ٹکڑا چاند کے چہرے سے ہٹ گیا اور اب جیفرسن نے خوب غور سے درخت کی طرف دیکھا۔ تھوڑی دیر پہلے جو دہشت اس پر طاری تھی، وہ دور ہو چکی تھی۔ وہ چند قدم اور آگے بڑھا۔ اس درندے کا بقیہ جسم بھی بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ اُدھر درندے نے بھی اپنی جگہ سے معمولی سی جنبش کی اور سرک کر جیفرسن کے نزدیک آنے کی کوشش کی۔ اس کے جسم پر لمبے لمبے بھورے بال تھے۔ اس نے سوچا ممکن ہے یہ ریچھ کی کوئی ایسی نسل ہو جو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی، مگر اس کا جسم، اس کے ہاتھ پیر ریچھ یا بھڑیے کے بجائے کسی آدمی سے ملتے جلتے تھے۔ یکایک اس بلا نے اپنا منہ اوپر اٹھایا اور جیفرسن کے حلق سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ خدا کی پناہ! اس کا چہرہ انسانی چہرے سے کس قدر مشابہت رکھتا تھا۔ ویسی ہی پیشانی، ویسی ہی ناک، ویسے ہی رخسار۔ فرق صرف اتنا کہ منہ کی جگہ لمبی سی تھوتھنی تھی جیسے بھیڑیوں کی ہوتی ہے۔ اس کی آنکھیں تو بالکل انسانوں کی سی، سوائے اس کے کہ ان میں بے پناہ چمک تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کوئی درندہ نما انسان ہے یا انسان نما درندہ۔

اس کا مطلب یہ کہ کارٹر کی بیان کردہ کہانی درست تھی، ڈان جیفرسن نے سوچا مگر یہ کیونکر ممکن ہے کہ آدمی مرنے کے بعد بھیڑیا بن جائے؟ جیفرسن جیسا شخص جو بدروحوں یا آسیب پر کبھی یقین نہ رکھتا تھا، آخر کیسے مان لے کہ کارٹر کے بیان کردہ واقعات بالکل درست تھے؟ وہ اس کی کہانی سن کر دل ہی دل میں بہت ہنسا تھا، لیکن اب ..... اب آدھی رات کے اس سمے..... جنگل کے اندر..... صنوبر کے پرانے اُجڑے ہوئے درخت کے قریب جو کچھ وہ دیکھ رہا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ کارٹر سچ کہہ رہا تھا۔

یہ تمام خیالات، بجلی کی مانند ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے کے اندر اندر جیفرسن کے ذہن میں آئے اور نکل گئے۔ دفعتہً وہ زرد چمکیلی آنکھیں ایک دم سرخ ہو گئیں جیسے آگ کے دو دہکتے انگارے۔ ایک ہلکی سی غراہٹ کی آواز اس کے کانوں تک پہنچی، مگر اب وہ پوری طرح مستعد تھا۔ اس نے اطمینان سے بندوق کا کندا کندھے سے لگایا۔ اس انسانی بھیڑیے کی دونوں آنکھوں کے درمیان پیشانی کا نشانہ لیا اور لبلبی دبادی۔ بندوق کی دونوں نالوں سے بیک وقت دو شعلے سے نکلے اور جیفرسن کو محسوس ہُوا، دونوں گولیاں نشانے پر بیٹھیں۔ بارہ بور کی یہ دونالی بندوق نہایت طاقتور تھی اور جیفرسن اس میں لمبے لمبے نہایت وزنی، سیسے کے جو کارتوس استعمال کرتا تھا، وہ ایسے تھے جو ہاتھی کا بھیجا بھی توڑ دیتے، یہ انسانی بھیڑیاں تو بھلا کس کھیت کی مُولی تھا؟ جیفرسن نے دیکھا، گولیاں کھا کر درندہ، فضا میں اچھلا اور ایک ہولناک چیخ اس کے منہ سے نکلی، مگر وہ دوسرے ہی لمحے دوبارہ اچھلا اور گھاس کو چیرتا ہُوا جارحانہ انداز سے اُس کی طرف لپکا۔ اب اس کے لمبے لمبے سفید نوکیلے دانت پوری طرح کھلے ہوئے، سرخ جبڑے سے جھانک رہے تھے۔ اس نے اب بھی اپنے اوسان خطا نہ ہونے دیے۔ کئی قدم پیچھے ہٹ کر بندوق میں جلدی سے کارتوس پھر بھر کے اور دو فائر اور کئے۔ بلاشبہ دونوں گولیاں اس مرتبہ بھی انسانی بھیڑے کی کھوپڑی میں لگیں، مگر وہ نہ گرا، نہ ڈرا اور نہ زخمی ہُوا، بلکہ مزید غیظ و غضب میں بھر کر غراتا اور چلاتا ہوا جیفرسن کی

طرف لپکا۔ ایک لمحے کے لیے اس کو دل کی حرکت بند ہوتی محسوس ہوئی۔ کارٹر کی بیان کردہ کہانی صحیح ثابت ہو رہی تھی۔ یہ درندہ سیسے کی گولیوں سے مرنے والا نہ تھا۔ اس سے پیشتر کہ وہ کچھ سوچ سکے' انسانی بھیڑیے نے دل ہلادینے والی گرج کے ساتھ اس پر جست کی اور دائیں پنجے سے اس کا منہ نوچنا چاہا' لیکن جیفرسن نے بندوق الٹی کرکے پوری قوت سے اس کا کندا درندے کی کھوپڑی پر مارا۔ یہ ضرب اتنی شدید تھی کہ اگر شیر پر پڑتی' تو وہ بھی لڑھکنیاں کھاکر دور جاگرتا مگر انسانی بھیڑیے پر اس کا ذرا برابر اثر نہ ہوا۔

جیفرسن نے ایک بار پھر بندوق' درندے کے منہ پر ماری اور جب دیکھا یہ وار بھی بے کار گیا' تو پلٹ کر بے تحاشا بھاگا۔ اس کے پیروں میں جیسے پر لگ گئے وہ ادھیڑ عمر کا تھا' مگر اس وقت وہ اپنی جان بچانے کے لیے جس برق رفتاری سے بھاگا' اس نے نوجوانوں کو بھی جیسے مات کر دیا۔ صرف ایک بار رکا اور پلٹ کر دیکھا' انسانی بھیڑیا اچھلتا کودتا اس کے تعاقب میں آرہا تھا۔ جیفرسن پھر اندھا دھند دوڑنے لگا۔ راستے کی ناہمواریوں اور اونچی نیچی جھاڑیوں کو پھلانگنے میں اس کے کپڑے تار تار ہو گئے۔ بندوق وہیں پھینک آیا تھا۔ اس کا جسم بھی زخمی ہو گیا اور چہرے پر بھی جھاڑیوں میں سے گزرنے کے باعث گہری خراشیں آئی تھیں' لیکن وہ رکا نہیں' برابر بھاگتا رہا۔ خاصی دور جا کر ایک لمحے کے لئے رکا' لیکن پھر دوڑ پڑا' انسانی بھیڑیا اب بھی اس کے پیچھے آ رہا تھا اور دم بہ دم اس کی رفتار بڑھتی جا رہی تھی۔ جیفرسن کو اپنی موت بہت ہی قریب دکھائی دی۔ دوڑتے ہوئے اس نے سوچا کارٹر کی بیان کردہ کہانی کا حرف حرف صحیح ہے..... مگر اب جان بچانے کا مسئلہ تھا۔

تب اسے یاد آیا دریا قریب ہی ہے اور اگر قدیم داستانوں کے مطابق کوئی شخص انسانی بھیڑیے یا کسی آسیبی بلا سے جان بچانے کا خواہش مند ہو تو اسے بلا تامل پانی کے اندر کود پڑنا چاہیے۔ انسانی بھیڑیئے' خون آشام چمگادڑیں یا بدروحیں' چلتا ہوا پانی عبور نہیں کر سکتیں۔ خوش قسمتی سے وہ دریا کے رخ پر ہی

بھاگا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے اسے بتایا دریا زیادہ دور نہیں۔ اس کا سانس بری طرح پھول گیا تھا۔ مگر وہ ہر قیمت پر اپنی جان بچانا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا اگر وہ انسانی بھیڑیئے کے ہاتھوں مارا گیا' تو خود بھی انسانی بھیڑیا بن جائے گا اور یوں ایک لامتناہی سلسلہ چلنے لگے گا۔

جیفرسن اسی سوچ میں مسلسل بھاگ رہا تھا کہ دفعتہً انسانی بھیڑیئے کا پنجہ اس کے دائیں شانے پر پڑا اور اس کے شکاری کوٹ کا اتنا حصہ ادھڑ گیا۔ خدا رحم کرے! بلا کتنی نزدیک آگئی تھی۔ اب وہ بہتے ہوئے پانی کا شور سن رہا تھا دریا بیس پچیس گز دور تھا۔ جیفرسن نے اپنے جسم کی آخری قوت داؤ پر لگا دی اور دھڑاپ سے یخ بستہ پانی میں کود گیا۔ ایک ثانئے کے لئے اسے یوں لگا جیسے وہ برف سے بھرے ہوئے کسی گہرے اور تاریک کنوئیں میں گرتا چلا جا رہا ہو۔ پانی اتنا تیز تھا کہ اس کو بمشکل سنبھلنے کا موقع ملا۔ کسی زمانے میں وہ بہت عمدہ پیراک تھا اور اگرچہ پیراکی کی مشق چھوڑے ہوئے خاصی مدت ہو چکی تھی' مگر بعض ضروری طریقے پیراکی کے وہ نہ بھولا تھا۔ ایک گہرا غوطہ کھانے کے بعد اس نے اپنا چہرہ پانی کی سطح سے باہر نکالا اور پھیپھڑوں میں تازہ ہوا بھری۔ عین اسی لمحے اس کی ------

نگاہیں غیر شعوری طور پر اس کنارے کی طرف اٹھ گئیں جدھر سے اس نے دریا میں چھلانگ لگائی تھی اس نے دیکھا انسانی بھیڑیا کنارے پر نہایت اضطراب اور غصے سے چکر کاٹ رہا ہے۔ کبھی کبھی وہ اپنی تھوتھنی اٹھا کر چاند کی طرف دیکھتا اور ہلکی آواز میں غراتا جیسے شکار کے نکل جانے کی شکایت کر رہا ہو۔

دفعتہ" اس نے بھی جیفرسن کو دیکھا اور آگے بڑھ کر اپنا دایاں پنجہ پانی میں ڈال دیا' مگر فوراً" ہی اچھل کر یوں پیچھے ہٹا گویا اسے بجلی کا کرنٹ لگا ہو۔ پھر وہ بری طرح چیختا چلاتا جدھر سے آیا' ادھر بھاگ نکلا۔ دیر تک جیفرسن کے کانوں میں انسانی بھیڑیے کے چیخنے کی آواز آتی رہی' پھر یہ آواز مدھم ہوتے ہوتے جنگل کی دُور افتادہ پہنائیوں میں غائب ہوگئی۔

اس کے ہوش و حواس اب بھی غائب تھے وہ پانی کے بہاؤ پر تیزی سے آگے جارہا تھا۔ لڑھکتا' بل کھاتا' مڑتا' قلابازیاں اور ڈبکیاں کھاتا برابر آگے بہہ رہا تھا۔ اس کے جسم میں مزاحمت کی بالکل ہمت نہ تھی۔ جوں جوں وہ آگے بڑھ رہا تھا' پانی کا بہاؤ تیز سے تیز ہوتا جاتا اور پھر اس نے آبشار کے گرنے کی آواز بھی سن لی۔ دہشت کی ایک نئی لہر اس کی روح میں دوڑ گئی۔ یاد آیا کچھ فاصلے پر ستر فٹ کی گہرائی میں دریا کا پانی آبشار بناتا ہُوا گرتا ہے اور اگر وہ جلد سے جلد کنارے پر نہ پہنچا تو دنیا کی کوئی طاقت اسے آبشار میں گرنے اور چٹانی پتھروں سے ٹکرا کر پاش پاش ہونے سے نہیں بچا سکتی۔

پانی اس قدر یخ بستہ اور تیز رفتار تھا کہ کنارے تک پہنچنا ممکن ہی نہ تھا۔ پیروں اور ہاتھوں میں حرکت کرنے کی سکت نہ تھی اور اگر سکت ہوتی بھی تو اس بے پناہ بہاؤ کے سامنے اس کی حیثیت ایک تنکے سے زیادہ نہ تھی۔

اس نے دل ہی دل میں خدا کو یاد کیا اور دوسرے کنارے پر پہنچنے کی جدوجہد شروع کردی' لیکن اس کی ہر کوشش بہاؤ کے سامنے بیکار ثابت ہوئی۔ آبشار کی گرجدار آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ جیفرسن نے نگاہ اٹھا کر سامنے کی طرف دیکھا۔ چاند کی روشنی میں اسے آبشار کے دہانے کے پاس جھاگ سے بنی ہوئی

دھند سی نظر آئی۔ اس کے سامنے بچاؤ کا کوئی راستہ نہ تھا۔ کنارہ کم از کم چالیس فٹ دور تھا۔ کاش! کوئی سہارا ملتا۔ اپنی بیوی اور بچوں کو یاد کر کے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے ایک ثانیے کے اندر اندر اس کی گذشتہ تمام زندگی سکرین پر چلنے والی فلم کی مانند تیزی سے گزر گئی۔ اسے یاد آیا کہ زندگی میں کسی کو بھی کچھ نفع نہ پہنچایا' سارا وقت کھیل تماشے اور سیرو شکار میں بسر کر دیا۔ اپنی پیاری بیوی اور دوخوبصورت پھول سی لڑکیوں کو کبھی ایک شوہر اور ایک باپ کی محبت نہ دی۔ پوری دنیا میں اس کا کوئی دوست نہ تھا۔ پھر اسے کارٹر کا خیال آیا..... کارٹر..... جو نہایت شریف آدمی تھا اور جس کا جوان بیٹا جنگل میں کسی حادثے کا شکار ہو کر مرچکا تھا۔ وہ کہتا تھا اس کا بیٹا انسانی بھیڑیا بن گیا ہے اور یہ کہانی سن کر جیفرسن نے اس کا کتنا مزاق اُڑایا تھا۔ یہ سب باتیں اس کو یاد آئیں اور یہ احساس ہونے لگا کہ وہ کتنا سنگ دل اور ظالم شخص ہے۔ اب اس کی سزا ہے کہ وہ آبشار میں گرے اور اس کے جسم کا ایک ایک عضو الگ ہو جائے۔ اس نے اپنے آپ کو لہروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

انسانی بھیڑیے کی صورت اس کی آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگی۔ اس نے سوچا ممکن ہے اس کی زندگی کے کچھ دن ابھی باقی ہوں اور شاید اس لیے وہ انسانی بھیڑیے کا شکار ہونے سے بچ گیا ہے۔ ممکن ہے قدرت مجھ سے کوئی کام لینا چاہتی ہو۔ آبشار میں گرنے کے بعد بھی شاید میں زندہ رہوں' اگرچہ اس کا موقع سو میں سے ایک بھی نہیں۔ اس نے بہتے بہتے پھر دوسرے کنارے کی طرف دیکھا اور مایوس ہو کر آنکھیں بند کرلیں۔

وہ بے حد تھک چکا تھا۔ اس کے اعصاب جواب دے رہے تھے۔ یخ بستہ پانی نے اس کی رگوں میں واقعی خون جما رہا تھا۔ اس کے علاوہ پانی کا دباؤ' جس کے سامنے بڑے سے بڑا بند باندھنا بھی ممکن نہ تھا۔ آبشار کے گرنے کی آواز اب کانوں کے پردے پھاڑے دے رہی تھی۔ یہاں دریا کا پاٹ اتنا تنگ تھا کہ جیفرسن اگر ہمت سے کام لیتا' تو شاید کسی ابھرے ہوئے پتھر کا سہارا لے کر جان

بچائی جاسکتی تھی۔ اس نے عالم مایوسی میں ایک پتھر کی اُبھری ہوئی نوک پکڑنا چاہی، مگر پتھر اس قدر چکنا تھا اور اس پر کائی کی اتنی گہری تہہ جمی ہوئی تھی کہ اس کا ہاتھ فوراً پھسل گیا۔ ایک ثانیے کے اندر اندر اس نے اپنے آپ کو آبشار کے دہانے پر ایک کارک کی مانند اچھلتے، ڈوبتے ابھرتے اور قلابازیاں کھاتے ہوئے پایا۔ دریا کا بل کھاتا، بپھرتا ہوا پانی جیسے موت کا راگ الاپ رہا ہو۔ جیفرسن نے دل ہی دل میں خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی۔ کنارے کو ایک مرتبہ حسرت کی نگاہ سے دیکھا اور مرنے کے لیے تیار ہوگیا۔

جب وہ آبشار کی لپیٹ میں آکر پانی کی سفید شفاف چادر کے ساتھ ایک دم نیچے گرا تو یوں لگا جیسے آسمان کی بلندیوں سے یک لخت اسے زمین پر پھینک دیا گیا ہو۔ یہ اس کی زندگی کا وہ لمحہ تھا جسے آخری بھی کہا جاسکتا تھا اور وہ لمحہ بھی جو اس سے پیشتر اس کی زندگی میں کبھی نہ آیا تھا۔ یہ ایک عجیب، نرالا اور پُراسرار تجربہ تھا۔ جب وہ سترفٹ نیچے جھاگ اُڑاتے اور کھولتے ہوئے پانی میں ایک خرگوش کی طرح گرا تو ایک دم دریا کی تہہ میں بیٹھتا چلا گیا۔ اس کی ناک اور منہ کے راستے معدے میں خاصا پانی داخل ہو چکا تھا۔ اسے صرف اتنا یاد تھا کہ تہہ میں جاتے ہی ایک انجانی طاقت نے اسے اوپر اچھال دیا۔ پھر اسے کچھ ہوش نہ رہا۔

نہ جانے وہ کتنی دیر بے ہوش رہا، پھر اس کی آنکھیں خود بخود کھل گئیں۔ اس کے اردگرد اندھیرا تھا اور کانوں میں شائیں شائیں کی مسلسل آواز آ رہی تھی۔ وہ بے حس و حرکت اسی طرح پڑا رہا۔ اُس کا ذہن ماؤف۔ رفتہ رفتہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں بیدار ہونے لگیں۔ اس نے خیال کیا وہ مرچکا ہے اور اب ایک ایسے مقام پر ہے جہاں تاریکی، ٹھنڈ اور سناٹے کا راج ہے۔ اس نے اپنے بدن کو حرکت دینے کی کوشش کی، مگر بے سود، یوں محسوس ہُوا واقعی وہ مرچکا ہے، لیکن اگر اس پر موت طاری ہوچکی ہے، تو پھر یہ عجیب قسم کا احساس کیوں؟ تاریکی، ٹھنڈ اور سناٹے کا احساس..... کیا مرنے کے بعد بھی انسان کا دماغ کام کرتا

رہتا ہے؟ پھر اسے انسانی بھیڑیا یاد آیا اور وہ سوچنے لگا کیا بد روحیں مرنے کے بعد بھی کسی کو پریشان کر سکتی ہیں؟ صدہا خیالات اس کے ذہن میں آتے اور نکل جاتے۔ پھر اسے کسی شاعر کے دو شعر و یاد آئے جس میں اس نے موت کا مضمون باندھا تھا۔

موت کیا ہے .... ایک گہری طویل نیند جس میں کوئی خواب نہیں
موت کیا ہے .... انسان کے لیے عمدہ اور خوشگوار نعمت جس کا جواب نہیں
موت کیا ہے .... آرزوؤں، خواہشوں اور جذبوں کا ہمیشہ کے لیے اختتام
موت کیا ہے .... ایک نئی زندگی کا دروازہ، ایک نئے سورج کی آمد کا پیام

یکایک جیفرسن کو زور سے چھینک آئی اور اس کا پورا جسم حرکت میں آگیا۔ بے پناہ مسرت کا احساس اس کے رگ وپے میں دوڑ گیا۔ "تو زندہ ہے .... تو زندہ ہے ...." جیسے کسی نے اس کے کان میں کہا۔ اس نے اپنا بازو ہلایا، پھر ٹانگ اٹھائی۔ ایسا کرنے میں درد کی گہری ٹھیس محسوس ہوئی۔ پھر یاد آیا دریا میں کودنے کے بعد وہ آبشار کی لپیٹ میں آگیا تھا۔ انسانی بھیڑیا اس کے تعاقب میں تھا.... انسانی بھیڑیا! ایک بد رُوح۔

جیفرسن کچھ زیادہ پڑھا لکھا نہ تھا۔ نیکی بدی کا فلسفہ اس کی سمجھ سے بالاتر..... دراصل اس نے کبھی زندگی کے اس پہلو کا مطالعہ کرنے کی تکلیف گوارا ہی نہ کی تھی۔ تاہم اس بھیانک تجربے کے بعد یہ بات آسانی سے اس کی سمجھ میں آگئی کہ اگر کائنات میں خوں آشام چمگادڑیں، انسانی صورت کے بھیڑیئے، آسیب، گندی رُوحیں اور شیطانی سلسلے موجود ہیں، تو ولیوں، فرشتوں، پیغمبروں اور نیک رُوحوں کی بھی کمی نہیں۔ یوں قدرت نے خیر و شر کے درمیان حیرت انگیز توازن قائم کر رکھا ہے۔ کبھی خیر شر پر غالب آجاتا ہے اور کبھی شر خیر پر..... لیکن آخر میں جیت خیر ہی کی ہوتی ہے۔ اس تصور نے جیفرسن کے دل و دماغ کو ازحد تقویت پہنچائی۔ وہ سوچتا چلا گیا۔ ایک لوک کہانی اسے یاد آئی۔ وہ خود بخود ہنس پڑا۔ کہانی یہ تھی کہ جو آدمی دریا میں ڈوب جائے یا ڈوبتے ہوئے بچ جائے تو پھر

اسے عجیب عجیب خیالات ستاتے ہیں' یہ کہانی بھی مارک کارٹر نے سنائی تھی۔ جیفرسن کا دل شدت سے چاہنے لگا کہ وہ مارک کارٹر سے ملے۔ وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ اس کی کہانی کا ایک ایک حرف صحیح اور سچا ہے۔ پھر جیفرسن کو کارٹر کا وہ نوجوان بیٹا یاد آیا جو کچھ مدت پہلے اسی جنگل میں یکایک غائب ہوگیا تھا۔ کارٹر کا بیٹا، اس تصور کے آتے ہی انسانی بھیڑیئے کی صورت اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی اور اس کا کلیجہ آپ ہی آپ بیٹھنے لگا۔ خدا رحم کرے! اب اسے یاد آیا انسانی بھیڑیے کے خدوخال کارٹر کے بیٹے سے کس قدر مشابہت رکھتے تھے۔

اس کے اردگرد تاریکی خاصی کم ہوگئی تھی۔ جیفرسن نے اپنے آپ کو دریا کے کنارے ایک گڑھے میں پایا۔ حیران تھا یہاں کیسے آگیا۔ آبشار میں گر کر بچنے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ پھر یہ کون سی طاقت تھی جس نے اسے اٹھا کر کنارے بڑی حفاظت سے اس گڑھے میں لا ڈالا؟ اس سوال کا جواب اس کے پاس نہ تھا۔ ہاں وہ یہ بخوبی سمجھ رہا تھا کوئی طاقت ایسی ضرور ہے جس نے اسے انسانی بھیڑیے سے بچایا' دریا میں کودنے کے بعد جبکہ وہ آبشار کی لپٹ میں آکر زندگی سے مایوس ہوچکا تھا' اس اَن دیکھی طاقت نے اسے کنارے پر لا پھینکا۔ اس طاقت کے حضور میں آپ ہی آپ اس کا دل شکر سے لبریز ہوگیا۔

وہ ہمت کرکے وہاں سے اٹھا۔ اس کی تمام ہڈیاں پسلیاں صحیح وسالم تھیں۔ البتہ کمر میں کہیں اندرونی چوٹ کے باعث کچھ تکلیف تھی' مگر ایسی بھی نہیں کہ اسے حرکت کرنے میں دقت ہوتی۔ وہ گڑھے سے نکلا اور چند قدم چل کر لمبی لمبی گھاس میں گر گیا۔ اب صبح صادق کا اُجالا چاروں طرف پھیلنے لگا تھا اور نسیم سحر کے جھونکے اس کی روح وجاں میں ایک نئی قوت بھر رہے تھے۔ آسمان کا مشرقی اُفق گلابی سا تھا۔ ہوا کے ٹھنڈے جھونکوں نے اسے تھپکیاں دے کر سلانا چاہا اور اس نے بے اختیار آنکھیں بند کرلیں۔

دفعتہً اسے قریب کسی ذی روح کی موجودگی کا احساس ہُوا۔ اُس نے آنکھیں کھول کر دیکھا' ایک درندہ اسے سونگھ رہا تھا۔ اس کے جسم پر لمبے لمبے

سیاہ بال تھے اور تھا خاصا قوی ہیکل۔ جیفرسن کو خیال آیا یہ ایک اور انسانی بھیڑیا ہے۔ اس نے جلدی سے کمر میں چمڑے کی پیٹی سے بندھا ہوا شکاری چاقو نکالا اور درندے کی گردن میں پوری قوت سے گھونپ دیا۔ گاڑھے خون کی ایک گرم گرم دھار اس کے چہرے پر پڑی اور اسے رنگین کر گئی۔ درندے نے' جو دراصل ریچھ تھا' ایک خوفناک چیخ ماری اور جیفرسن کے اوپر ڈھیر ہوگیا۔ بھاری وزن سے اس کا دم گھٹنے لگا۔ اس نے بمشکل تمام اپنے آپ کو قوی ہیکل ریچھ کے نیچے سے نکالا۔ وہ ابھی تک زندہ تھا۔ جیفرسن دیوانہ وار اس کے جسم میں چاقو گھونپنے لگا اور ریچھ کی گردن کٹ کر الگ ہوگئی۔ جیفرسن کا سارا بدن خون میں لت پت تھا اور وہ بُری طرح کانپ رہا تھا۔ انسانی بھیڑیے کا سارا غصہ اس نے اس جنگلی ریچھ پر اتار دیا۔

ایک بار پھر وہ گھاس میں بے دم ہوکر گر پڑا۔ سورج مشرقی اُفق پر نمودار ہورہا تھا اور سنہری دھوپ ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ آبی پرندوں کا شور جیفرسن کے کانوں تک پہنچ رہا تھا۔ وہ دوبارہ اٹھا اور سیدھا دریا کی طرف گیا۔ دیر تک وہاں نہاتا اور اپنا بدن صاف کرتا رہا۔ پھر وہاں سے آہستہ آہستہ چلا۔ اسے معلوم تھا کون سا راستہ اس چھوٹے سے قصبے کی طرف جاتا ہے جہاں مارک کارٹر کا قیام تھا۔

مارک کارٹر کا جھونپڑا یا لکڑی کا بنا ہُوا کیبن دور ہی سے دکھائی دے گیا۔ قصبے اور جنگل کی حد پر بنا ہُوا تھا۔ کیبن کی چمنی سے دُھواں بل کھاتا ہُوا فضا میں اٹھ رہا تھا۔ بھنے ہوئے گوشت اور تلے ہوئے انڈوں کی خوشبو جیفرسن کے نتھنوں میں آئی' وہ بھوک سے بے قرار ہوگیا۔ گذشتہ سات آٹھ گھنٹوں میں اپنی مدافعت کے لیے جو قوت صرف کرنا پڑی اس نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا کیبن کے دروازے تک پہنچا اور ایک جھٹکے سے ڈھیر ہوگیا۔ اس کے گرنے کی آواز سن کر کیبن کا دروازہ کھلا اور ادھیڑ عمر کا ایک شخص باہر آیا۔ یہ مارک کارٹر تھا۔ اس نے حیرت سے جیفرسن کو دیکھا۔

"خدا کے لیے مجھے بچاؤ مارک"۔ جیفرسن نے نقاہت سے کہا۔

مارک کارٹر اسے سہارا دے کر کیبن کے اندر لے گیا اور ایک گداز آرام دہ بستر پر لٹا دیا۔ وہ حیران تھا جیفرسن کی یہ حالت کیونکر ہوئی۔ اس نے سوالیہ انداز میں اپنی نگاہیں اس کے چہرے پر گاڑدیں۔ جیفرسن نے دیکھا مارک کارٹر تیزی سے بڑھاپے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ یہ پہلے سے زیادہ جُھریاں تھیں۔ آنکھوں کی چمک مدھم اور ان کے نیچے گہرے سیاہ حلقے۔ بال بھی خاصے سفید ہوچکے تھے۔ اسے کارٹر کی یہ حالت دیکھ کر بہت صدمہ پہنچا۔ وہ دونوں مدت سے ایک دوسرے کو جانتے پہچانتے تھے اور بارہا شکار کی کئی مہمیں انہوں نے مل کر سَرکی تھیں، لیکن جب سے کارٹر کا نوجوان خوبصورت لڑکا جنگل میں غائب ہُوا تھا، اس وقت سے کسی نے اسے ہنستے نہ دیکھا۔ کارٹر کا کہنا تھا اس کا لڑکا کسی انسانی بھیڑیے کا شکا ہُوا ہے اور اب تک وہ بھی ویسا ہی بھیڑیا بن چکا ہوگا۔ اس نے یہ کہانی جیفرسن کو بھی سنائی تھی اور سنگدل جیفرسن نے اس کا خاصا مذاق اُڑایا تھا۔ یہ سب باتیں اسے یاد آرہی تھیں۔ کارٹر نہایت صبر اور سکون سے اپنے کام میں مصروف تھا۔ اس نے بکرے کی بھنی ہوئی ران جیفرسن کی طرف بڑھا دی۔ اس نے چند منٹ میں اسے اپنے معدے میں اتار لیا۔ اس کے بعد گرم گرم قہوے کے دو پیالے پیئے اور جان میں جان آئی۔ اس کام سے فارغ ہوکر جیفرسن نے کارٹر کے پاؤں پکڑتے ہوئے کہا۔

"مجھے معاف کردینا مارک! تم نے جو داستان کچھ مدت پہلے مجھے سنائی تھی وہ درست تھی اور اب مجھے کوئی شبہ نہ رہا کہ تمہارے لڑکے لیوک کو جس درندے نے ہلاک کیا، وہ انسانی بھیڑیا ہوگا"۔

"آہ! تو آخر کار تمہیں یقین آگیا؟" کارٹر نے کہا۔ "مجھے پورا واقعہ سناؤ"۔

جیفرسن نے شروع سے آخر تک سارا قصہ کہہ سنایا۔ کارٹر سانس روکے سنتا رہا۔ اس کا چہرہ کبھی سرخ ہو جاتا، کبھی سفید، کبھی زرد۔ آخر اس نے کانپتی ہوئی آواز میں جیفرسن سے پوچھا۔

"کیا تم نے میرے بیٹے کو دیکھا؟ وہ انسانی بھڑیے کے روپ میں تھا؟ اس کے خال وخد پہچاننے میں کوئی غلطی تو نہیں کی؟"

"ہرگز نہیں"۔ جیفرسن نے جواب۔ "میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ وہ تمہارے بیٹے لیوک ہی کا چہرہ تھا' ویسی ہی پیشانی' ویسی ہی آنکھیں اور ویسا ہی دہانہ۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس کے جسم پر لمبے لمبے بال' ہاتھ اور پاؤں بالکل بھیڑیے کے سے اور منہ کے اوپر لمبی سی تھوتھنی تھی۔ میں نے اسے صرف آنکھوں کے ذریعے پہچانا' اگرچہ وہ پہلے زرد تھیں' پھر سُرخ ہو گئیں۔ جب اس نے مجھے دیکھا' ان آنکھوں میں بے پناہ چمک تھی"۔

کارٹر اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بے چینی سے کیبن میں ٹہلنے لگا۔

"تم کہتے ہو تم نے دو مرتبہ گولی چلائی' دونوں مرتبہ گولیاں اسے لگیں' مگر وہ نہیں مرا؟"

"ہاں یہ عجیب بات ہے کارٹر۔ تم جانتے ہی ہو۔ میرا نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا اور پھر بارہ بور کی یہ دونالی کے طاقتور کارتوس..... جو میں نے بہت قریب سے چلائے تھے۔ بخدا! اس کی جگہ کوئی ہاتھی ہوتا تو دوسرا سانس نہ لیتا، مگر اس پر ذرہ برابر اثر نہ ہُوا"۔

کارٹر کے لبوں پر پُراسرار تبسم نمودار ہوا۔ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

"یہ سیسے کے کارتوس' تلوار یا خنجر اسے ہلاک نہیں کر سکتے جیفرسن..... ایسی بلاؤں کو چاندی کے کارتوسوں سے مارا جاسکتا ہے۔ اس بلا کو جلد سے جلد فنا کر دینا ہمارا فرض ہے۔ جیفرسن' ورنہ جتنے انسان اس کے پنجوں کا شکار ہوں گے' سب کے سب انسانی بھیڑیے بنتے چلے جائیں گے اور یوں یہ سلسلہ بہت طویل ہو جائے گا۔ پھر انہیں ختم کرنا ممکن نہ ہوگا۔ بولو' کیا تم اس فرض کو پورا کرنے میں میرا ساتھ دو گے؟"

جیفرسن نے اثبات میں سرہلایا۔ "ہم ہمیشہ ایسی مہموں میں ایک دوسرے کے ساتھی رہے ہیں کارٹر۔ میں ہر مرحلے پر تمہارے ساتھ ہوں"۔

"بہت خوب' مجھے تم سے یہی امید تھی۔ اب ہمیں اس مہم پر جانے کے اپنے انتظامات کر لینے چاہئیں"۔

ڈان جیفرسن کو بخار ایسا چڑھا کہ تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ اس دوران میں بے چارہ کارٹر ہی اس کی تیمار داری کرتا رہا۔ بخار کی حالت میں دیر تک ہذیانی کیفیت طاری رہتی۔ اول تو اسے رات کو نیند نہ آتی، اگر چند منٹ کے لیے سوتا تو فوراً چیخ مار کر بیدار ہو جاتا۔ پھر اس کا جسم تھر تھرانے لگتا۔ خوف سے آنکھیں اُبل آتیں اور وہ بے دم ہو جاتا۔ کارٹر اس صورتِ حال سے سخت پریشان تھا۔ وہ چاہتا تھا جتنی جلد ممکن ہو جنگل میں جاکر انسانی بھیڑیے کو فنا کر دیا جائے۔

دو ہفتے بعد خدا خدا کر کے جیفرسن کا بخار اترا' کارٹر نے اسے مرغن غذائیں کھلائیں اور بہت جلد اس کی صحت واپس آگئی۔ ایک روز جیفرسن بستر پر لیٹا تھا اور کارٹر کسی بڑی کتاب کی ورق گردانی میں مصروف تھا کہ جیفرسن نے پوچھا۔

"کیا پڑھ رہے ہو؟"

"ایک پرانا قلمی روزنامچہ ہے۔ میری دادی کے ہاتھ کا لکھا ہوا"۔ کارٹر نے جواب دیا۔

"مجھے بھی تو سناؤ کیا لکھا ہے تمہاری دادی اماں نے' یہ تو خاصا پرانا ہوگا"۔

"ہاں کم از کم سو سال تو اسے ہو ہی گئے"۔ کارٹر نے کہا۔ "اس میں انہوں نے عجیب عجیب واقعات لکھے ہیں' میں ایک خاص واقعہ تلاش کر رہا ہوں۔"

"میں بھی سننا چاہتا ہوں"۔ جیفرسن نے دل چسپی لیتے ہوئے کہا۔

"لو سنو..... دادی جان ایک جگہ لکھتی ہیں۔ کل رات چاند کی چودھویں تاریخ تھی۔ چچا ایڈم کارٹر سیر کے لیے جنگل میں گئے۔ وہاں صنوبر کے ایک اونچے اور بڑے درخت کے پاس....."

"خدا کی پناہ....." جیفرس چلایا۔ "یہ کس تاریخ کا واقعہ ہے کارٹر؟ میں نے تمہاری دادی کے چچا ایڈم کارٹر کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے۔ وہ اپنے عہد کے بہت بڑے شکاری اور بے حد دلیر آدمی تھے ..... ٹھیک ہے نا؟ کیا

ان کے زمانے میں بھی یہ جنگل ایسا ہی تھا اور صنوبر کا وہ درخت.... خدا رحم کرے کیا انہوں نے بھی چاند کی چودھویں تاریخ کو انسانی بھیڑیاں دیکھا تھا ؟"

"ہاں' جیفرسن..." کارٹر نے سرد آہ بھر کر کہا۔ "ہمارے خاندان پر یہ لعنت اسی زمانے سے سوار ہے۔ ایڈم کارٹر دراصل میرے دادا کا چچا تھا۔ اس لیے دادی اماں بھی اسے چچا ہی کہتی تھیں۔ میری پیدائش سے بھی بہت پہلے اس کا انتقال ہوگیا۔ میں نے سنا ہے وہ نہایت نڈر اور تجربہ کار شکاری تھے۔ ان کے کارنامے آج گردو نواح کے بڑے بوڑھوں کی زبان پر ہیں۔ جنوری کی سترہ تاریخ تھی اور چاند کی چودھویں جب وہ جنگل میں گیا اور سنہ تھا ۱۸۶۳"۔

"گویا آج سے ایک سو دس برس پہلے"۔ جیفرسن چلایا۔

"ہاں ایک سودس برس پہلے ..... اور اتنی مدت گزر چکی کہ انسانی بھیڑیئے کی شکل میں یہ بلا ہم پر مسلّط ہے۔ اب تک ہمارے خاندان کے چار افراد اس کے حملے کا شکار ہو کر انسانی بھیڑیے کا قالب اختیار کر چکے ہیں اورپانچواں میرا بیٹا....." کارٹر کی آواز فرطِ رنج سے بھراگئی۔ اس نے رومال نکال کر آنکھوں پر رکھ لیا اور سسکیاں لینے لگا۔ جیفرسن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے اپنا ہاتھ کارٹر کے کندھے پر رکھ کر تھپکی دی۔

"فکرمت کرو دوست' ہم دونوں جنگل میں چلیں گے اور اس بلا کو ختم کر ڈالیں گے اب مہربانی کرکے اپنی دادی کا روزنامچہ سناؤ آگے کیا لکھا ہے"۔

کارٹر نے آنسو پونچھے اور ایک بار پھر اس سالخوردہ کتاب پر نگاہیں جمادیں۔ اس کا ہاتھ بُری طرح لرز رہا تھا۔ چند ثانیے چپ رہنے کے بعد اس نے عبارت پڑھنی شروع کی۔

"چچا ایڈم نے اسے صنوبر کے ایک اونچے اور بڑے درخت کے پاس لمبی گھاس میں دبکے ہوئے دیکھا۔ اس کا چہرہ انسانوں کا اور جسم بھیڑیے کا سا تھا اور اگر میرے گلے میں جنگلی گلاب کے پھولوں کا ہار نہ پڑا ہوتا تو وہ مجھے چیر پھاڑ کر رکھ دیتا اور پھر میں بھی اپنے پردادا کی مانند انسانی بھیڑیئے کا روپ دھار لیتا۔

میرے پردادا نے بہت برس پہلے اس جنگل میں ایک جادوگر ہلاک کیا تھا۔ وہ جادوگر کالے علم کا ماہر تھا۔ مرتے ہوئے میرے پردادا کو بد دعا دی کہ تجھے بھیڑیا کھائے گا اور پھر تو بھی بھیڑیا بن کر اپنے ہی خاندان کے کسی آدمی کو مارے گا اور اس طرح کئی نسلوں تک یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ہمیں ایک مذہبی آدمی نے اس بلا سے بچنے کی کئی تدبیریں بتائی ہیں۔ ایک یہ کہ ہم جنگل میں جائیں' تو جنگلی گلاب یا لہسن کے پھول کا ہار گلے میں ڈال لیں۔ انسانی بھیڑیا' جو ایک بد روح ہے' ان سے بھاگتا ہے۔ دوسرا طریقہ یہ کہ ایسے خنجر بنوائے جائیں جن کے دستے چاندی کے ہوں یا بندوق میں ایسے کارتوس بھریں جن کے خول چاندی کے ہوں۔ چاندی کے علاوہ کوئی اور دھات انسانی بھیڑیے پر اثر نہیں کر سکتی۔ جب پورا چاند آسمان پر روشن ہو' تو جنگل میں نہ جائیں اور چودھویں کے بعد پندرھویں' سولھویں یا سترھویں تاریخ کو بھی ادھر جانے کا قصد نہ کریں ، اگر اس دوران میں جانا پڑ جائے' تو جنگلی گلاب یا لہسن کے پھولوں کا ہار گلے میں ڈال کر جائیں۔ انسانی بھیڑیے کا پنجہ ان پھولوں سے چھو جائے' تو وہ فوراً جل کر راکھ ہو جائے گا۔ اگر جنگلی پھول گلے میں ڈالنے یاد نہ رہیں اور انسانی بھیڑیا حملہ آور ہو تو چاہیے کہ آدمی بہتے ہوئے پانی کی طرف دوڑے اور اس میں چھلانگ لگا دے۔ انسانی بھیڑیے بہتے پانی کو عبور نہیں کر سکتے"۔

"اس آخری ترکیب نے میری جان بچائی"۔ جیفرسن نے کہا" یہ اور بات ہے کہ مجھے اس کے بارے میں کچھ پتہ ہی نہ تھا۔ میں نے بہت عرصہ پہلے صرف سنا تھا کہ اگر ایسا ہو تو دریا میں کود کر جان بچائی جاسکتی ہے۔"

"اچھا یہ بتاؤ تمہارے پاس چاندی کی کتنی مقدار ہے؟" کارٹر نے پوچھا۔

"چاندی۔" جیفرسن نے ندامت سے کہا۔ "بھلا میرے پاس چاندی کہاں سے آئی"۔

"بہرحال ہمیں کہیں نہ کہیں سے چاندی حاصل کرنا ہوگی"۔ کارٹر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "تم نے سن لیا اس بلا کو صرف چاندی کے کارتوسوں ہی سے

فنا کے گھاٹ تارا جاسکتا ہے"۔

"میرے پاس گھر میں تیس چالیس ڈالر کی رقم محفوظ پڑی ہوگی، کہو تو وہ لادوں، اگر اس رقم میں چاندی مل سکے، تو...." جیفرسن نے کہا۔

"بہت خوب، کوئی تیس ڈالر میرے پاس بھی ہیں۔ میرا خیال ہے پچاس ڈالر میں چاندی کی اتنی مقدار ہم خرید سکتے ہیں کہ اس سے چار پانچ کارتوسوں پر خول چڑھائے جاسکیں"۔

اگلے دو دن انہوں نے چاندی خریدنے اور کارتوس بنانے میں لگا دیے۔ جیفرسن اپنی بارہ بور کی بندوق وہیں جنگل میں پھینک آیا تھا۔ خوش قسمتی سے کارٹر کے پاس ایک فالتو بندوق تھی، وہ اس نے جیفرسن کو دے دی۔ اب انہیں چاند کی چودھویں تاریخ کا انتظار تھا۔ انہوں نے جنگلی گلاب اور لہسن کے پھولوں کے بہت سے ہار بھی تیار کر لئے تھے۔ فرصت کے اوقات میں وہ دونوں اپنی اپنی بندوقوں سے نشانے کی مشق کرتے۔ جیفرسن نے ایک روز اداس ہوکر کہا۔

"مجھے اپنی اس بارہ بور کی بندوق کا ہمیشہ افسوس رہے گا۔ ایک مدت سے وہ میرے قبضے میں تھی اور اس نے بے شمار جانور ہلاک کیے تھے"۔

"فکر نہ کرو جیفرسن، تمہاری بندوق ضرور وہیں کہیں جنگل میں پڑی مل جائے گی اور اگر نہ ملی، تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں اس سے بھی زیادہ عمدہ بندوق دلواؤں گا"۔

کارٹر نے اس کی طرف محبت سے دیکھتے ہوئے جواب دیا اور پھر منہ پھیر کر کیبن سے باہر نکل گیا۔ جیفرسن نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ لیے تھے۔ یکایک اسے خیال آیا وہ کتنا کمینہ اور کم ظرف ہے اور اس دوکوڑی کی بندوق کا صدمہ نہیں بھولتا اور ادھر کارٹر اتنا شریف النفس کہ جس نے جوان بیٹے کی موت پر صبر کر لیا۔

چودھویں رات کا چاند مشرقی اُفق سے نکلا، تو دونوں اپنی اس خطرناک مہم پر جانے کے لئے بالکل تیار تھے.... دونوں نے اُبھرتے ہوئے گول سنہری چاند کو ایک

نظر دیکھا' بندوقیں کندھوں پر' جنگلی گلاب اور لہسن کے ہار اپنے اپنے گلے میں ڈالے اور دریا کی طرف روانہ ہوگئے۔ اب انہیں ایک جگہ سے دریا عبور کرکے دوسرے کنارے پر جانا تھا۔ بہاؤ کے' اُلٹے رخ کوئی پانچ میل دور جاکر کارٹر نے گھاس میں چھپی ہوئی ایک چھوٹی سی کشی اور دو چپو برآمد کیے۔ جب وہ کشتی میں سوار ہوکر دوسرے کنارے کی طرف بڑھ رہے تھے تو ان کے دل کی دھڑکنیں تیز سے تیز تر ہوتی گئیں۔ چاند ان کے ساتھ ساتھ تھا اور اب خاصی اونچائی پر آگیا تھا۔ جنگل میں ہیبت ناک سناٹا طاری تھا۔ چاندنی میں دور تک کا منظر ایک خواب کی مانند ان کی نگاہوں کے سامنے پھیلا ہُوا تھا۔ بلاشبہ یہ نہایت حسین رات تھی۔ حُسن کا جادو جنگل کے چپّے چپّے کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے .....وہ دونوں خاموش تھے۔

دوسرے کنارے پر پہنچ کر کارٹر نے جیفرسن کی مدد سے کشتی گھسیٹ کر کنارے پر لگادی اور لکڑی کی ایک لمبی سیخ کے ساتھ باندھ دی۔ اس کے بعد دونوں آگے پیچھے جنگل کے اس حصے کی طرف بڑھے جہاں صنوبر کا وہ آسیبی درخت گذشتہ ایک سو سال' بلکہ اس سے بھی پہلے سر اٹھائے کھڑا تھا۔ کارٹر آگے تھا۔ جیفرسن پیچھے' جنگل میں کوئی ذی روح نہ تھا۔ پرندے تک خاموش۔ یہ ایسی ہو شربا خاموشی تھی جو انسان کے اعصاب بہت جلد شکستہ کر دیا کرتی ہے۔

یہ کائنات کتنی پُراسرار اور انوکھی ہے! جیفرسن نے دل میں سوچا۔ ہم اس کے راز کبھی نہیں پاسکتے۔ موت کیا ہے' زندگی کیا ہے' روح کیا ہے' شیطان کیا ہے' پھر مرنے کے بعد ایک انسان کا درندے کے قالب میں نمودار ہونا کتنا عجیب لگتا ہے۔ انتقام.... جادو.... آسیب.... نیکی.... خیر.... یہ سب کیا ہے۔ وہ سوچتا جارہا تھا۔ وہ دونوں دریا کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ کارٹر نے ایک مرتبہ بھی زبان نہ کھولی۔ شاید وہ بھی یہی کچھ سوچ رہا تھا جو جیفرسن کے دل میں تھا۔

دفعتہً آبشار کے گرنے سے جو شور پیدا ہوتا ہے اس کی آواز جیفرسن کے کانوں میں آئی اور چند روز پیشتر کا حادثہ پوری شدّت سے اس کے ذہن میں

آیا۔اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔ جوں جوں وہ آگے بڑھ رہے تھے۔ آواز زیادہ تیز اور واضح ہوتی چلی جا رہی تھی۔ آخر وہ اس مقام پر پہنچ گئے جہاں آبشار کے ستر اسی فٹ گرنے سے فضا میں دھند کا ایک بادل بن گیا تھا۔ یہاں اتنا شور تھا کہ وہ ایک دوسرے سے اشاروں ہی میں باتیں کر سکتے تھے۔ دونوں پانچ سات منٹ تک وہاں گم صم کھڑے رہے۔ جیفرسن سوچ رہا تھا۔ اس گہرائی میں' اتنے تیز بہاؤ کے ساتھ گرنے والا کوئی آدمی زندہ بچ سکتا ہے؟ کبھی نہیں بچ سکتا' لیکن وہ تو بچ گیا تھا.....

پھر وہ وہاں سے پلٹے اور جنگل کے اندرونی حصے کی طرف بڑھے۔ چاندنی درختوں کی شاخوں اور پتوں میں سے چھن چھن کر آ رہی تھی۔ عجیب و غریب سائے ادھر ادھر بکھرے نظر آنے لگے۔ کارٹر بالکل خاموش تھا۔ جیفرسن کے ذہن میں یکایک ایک بھیانک خیال آیا اور دہشت سے اس کے دل کی حرکت بند ہونے لگی۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے ذہن سے یہ خیال جھٹکا' وہ سوچ رہا تھا کہ کیا خبر یہ شخص کارٹر خود ہی انسانی بھیڑیا ہو جو مجھے فریب سے جنگل میں لے آیا ہے اور ابھی اپنی ہیئت تبدیل کرکے بھیڑیا بن جائے گا۔ عین اس لمحے کارٹر نے گھوم کر جیفرسن کی طرف دیکھا اور جیفرسن اچھل پڑا..... اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ پھر اسے یاد آیا کہ اگر کارٹر انسانی بھیڑیا ہوتا تو جنگلی گلاب اور لہسن کے پھولوں کا ہار کبھی نہیں پہن سکتا تھا اور نہ چاندی کے کارتوس اپنی جیب میں رکھتا اور نہ بہتے ہوئے پانی کو عبور کرنے کے قابل ہوتا اپنے اس وہم پر جیفرسن کو تھوڑی دیر بعد خود ہی ہنسی آگئی۔ کارٹر نے اس ہنسی کا سبب پوچھنے کے لئے پہلی بار زبان کھولی۔

"کیا بات ہے جیفرسن! بہت خوش نظر آتے ہو؟" اس نے عجیب انداز سے جیفرسن کو دیکھا۔ یہ ہنسی بالکل بے موقع اور بے محل تھی۔

"میں سوچ رہا تھا' کہیں تم خود ہی انسانی بھیڑیے تو نہیں ہو"۔

"آہ..... تو تم نے مجھے پہچان لیا"۔ کارٹر نے سنجیدگی سے کہا اور اسے گھورنے لگا۔

"ایک لمحے کے لیے جیفرسن کو یوں لگا جیسے واقعی اس کے دل کی حرکت تھم

گئی ہو۔ دوسرے ہی لمحے کارٹر ہنسا اور بولا۔

"ان واہیات باتوں کو چھوڑو' اب ہم واقعی انسانی بھیڑیے کے آس پاس پہنچ گئے ہیں۔ اپنی بندوق تیار رکھو' کسی بھی وقت ہمارا اس کا آمنا سامنا ہو سکتا ہے"۔

اب وہ درختوں کے اُس جُھنڈ کی طرف پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے بڑھ رہے تھے جہاں جیفرسن نے انسانی بھیڑیے کو پہلے پہل دیکھا تھا۔ فاصلہ تھا کہ ختم ہی ہونے میں نہ آتا تھا' یوں بھی وہ آہٹ پیدا کیے بغیر چل رہے تھے۔ ٹھیک آدھی رات کا عمل تھا' جب انہوں نے دور سے صنوبر کے اس ٹنڈ منڈ درخت کو دیکھا جو ایک خوفناک دیو کی مانند گردن اٹھائے اور بازو پھیلائے اس جُھنڈ کے وسط میں کھڑا تھا۔ چاند ان کے سروں پر آگیا تھا اور حیرت سے اس عجیب مہم کا نظارہ کر رہا تھا۔ جنگل کی حیوانی زندگی آہستہ آہستہ اپنی بیداری اور خبرداری کا احساس انہیں دلا رہی تھی۔ کبھی شاخوں میں چُھپے ہوئے پرندے دبی زبان میں سرگوشیاں کرتے' کبھی کوئی چمگادڑ پھڑپھڑاتی ہوئی جھنڈ میں سے نکلتی اور فضا میں چکر کاٹ کر دوبارہ اسی جُھنڈ میں غائب ہو جاتی۔ دفعتاً" ایک اُلو اپنی بھیانک آواز میں چیخا..... ہُو ہُوہُو ..... پھر وہ فضا میں اُڑا اور نہ جانے کس طرف چلا گیا۔ وہ بہت احتیاط سے اس جُھنڈ میں داخل ہوئے ، یہاں کسی قدر تاریکی تھی۔ پہلے پہل انہیں کچھ دکھائی نہ دیا۔ وہ دَم سادھے پاس پاس کھڑے رہے ۔ انہوں نے اپنی اپنی بندوقیں کندھوں سے اتار کر ہاتھوں میں سنبھال لی تھیں۔ ان کی انگلیاں لبلبی پر تھیں اور نگاہیں اپنے دشمن کو تلاش کرنے میں ..... ایک ہلکی سی آہٹ گھاس میں سے آتی ہوئی سنائی دی۔ وہ چوکنے ہو گئے اور ایک دوسرے کی پشت سے پشت ملا کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے دل بُری طرح دھڑک رہے تھے' انتظار کے یہ لمحات گویا صدیوں پر محیط تھے۔

معاً" تاریکی کا سینہ چیرتی ہوئی ایک ہولناک آواز جنگل میں اُٹھی۔ ان دونوں کے دل لرز گئے ۔ یہ انسانی بھیڑیے کی چیخ تھی' شاید اس نے اُن کی بُو پا لی تھی۔ چند ثانیئے بعد انہوں نے ایک حرکت کرتا ہُوا جسم کوئی پچاس فٹ کے فاصلے پر

دیکھا۔ یہ ایک جسیم اور قوی بھیڑیا تھا جو گھاس میں دبکا ہُوا آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ چاند کی مدھم روشنی میں اس کا چہرہ' انہیں صاف دکھائی دے رہا تھا۔ یہ ایک نوجوان لڑکے کا چہرہ تھا۔

"لیوک ..... میرے بیٹے ....." کارٹر کے منہ سے بے اختیار یہ الفاظ نکل گئے۔

انسانی بھیڑیے نے ایک اور دل دوز چیخ ماری' غراتا ہُوا گھاس میں سے نکلا اور سیدھا کارٹر کی طرف آیا۔ اس کا انداز جارحانہ تھا۔ جیفرسن نے جھرجھری لی۔ یہ وہی انسانی بھیڑیا تھا جو اس کے تعاقب میں آیا تھا۔ کارٹر نے نہایت سکون سے بندوق سیدھی کی' نشانہ لیا اور لبلبی دبا دی۔ گولی بھیڑیے کی کھوپڑی پر لگی۔ وہ الٹ کر گرا' اس کی چیخوں اور غراہٹوں سے شجر و حجر کانپنے لگے۔ فضا میں لاتعداد پرندے گھبرا کر چکر کاٹ رہے تھے۔ کارٹر نے دوسرا فائر کیا۔ یہ گولی بھی نشانے پر لگی۔ بھیڑیا ماہی بے آب کی مانند گھاس میں تڑپ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بے حس و حرکت ہو گیا۔

کارٹر اور جیفرسن دونوں لاش کی طرف دوڑے ابھی وہ جھک کر اسے اچھی طرح دیکھنے بھی نہ پائے تھے کہ وہیں جھاڑیوں میں دبکا ہوا ایک اور درندہ ان پر لپکا۔ یہ بھی انسانی بھیڑیا تھا۔ لیکن اس کی شکل اور جسامت پہلے بھیڑیے سے کہیں زیادہ ڈراؤنی اور بڑی تھی۔

"جیفرسن' فائر کرو۔" کارٹر چلایا۔

انسانی بھیڑیا ان سے صرف چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ جونہی اس نے جست کی' جیفرسن کی بندوق چلی اور گولی بھیڑیے کے دل میں لگی۔ وہ الٹ کر گرا اور ایک ثانیے کے اندر اندر ٹھنڈا ہو گیا۔

"خدا کی پناہ ---- مجھے اس کا خیال ہی نہ تھا۔" کارٹر نے کہا۔ "یہی وہ خبیث تھا جس نے میرے پیارے بیٹے لیوک کو ہلاک کیا اور اسے اپنی جنس میں شامل کر لیا"۔

انہوں نے انسانی بھیڑیوں کی لاشوں کو گھسیٹا اور چاندنی میں لے گئے۔ یہ ایک عجیب دہشت انگیز منظر تھا۔

"دیکھو دیکھو' یہ کیا ہو رہا ہے" جیفرسن خوف سے چیخا۔

اب بھیڑیوں کی لاشوں کے چہرے تبدیل ہو رہے تھے۔ پہلی لاش بھیڑیئے کے بجائے نوجوان لیوک کارٹر کا مُردہ جسم پڑا دکھائی دیا۔ وہ پوری انسانی لاش تھی' اور اس میں بھیڑیے کے کوئی آثار نظر نہ آتے تھے۔ کارٹر نے اپنے جوان بیٹے کی پیشانی پر جھک کر ایک بوسہ دیا۔ اس کے دونوں رخساروں پر آنسوؤں کے قطرے ڈھلک رہے تھے۔ پھر اس نے اپنے گلے سے جنگلی گلاب اور لہسن کے پھولوں کے ہار اتارے اور مُردہ بیٹے کے گلے میں ڈال دیے۔

بھیڑیے کی دوسری لاش بھی تھوڑی دیر بعد ایک انسانی لاش میں بدل گئی۔ یہ ایک بوڑھا اور کریہہ المنظر جنگلی شخص کا چہرہ سیاہ اور جھُریوں دار تھا۔ ہاتھ پیر سوکھے اور مڑے ہوئے ....

کارٹر نے کہا۔ "شاید یہ وہی جادوگر ہے جس نے مرتے وقت ایڈم کارٹر کو یہ بددعا دی تھی۔ ابھی وہ اس لاش پر نفرت کی نگاہیں ڈال ہی رہے تھے کہ وہ سیاہ راکھ کے ایک ڈھیر میں تبدیل ہو گئی۔

مارک کارٹر گھٹنوں کے بَل جھکا اور دیر تک اپنے بیٹے کے لئے مغفرت کی دعائیں مانگتا رہا۔ جیفرسن کی گردن بھی اَدب سے جھکی ہوئی تھی' پھر انہوں نے لیوک کی لاش اٹھائی اور جنگل سے چلے۔ جب وہ دریا کے کنارے پہنچے اور کشتی پر سوار ہوئے' صبح صادق کا اُجالا مشرقی اُفق سے ایک نیا دن طلوع ہونے کی خوشخبری دے رہا تھا۔

رُوح کا وَعدہ

خلا کی تسخیر کے اس عظیم دور میں شاید ہی کوئی اس کہانی پر یقین کرے گا' چہرے پر لاتعداد جھُریاں' پوپلا منہ' آنکھیں زرد اندر کو دھنسی ہوئیں۔ بڈھے نے گردن اٹھا کر خوب غور سے کاؤنٹ ہیمن کو دیکھا۔ پھر کرخت لہجے میں کہا۔

"کون ہو تم' یہاں کس لیے آئے؟"

کاؤنٹ نے بڑی مشکل سے سمجھایا کہ مکان خالی ہونے کا پتا چلا تھا' اس لئے اِدھر چلا آیا۔ بڈھا سخت بہرا تھا۔ کاؤنٹ کو چیخ چیخ کر اپنی بات اس کے ذہن میں اُتارنا پڑی۔ تب اس نے نفی میں گردن ہلائی اور کہا مکان خالی نہیں اور نہ کرایے پر دیا جاسکتا ہے۔

کاؤنٹ ہیمن مایوس ہو کر واپس جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ ادھیڑ عمر کی ایک دبلی پتلی عورت نمودار ہوئی۔ معلوم ہوا مالک مکان کی بیوی ہے۔ اس نے ایک عجیب داستان سنائی۔

"آپ مکان کرائے پر لینے کو کہتے ہیں"۔ عورت نے کاؤنٹ سے کہا۔ "مگر یہاں رہنا آپ کے لیے ممکن نہ ہوگا۔ اس میں آسیب کا دخل ہے۔ راتوں کو کسی کے چلنے پھرنے اور قہقہے لگانے کی آوازیں آتی ہیں۔ میرا خاوند بہرا ہے' اسے تو کچھ سنائی نہیں دیتا۔ خوف سے کوئی نوکر نہیں ٹھہرتا۔ سب بھاگ گئے' میں نے بارہا اپنے شوہر سے کہا یہ مکان چھوڑ دو' بیچ دو' ہم کہیں اور رہ لیں گے' مگر یہ

مانتا نہیں۔ مجھے یقین ہے اگر میں اس مکان میں کچھ عرصہ اور رہنے پر مجبور کی گئی تو یہاں سے میرا جنازہ ہی نکلے گا۔"

کاؤنٹ ہیمن نے یہ باتیں دلچسپی سے سنیں' پھر عورت سے پوچھا۔"آپ سے پہلے یہاں کون رہتا تھا؟"

"اجی وہی خبیث سنکی بڈھا۔ میرے شوہر کا چچا تھا رشتے میں۔ سو برس کا ہو کر مرا۔ اس کے مرنے کے بعد ہی تو یہ مکان میرے شوہر کو ملا۔ مدّت دراز تک وہ اور اُس کا ایک خانساماں اِس مکان میں رہے۔ سنا ہے پچھلے حصے کے بہت سے کمرے ہمیشہ بند ہی رہتے۔ یہ دونوں آدمی اگلے حصے کے دو کمرو میں رہا کرتے تھے۔"

مگر کہانی ہے بالکل سچ اور بیان ایسے شخص کا' جس کی اپنے فن میں' عالمگیر شہرت اور سند مسلم ہے۔ کون؟ کاؤنٹ لوئیس ہیمن..... بین الاقوامی شہرت یافتہ ماہرِ نفسیات اور دست شناس.... آپ نہیں پہچانے .... کاؤنٹ لوئیس ہیمن کو آپ کیا' کوئی بھی نہیں پہچانتا۔ البتہ "کیرو" کے نام سے بچہ بچہ آشنا ہے....."کیرو" اِسی کاؤنٹ لوئیس ہیمن کا قلمی نام یا تخلص تھا۔ جسے روحانی علوم' فلکیات اور قدیم مصری سحر سے بڑا شغف رہا۔ موصوف نے مشرقی ممالک کی سیاحت میں اپنی زندگی کا بڑا حصہ صرف کیا اور بیشمار عجیب عجیب چیزیں اور نوادر جمع کرلیے۔ "کیرو" دراصل یونانی لفظ ہے جس کے معنی ہیں انسانی ہاتھ.... اور چونکہ کاؤنٹ ہیمن دست شناسی کے فن میں بھی ماہر تھا' اس لیے "کیرو" کے نام سے شہرت پائی۔

پہلی جنگِ عظیم سے قبل کاؤنٹ ہیمن عرف کیرو نے لندن میں کچھ عرصہ قیام کیا۔ وہ ایسے مکان کی تلاش میں تھا جو لندن جیسے پُرہنگام شہر کے شور و غل سے محفوظ' الگ تھلگ پُرسکون مقام پر ہو۔ چنانچہ مرکزی لندن میں ایک ایسا مکان بالآخر نظر آ ہی گیا۔

یہ درختوں سے گھری ہوئی' سیاہ دیواروں کی ایک عظیم اور نہایت قدیم

عمارت تھی۔ قریباً" دو سو سال پرانی جس کے گرد و پیش خاصا گہرا سناٹا پھیلا ہُوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا مکان مدّت سے خالی پڑا ہے۔ کاؤنٹ ہیمن کو یہ مکان پسند آیا' مگر سوال یہ تھا اسے کرائے پر کیونکر حاصل کیا جائے۔ چند لمحے جائزہ لینے کے بعد کاؤنٹ ہیمن نے جھاڑ جھنکار سے بھرا ہُوا مختصر سا قطعۂ زمین طے کیا اور مکان کے صدر دروازے پر لوہے کی وہ سال خوردہ زنجیر کھینچی جو صدیوں قبل ایسی ہی عمارتوں میں گھنٹی بجانے کے لیے لٹکائی جاتی تھی۔

مکان کے دُور افتادہ گوشے میں گھنٹی بجنے کی ہلکی سی آواز کاؤنٹ ہیمن کے کانوں تک پہنچی۔ چند لمحوں بعد لکڑی کا دروازہ کھلا اور ایک کہن سال شخص کھڑا دکھائی دیا۔ اس کے کپڑے خاصے پرانے اور بوسیدہ تھے۔ الجھی ہوئی سفید ڈاڑھی'

کاؤنٹ ہیمن نے تگ و دو کرکے مکان کرایے پر لے لیا اور چابی' بڈھے مالک مکان سے حاصل کرلی۔ اس کا ارادہ مکان کو اپنی مرضی کے مطابق آراستہ کرنا تھا۔ مشرقی ممالک' خصوصاً" مصر سے جو نوادر اپنے ساتھ لایا تھا، وہ سب ایک خاص ترتیب سے اس مکان میں سجانے کا منصوبہ اس نے بنایا۔ فلاں تابوت اس جگہ رکھا جائے گا۔ فلاں شہزادی کی ممّی اس کمرے میں اچھی رہے گی' فلاں بُت مشرقی راہداری کے سرے پر لگنا چاہیئے اور فلاں مجسمہ دروازے کے قریب ٹھیک رہے گا وغیرہ وغیرہ۔ اب اس نے پورے مکان کا گھوم پھر کر جائزہ لیا۔ بے شک عمارت بہت قدیم اور بڑی مضبوط تھی گو سوبرس کی کہن سالی کا اس نے بظاہر کوئی اثر قبول نہ کیا تھا۔ بس دیواروں پر کہیں کہیں کائی کی گہری تہیں جم گئی تھیں یا بلندو بالا کھڑکیوں کے اکثر شیشے چٹخ گئے یا کسی کسی دروازے کی چولیں ڈھیلی ہوگئی تھیں اور کھولتے بند کرتے وقت ان میں عجیب طرح کی آوازیں نکلا کرتیں .... یا جب مکان کی اونچی چمنیوں کے سُوراخوں میں سے تیز ہوا نکلتی تو سیٹیاں سی بجتیں۔ کاؤنٹ نے خیال کیا شاید یہی آوازیں ہیں جو مکان کے مکینوں کو آسیب اور بھوت بن کر ڈراتی ہیں۔

عمارت کی تمام راہداریاں' زینوں' برآمدوں' غلام گردشوں اور کمروں کا معائینہ کرنے کے بعد کاؤنٹ نے اپنے آپ کو ایک ایسے کمرے میں پایا جس کی فضا پورے مکان کی فضا سے مختلف سی محسوس ہوئی۔ چھوٹا سا یہ کمرہ مکان کی نچلی منزل کے سب سے بوسیدہ اور پرانے حصے میں تھا۔ کمرے کے فرش پر دھول کی کئی انچ موٹی تہ جمی تھی اور اونچی تاریک چھت کے کونوں اور دیمک زدہ کڑیوں پر مکڑیوں نے مہیب جالے تان دیئے تھے۔ دیواروں کا رنگ بالکل سیاہ اور شمالی جانب' ہال کمرے کی طرف کھلنے والی کھڑکیوں کے لمبے بھاری سے پردوں میں جابجا بڑے بڑے سوراخ دکھائی دیئے۔ ایسا معلوم ہوتا ان پردوں کو کیڑے تیز رفتاری سے ہڑپ کر رہے ہیں۔ کمرے میں کوئی فرنیچر نہ تھا۔ بجھے ہوئے آتش دان میں راکھ کا ڈھیر لگا ہُوا تھا اور قریب ہی لوہے کی وہ سلاخ پڑی تھی جس سے کبھی انگارے بھڑکانے یا راکھ کریدنے کا کام لیا جاتا ہوگا۔

کاؤنٹ ہیمن کمرے میں داخل ہُوا تو یک لخت نامعلوم دہشت کی لہر اس کے بدن میں جھکورے لینے لگی۔ آہستہ آہستہ اس کے جسم کا ایک ایک رُو نگھٹا کھڑا ہوگیا۔ اسے احساس ہُوا کوئی اس کمرے کی فضا میں موجود ہے' مگر کون؟ وہ گھبرا کر جلدی سے باہر نکل آیا اور باہر نکلتے ہی دروازہ بند کرکے مقفل کر دیا۔

تھوڑی دیر تک کاؤنٹ ہیمن پر خوف کی یہ کیفیت طاری رہی۔ پھر اسے ایک نفسیاتی اثر سمجھ کر نظرانداز کر دیا۔ پوری عمارت کی سجاوٹ اور مرمت کے لیے ایک مدت درکار تھی۔ کاؤنٹ نے رہنے کے لیے چند کمرے ٹھیک ٹھاک کرانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ متعلقہ افراد کو بلا کر یہ کام سونپ دیا۔ چند دن کے اندر اندر دو کمرے سامانِ آرائش وزیبائش سے تکمیل پاکر تیار ہوگئے اور کاؤنٹ ہیمن اپنے سیکرٹری کے ساتھ ان کمروں میں منتقل ہوگیا۔ اس نے طے کیا کہ اوپر کے کام کاج کے لئے کوئی نوکر نہ رکھا جائے۔ کھانے اور ناشتے کا انتظام کسی ہوٹل سے کرلیا جائے گا۔

کاؤنٹ کے سیکرٹری کا نام پرکنس تھا۔ وہ یارک شائر کا رہنے والا' نہایت مضبوط نڈر اور توانا آدمی تھا۔ مختلف ملکوں میں اپنے آقا کے ساتھ سیاحت پر جاچکا تھا۔ آدمی ہر طرح قابلِ اعتماد اور وفادار۔ اس کی موجودگی میں دراصل کسی اور ملازم کی ضرورت بھی نہ تھی۔ وقت پڑتا تو پرکنس ناشتا اور کھانا پکانا بھی جانتا تھا۔

کاؤنٹ نے اس قدیم عمارت میں منتقل ہونے کے بعد برقی روشنی کا اہتمام کیا۔ یہاں کے ماحول میں پھیلی ہوئی صدیوں پرانی تاریکی دُور ہوئی اور فضا کسی قدر صاف صاف اور بے خطر محسوس ہونے لگی۔ یہ الگ بات کہ برقی روشنی کے باعث بعض اشیا کے سائے مزید بھیانک دکھائی دینے لگے۔

پہلے روز کاؤنٹ اور اس کا سیکرٹری' پرکنس رات دس بجے کھانے سے فارغ ہوکر مکان میں واپس آئے۔ کاؤنٹ کی ہدایت پر پرکنس نے ایک ایک دروازے اور ایک ایک کھڑکی کا معائنہ کیا کہ کھلی تو نہیں رہ گئی۔ اس طرف سے مطمئن

ہونے کے بعد برقی روشنی بند کردی اور شب باشی کے لیے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

کاؤنٹ ہیمن سونے سے پہلے کچھ نہ کچھ پڑھنے کا عادی تھا۔ چنانچہ بستر پر لیٹ کر اس نے برقی لیمپ روشن کیا اور علم فلکیات سے متعلق ایک قدیم مخطوطے کا مطالعہ کرنے لگا۔ گردو پیش میں مکمل خاموشی طاری تھی۔ لندن کی ٹریفک کا شور اس حصے میں بمشکل پہنچ پاتا۔ کاؤنٹ کے تھکے ہوئے اعصاب کے لیے یہ خاموشی بہترین نعمت تھی۔ اس نے عجیب طرح کی ٹھنڈک اپنے دل و دماغ میں محسوس کی، اس احساس کے ساتھ ہی اسے نیند آنے لگی۔ اس نے برقی لیمپ بجھا دیا اور رچت لیٹ کر آنکھیں بند کرلیں۔ ابھی وہ غنودگی کی انتہائی حدوں تک نہ پہنچا تھا اور صریحاً" اپنے ہوش و حواس میں تھا کہ مکان کی اندرونی خاموشی کو چیرتی ہوئی ایک انوکھی آواز اُس کے کانوں میں آئی، وہ ہڑبڑا کر اُٹھا اور اس آواز پر کان لگا دیئے۔

چند لمحوں بعد یہ آواز دوبارہ آئی جیسے کسی نے کمرے کا دروازہ چپکے سے کھولا اور بند کر دیا ہو۔ یہ آواز نچلی منزل میں مکان کے دُور افتادہ اور سب سے قدیم حصے کی جانب سے آئی تھی۔ کاؤنٹ کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ وہ اسی طرح بے حس و حرکت اپنے بستر پر بیٹھا رہا۔ دفعتاً" اس نے نچلی منزل کے فرش پر کسی کو چلتے ہوئے سنا۔ اس کے نپے تلے قدموں کی آواز برابر کاؤنٹ کے کانوں میں آرہی تھی۔ پھر یہ آواز اور قریب آئی.... اور قریب ....اس کے بعد اس نامعلوم ہستی نے سیڑھیوں پر قدم رکھا.... آواز اور نمایاں ہوگئی..... کوئی آہستہ آہستہ قدم دھرتا ہُوا اوپر آرہا تھا۔ دوسری منزل میں ....اس طرف جدھر کاؤنٹ ہیمن اور اس کے سیکرٹری پرکنس کی خواب گاہیں تھیں.... دہشت سے کاؤنٹ کی پیشانی پر پسینے کے قطرے پھوٹنے لگے اور ہاتھوں کی کپکپاہٹ ناقابلِ برداشت ہوگئی۔ اس نے پرکنس کو آواز دینے کے لیے اپنے ہونٹوں کو جنبش دی، مگر حلق سے آواز ہی نہ نکلی..... بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا اور برقی لیمپ روشن کرنے کے لئے سوئچ

کی طرف ہاتھ بڑھایا، مگر یہ سوچ کر رُک گیا کہ آنے والے کی توجہ روشنی کی طرف مبذول ہو جائے گی۔ وہ روشنی جو دروازے کی نچلی درز میں نظر آسکتی ہے۔

قدموں کی پُراسرار آواز ٹھیک اس کے کمرے کے دروازے پر یک لخت پہنچ کر تھم گئی۔ کاؤنٹ نے خیال کیا، بد روحیں یا آسیب اس طرح نہیں آیا کرتے۔ یہ ضرور کوئی آدمی ہے ..... اس دنیا کی مخلوق۔ یہ خیال آتے ہی وہ بستر سے اٹھا اور آتش دان کے قریب رکھی ہوئی لوہے کی وزنی سلاخ ہاتھ میں پکڑلی۔ مگر یہ کیا؟ دروازہ ہلا، پہلے آہستہ سے، پھر بہت زور سے ..... جیسے زلزلہ آیا ہو..... اس کے بعد گہری خاموشی..... جس میں کاؤنٹ اپنے دل کے دھڑکنے کی صدا بخوبی سن سکتا تھا..... پھر یک لخت دستک کی آواز .... جیسے کوئی آہستہ آہستہ دروازے کو تھپتھپا رہا ہو..... کاؤنٹ کے ہاتھوں میں جمی ہوئی لوہے کی وزنی سلاخ رعشے کے باعث چھوٹ کر قالین پر گر گئی۔ اب بڈھے مالک مکان کی بیوی سے سنی ہوئی باتیں اسے یاد آئیں..... کیا واقعی یہ کوئی آسیب ہے؟ اس نے جلدی سے برقی لیمپ کا بٹن دبا دیا۔ کمرے میں تیز روشنی پھیل گئی..... روشنی نے اس کے قلب کو کسی قدر تقویت دی۔ اس نے قالین پر گری ہوئی لوہے کی سلاخ دوبارہ اٹھائی اور ایک عزم کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھا۔ اس کی زندگی میں بے شمار ایسے واقعات آئے تھے بلکہ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز، پُراسرار اور ہیبت ناک اور وہ ان سب سے اچھی طرح نمٹ چکا تھا..... چنانچہ کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ خوف کھاتا۔

دستک کی آواز ایک بار پھر بلند ہوئی۔ دوسرے ہی لمحے کاؤنٹ نے آگے بڑھ کر بائیں ہاتھ سے دروازے کی زنجیر ہٹا دی اور ایک جھٹکے سے دونوں کواڑ کھول دیئے۔

برآمدہ ویران اور سنسان پڑا تھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ کاؤنٹ نے دائیں بائیں خُوب غور سے دیکھا، کسی ذی روح کے آثار نہ تھے۔ ہر طرف گہری خاموشی اور جان لیوا سناٹا مسلّط تھا۔ دہشت کی ایک نئی لہر اس کے بدن میں دَوڑ گئی۔ وہ پتھر

کے بُت کی مانند خاموش کھڑا دروازے کو تک رہا تھا۔

یکایک اس کے سر کے عین اُوپر دروازے کی چوکھٹ کے پاس ویسی ہی آو
پھر بلند ہوئی جیسے کوئی چوکھٹ کو کھٹکھٹا رہا ہو۔ یہ آواز اس کے اتنی قریب تھی
کاؤنٹ کے حلق سے خوف کے مارے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس نے جھپٹ
دورازہ دھماکہ سے بند کیا۔ ایسا دھماکہ جس کی آواز سے پوری عمارت گونج اُٹھی
دروازہ بند کرکے اس نے زنجیر چڑھا دی اور اپنے بستر پر آکر بیٹھ گیا۔ اس کا بد
پوری طرح کانپ رہا تھا۔

وہ ساری رات اسی طرح بستر پر بیٹھا بند دروازے کو تکتا رہا، مگر پھر کو
آواز نہ آئی۔ برقی لیمپ تمام رات جلتا رہا اور جب مشرقی اُفق کی روشنی کھڑکیو
کے روشندانوں سے کھیلنے لگی، تو کاؤنٹ نے اپنی جیبی گھڑی پر وقت دیکھا۔ سو
نکلنے ہی والا تھا، پوری رات آنکھوں میں کٹ گئی تھی۔ اس نے لیمپ بجھایا ا
بستر پر آرام سے لیٹ گیا۔ اس نے سوچا اگر واقعی اس عمارت میں کوئی بدرُ
ہے تو زندگی مزے سے گزرے گی۔ وہ چونکہ ماہرِ نفسیات تھا، اس نے سوچا یہ
تو ممکن ہے کہ یہ سب میرے تصورات وخیالات کی شعبدہ گری ہو۔ ایسا ہونا بالکل
ممکن ہے۔ ہم جن چیزوں کے بارے میں سنتے ہیں، خواہ وہ فرضی ہوں، مگر
انہیں دیکھ بھی سکتے ہیں۔ شعور اور لاشعور کی دنیائیں بے انتہا وسیع ہیں .....
جب ناشتے کے لیے وہ اور اس کا سیکرٹری شہر کے اندرونی حصے میں واقع ا
ریستوران میں گئے اور میز پر بیٹھے، تو پرکنس نے چھوٹتے ہی کہا۔

"جنابِ والا، رات آپ نے وہ آوازیں سنی تھیں جیسے کوئی شخص مکان
گھوم پھر رہا ہو..... یا دروازوں پر دستک دے رہا ہو..... یہ میرا وہم ہرگز
ہوسکتا اور نہ یہ کوئی خواب تھا۔ میں نے عین بیداری کے عالم میں آوازیں
کانوں سے سنی ہیں۔ کہیئے آپ کیا فرماتے ہیں؟"

"آہ..... تو یہ وہم ہرگز نہیں تھا اور نہ انسانی شعور یا لاشعور کی شعبدہ گر
کاؤنٹ ہیمن نے سوچا۔ پرکنس نے بھی وہی آوازیں سنی ہیں جو میرے کانوں

پہنچیں۔

"بے شک..... میں نے بھی ایسی آوازیں سنی تھیں"۔ کاؤنٹ نے اقرار کیا۔ یہ سن کر پرکنس کا رنگ فق ہوگیا۔ اس نے نوالہ واپس پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"جنابِ والا، میں ان بھوتوں سے عاجز آچکا ہوں۔ خدا کے لیے مجھے اجازت دیجئے میں رات کہیں اور جاکر سوجایا کروں۔ اس طرح زندگی حرام کرنے کا فائدہ؟"

کاؤنٹ کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے کہا۔

"پرکنس تم بزدل ہوتے جارہے ہو۔ بھلا بدرُوحیں ہمارا کیا بگاڑ سکتی ہیں؟ ہم اس سے زیادہ خطرناک حالات سے دوچار رہ چکے ہیں..... مصر کی مہمیں یاد کرو۔ تین ہزار سال پہلے کی مصری شہزادی کا وہ کٹا ہوا ہاتھ تم اب تک نہ بھولے ہوگے جو مجھے ایک عرب شیخ نے دیا تھا..... اور جس کے بھیانک کرشمے ہم دونوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں..... یہ مکان تو ہم لے چکے اور اس کی آرائش پر خاصا روپیہ بھی صرف ہوچکا، اب یہاں سے بھاگنا بے وقوفی ہوگی۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ اس بدروح سے کسی طرح دوستی کرلی جائے۔ ہم بھی یہاں رہیں، وہ بھی رہے"۔

پرکنس نے حیرت سے کاؤنٹ کو دیکھا اور بڑی مشکل سے غصہ ضبط کرتے ہوئے بولا۔ "جنابِ والا، یہ مکان ہرگز ہرگز رہنے کے قابل نہیں ..... مالک مکان سے کہیئے کہ وہ کرایہ واپس کرے اور ہم اپنا سامان یہاں سے اٹھائیں اور اگر وہ کرائے کی رقم واپس نہ کرے، تو قانون کا سہارا لیجئے۔ باقی رہا بدرُوح سے دوستی کرنے کا خیال تو میں کیا عرض کروں۔ ایسا انوکھا خیال جناب ہی کے ذہنِ مبارک میں آسکتا ہے۔ آج تک میں نے نہیں سنا کہ کسی انسان نے بہ ہوش و حواس بدرُوح سے دوستی پیدا کی ہو"۔

"مالک مکان سے کرایہ واپس نہیں لیا جاسکتا"۔ کاؤنٹ نے کہا۔ "اس کی

بیوی نے مجھے پہلے ہی بتادیا تھا مکان میں کچھ گڑ بڑ ہے' لہٰذا ان کا کوئی قصور نہیں اور نہ انہوں نے ہمیں دھوکے میں رکھا۔ مجھے بہرحال مکان پسند ہے اور میں یہاں سے جانا نہیں چاہتا۔ بلکہ یوں کہو کہ اس وقت تک جانا نہیں چاہتا جب تک اس آسیب کا معما حل نہ کرلوں"۔

"خواہ یہ معمہ حل کرنے میں' خدانخواستہ ہم میں سے کسی ایک کی جان جاتی ہے؟" اس جملے پر کاؤنٹ ہیمن ہنس پڑا۔

"اطمینان رکھو پرکنس' آج تک کسی آسیب نے انسان کو قتل نہیں کیا"۔ پرکنس نے جب دیکھا کہ اس کا آقا مکان چھوڑنے کا ارادہ نہیں رکھتا تو طوہاً" وکرہاً" اسے بھی ساتھ دینا پڑا۔ رات ہوئی تو وہ بھی اپنی خواب گاہ سے اٹھ کر کاؤنٹ ہی کے کمرے میں آگیا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ یہ رات آرام کرسیوں پر جاگ کر گزاری جائے۔ انہوں نے آتش دان میں آگ روشن کردی اور ڈھیر ساری لکڑیاں جھونک دیں تاکہ آگ برابر جلتی رہے۔ اس کے بعد انہوں نے تیل سے جلنے والا چولہا قریب ہی رکھ لیا۔ عمدہ قہوے کا ڈبہ اپنے تھیلے سے نکالا اور چولہا جلاکر پانی کی کیتلی چڑھا دی۔ نیند کو بھگانے کے لیے گرم اور خشک قہوے سے بہتر کوئی اور چیز نہیں ..... آسیب سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے انہوں نے اپنے دائیں بائیں آتش دان میں آگ کریدنے کی آہنی سلاخیں رکھ لی تھیں' اگرچہ کاؤنٹ کو یقین تھا کہ ان سلاخوں سے کام لینے کی ضرورت نہ پڑے گی۔

ان دونوں کو ایک دوسرے کی موجودگی سے خاصا اطمینان تھا۔ کمرے کے اندر برقی بلب روشن تھا اور دوسرے حصوں میں روشنی کے لیے جو بلب لگائے گئے تھے' انہیں جلانے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی تھی۔ رات آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔ مکان میں ہیبت ناک خاموشی اور تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ یہ دونوں بھی چپ چاپ بیٹھے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ ٹھیک بارہ بجے نچلی منزل میں کسی دروازے کے کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ دونوں آدمیوں نے جلدی سے لوہے کی سلاخیں ہاتھوں میں تھام لیں اور سنبھل کر بیٹھ گئے۔ پھر انہوں نے

سنا کہ کوئی آہستہ آہستہ سیڑھیوں پر قدم رکھتا ہُوا اوپر آیا۔ بلاشبہ یہ قدموں کی آواز تھی۔ یہ آواز کاؤنٹ ہیمن کے کمرے کے باہر آکر رُکی ..... پھر دروازہ جنبش میں آیا جیسے اسے کوئی دھکا دے کر کھولنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کے بعد تین بار دستک دی گئی۔ یہ دونوں دم سادھے بیٹھے رہے۔ پھر باہر برآمدے میں لگا ہُوا بجلی کا سوئچ دبانے کی آواز آئی۔ یقیناً" باہر کا بلب جلایا گیا تھا۔

"جناب' میں شرط لگاتا ہوں بھوت وَوت ہرگز نہیں ہے"۔ پرکنس نے دبی آواز میں کہا۔" بھوت کبھی مکانوں میں لگے ہوئے برقی قمقموں کے سوئچ نہیں دبایا کرتے وہ تو روشنی سے بھاگتے ہیں اور تاریکی کو محبوب رکھتے ہیں۔ یہ بھوت ہرگز نہیں' معلوم ہوتا کوئی اُچکا ہے۔ میں ابھی اس بدمعاش کا سرتوڑتا ہوں"۔ یہ کہہ کر وہ اٹھا اور دروازہ کھول دیا' پھر اس نے لوہے کی سلاخ اس انداز میں اٹھائی جیسے متوقع حملے کا جواب دینا چاہتا ہے مگر..... برآمدہ سنسان پڑا تھا... باہر کا قمقمہ روشن ہونے سے ہر طرف اُجالا پھیل گیا تھا۔ سیڑھیاں صاف نظر آرہی تھیں' لیکن وہاں کوئی نہ تھا ..... آس پاس کہیں ایسی جگہ نہ تھی انسان تو ایک طرف' بلی کا بچہ چھپ سکے ..... پھر یہ کیا اسرار ہے ..... پرکنس کی آنکھیں خوف سے اُبلنے لگیں اور اس کا وہ ہاتھ بُری طرح لرز اٹھا جس ہاتھ میں اس نے آہنی سلاخ پکڑ رکھی تھی۔

"خدا کی پناہ..... یہاں تو کوئی نہیں ..... مگر دیکھئے ہال کمرے کی بتیاں بھی جل رہی ہیں' حالانکہ ہم نے یہ بتیاں ہرگز نہیں جلائیں ..... میں کہتا ہوں ضرور اس منحوس مکان میں کوئی موجود ہے جو ہم سے یہ شعبدے بازی کررہا ہے"۔ پرکنس ہانپتے ہوئے بولا۔

"آؤ نیچے چلیں۔" کاؤنٹ نے خوف دُور کرنے کے لئے ذرا بلند آواز میں کہا۔

"تعجب ہے اگر یہ کوئی بھوت ہے' تو اسے برقی قمقمے روشن کرنے سے بھلا کیا ملے گا"۔ پرکنس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔"بخدا میں نے کسی کے سیڑھیاں

چڑھنے کی آواز سنی ہے۔ آخر وہ گیا کہاں! کیا یہاں کوئی چور راستہ ہے؟"

جب وہ نچلی منزل کے ہال کمرے میں داخل ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ وہاں لگے ہوئے دونوں برقی قمقمے روشن ہیں۔ ہال کمرے کی بائیں جانب ڈرائنگ روم تھا۔ وہ خود اس کا دروازہ بند کرکے آئے تھے' مگر اب وہ دروازہ پورا کھلا تھا اور کمرے کے اندر تاریکی تھی۔ اس کمرے کے اندر بھی تین برقی بلب لگائے گئے تھے' جن کے تین سوئچ دروازے کے قریب ہی لگے تھے۔ ان دونوں کی آنکھوں کے عین سامنے یہ تینوں سوئچ یکے بعد دیگرے آپ ہی آپ اوپر سے نیچے ہوگئے' تینوں بلب روشن ہوئے اور کمرہ روشنی میں نہاگیا۔ اب انہوں نے خیال کیا کہ یہ ضرور کسی کی شرارت ہے اور یقیناً" ڈرائنگ روم میں کوئی نہ کوئی چھپا بیٹھا ہے' مگر انہوں نے کمرے کا کونا کونا اور گوشہ گوشہ دیکھ ڈالا۔ وہاں کوئی نہ تھا اور نہ ایسے آثار نظر آئے جن سے پتا چلتا کہ کوئی شخص یہاں داخل ہُوا ہے۔ ان دونوں کے پیروں کی نشانات کے سوا فرش پر کوئی نشان نہ تھا۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ جس کاریگر نے بجلی کے یہ قمقمے اور تار فٹ کیے' اسی نے کوئی چالاکی کی ہو"۔ پرکنس نے کہا۔ ابھی کاؤنٹ جواب میں کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ کمرے کی فضا میں ایک انسانی قہقہے کی آواز گونجی۔ یہ آواز ان کے بالکل قریب سے آئی تھی۔ انہوں نے دہشت زدہ ہوکر اِدھر اُدھر دیکھا' مگر ان کے علاوہ وہاں تیسرا کوئی نہ تھا۔ ایک بار پھر ان کے بہت قریب سے ہنسنے کی آواز آئی۔ اب ان کے اُوسان خطا ہوئے۔ وہ چیختے ہوئے وہاں سے بھاگے اور پاگلوں کی طرح سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اپنے کمرے میں آن کر پناہ لی۔ جب انہوں نے دروازہ بند کرکے لوہے کی زنجیر چڑھائی تو دونوں بری طرح ہانپ رہے تھی اور فرطِ خوف سے ان کی گھگی بندھی ہوئی تھی۔

رات کا بقیہ حصہ انہوں نے آتش دان کے پاس چپ چاپ بیٹھ کر کاٹ دیا۔

صبح ہوئی تو وہ کمرے سے نکلے۔ ہال اور ڈرائنگ روم میں برقی بتیاں ابھی

تک روشن تھیں۔ انہوں نے ڈرتے ڈرتے بتیاں بجھائیں اور سوچنے لگے ا
پُراسرار صورتِ حال سے کیسے نمٹا جائے۔ پہلے تو پرکنس کی بھی رائے یہ تھی
مکان چھوڑ کر چلے جانا چاہئے، مگر کاؤنٹ ہیمن از حد سنجیدہ دکھائی دے رہا تو
اس نے اعلان کیا خواہ کچھ ہو' اس راز سے پردہ اٹھنا ہی چاہئے۔ دوپہر کو جب
کھانا کھانے لگے تو اعلیٰ نسل کے کتے فروخت کرنے والی ایک دکان سے ٹیر
نسل کا ایک کتا بھی خرید کر ساتھ لے آئے۔ کاؤنٹ ہیمن کا کہنا تھا اگر اس م
میں آسیب یا بد رُوح ہے تو کتے کو فوراً" پتا چل جائے گا۔ کتے یا بلیاں اس
کے احساسات رکھتے ہیں اور غیر مرئی مخلوق کی موجودگی کا انہیں علم ہو جاتا ہے۔

شام ہوتے ہی انہوں نے کتے کی زنجیر پکڑی اور اسے مکان کے مختلف حص
میں گھمانے پھرانے لگے۔ وہ اسے ہر کمرے' ہر برآمدے اور ہر راہداری میں
گئے۔ کتے نے کسی قسم کی تیزی' تندی' خوف یا دہشت کا مظاہرہ نہ کیا۔ آخر
وہ نچلی منزل کے ایک چھوٹے سے کمرے کے قریب رکے۔ دروازہ بند اور اس
لوہے کا بھاری قفل پڑا تھا۔ کاؤنٹ ہیمن نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا اور
باری باری ہر کنجی اس پر آزمانے لگا۔ آخر تالا کھل گیا اور کاؤنٹ نے اندر قد
رکھا۔ اندر سخت اندھیرا تھا' کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ پرکنس نے ماچس کی تیلی جلا
اور خود بھی کمرے میں داخل ہوگیا۔ اس نے کتے کی زنجیر کھینچی تاکہ وہ بھی کمر
میں آجائے' لیکن کتا منہ سے عجیب و غریب آوازیں نکالتا ہُوا زمین پر لیٹ گیا
پرکنس کی حد درجہ کوشش کے باوجود کمرے میں داخل نہ ہُوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے
کی حالت میں اتنا عظیم تغیر رونما ہُوا کہ وہ حیران رہ گئے۔ اس کے جسم کا رو
رواں کانپ رہا تھا۔ وہ خوف سے زمین پر لوٹا جاتا تھا اور اس کے حلق سے گھ
گھٹی آوازیں نکل رہی تھیں۔ خود کاؤنٹ ہیمن کے بدن کے رونگٹے بھی کھڑ
ہو رہے تھے اور دل کی دھڑکن یک لخت تیز ہوتی جارہی تھی۔ اس نے پرکنس
باہر نکلنے کا اشارہ کیا' خود بھی جلدی سے باہر آیا اور دروازہ بند کرکے قفل لگا
پھر وہ اپنے مخصوص کمرے میں آگئے۔ کتا ان کے پیچھے پیچھے اب بھی دم ہلا

میں دبائے خوف سے کانپتا اور گھگیاتا ہُوا آرہا تھا۔

"بولو اب کیا کہتے ہو؟" کاؤنٹ نے سیکرٹری سے پوچھا۔ "تم نے کتے کی حالت دیکھی؟"

پرکنس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے چہرے پر خوف' حیرت اور تشویش کے ملے جلے تاثرات پھیلے ہوئے تھے۔ اس نے قہوے کے دو پیالے بنائے۔ ایک اپنے آقا کی طرف بڑھایا اور دوسرا اپنے سامنے رکھا۔ کتا اس کے قدموں میں گردن نیہوڑائے خاموش بیٹھا تھا۔

"اس کمرے میں ضرور کچھ ہے"۔ بالآخر پرکنس نے زبان کھولی۔ "کل دن کے وقت ایک بار پھر ہم' کتے کو اس کمرے میں لے جانے کی کوشش کریں گے"۔

وہ رات بھی انہوں نے آرام کرسیوں پر بیٹھے بیٹھے کاٹ دی۔ ان کا خیال تھا آدھی رات کے بعد حسبِ معمول بد رُوح کی آمد ہوگی' مگر ایسا نہ ہُوا۔ بھوت غالباً" انہیں مکان میں اپنی موجودگی کا احساس دلانا چاہتا تھا اور اب اس نے سوچا ہوگا' باربار انہیں کیوں پریشان کیا جائے۔

دن نکلا' تو پرکنس اور کاؤنٹ ہیمن نے ایک بار پھر کتے کو اس کمرے میں لے جانے کی کوشش کی۔ پہلے تو وہ اسے لئے مکان کے مختلف گوشوں میں گھومتے رہے اور کتا خوف کی کسی علامت کا اظہار کیے بغیر مزے سے ان کے ساتھ چلتا رہا' لیکن جونہی وہ نچلی منزل کے اس چھوٹے سے کمرے کے قریب پہنچے' کتے کے بدن پر لرزہ طاری ہوگیا۔ اس نے دم ٹانگوں میں دبالی اور ٹیاؤں ٹیاؤں کرتا ہُوا بڑی عاجزی سے زمین پر لیٹ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بلائے عظیم اس نے دیکھ لی ہو۔ جونہی پرکنس نے پٹا اس کی زنجیر سے نکالا' کتا بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی مانند وہاں سے بھاگا اور مکان سے باہر نکل گیا۔

دوپہر کو کھانے سے فارغ ہوکر جب مالک اور نوکر مکان میں واپس آئے' تو اس مرتبہ ان کے ساتھ ایک چتکبری بلی تھی۔ پرکنس نے اسے گود میں اٹھا رکھا

تھا۔ مکان کے مختلف حصوں میں گھوم پھرکر جب وہ اس مخصوص کمرے کے نزدیک پہنچے تو بلی کے جسم کے بال یک لخت کھڑے ہوگئے اور وہ پھول کر عام جسامت سے دُگنی موٹی دکھائی دینے لگی۔ اس کی مونچھوں کے بال بھی کھڑے تھے۔ لمبی دُم آہستہ آہستہ حرکت کرنے لگی۔ کاؤنٹ ہیمن نے دروازے کا قفل کھولا اور پرکنس نے بلی کو کمرے کے اندر پھینک دیا۔ ایک ہولناک چیخ مار کر بلی کمرے سے باہر نکلی اور چشم زدن میں نظروں سے غائب ہوگئی۔

ان تجربات سے واضح ہوگیا کہ کچھ نہ کچھ ہے ضرور۔ اگر کوئی انسانی شعبدے بازی ہوتی تو کتے اور بلی کا یوں خوف زدہ ہوکر راہِ فرار اختیار کرنا ممکن نہ تھا۔ پرکنس اب بہت خوف زدہ تھا اور بار بار کاؤنٹ سے یہی کہتا۔ "اب تو آپ نے خود دیکھ لیا کہ مکان واقعی آسیب زدہ ہے' لہٰذا یہاں رہنے کا ارادہ ترک کیجئے۔ لندن میں خالی مکانوں کی کمی نہیں۔ کیا ضروری ہے ہم ایک آسیب کے ہاتھوں نقصان اٹھاکر یہاں سے نکلیں۔"

پرکنس کے دلائل ایسے نہ تھے کہ انہیں رَد کیا جاسکتا' لیکن کاؤنٹ ہیمن کی مہم جو طبیعت سے بہت بعید تھا کہ ایک بدرُوح سے کھلے بندوں شکست کھالی جائے۔ اسی روز سہ پہر کے بعد کاؤنٹ کا ایک پرانا دوست ہنری ہملٹن ملاقات کے لیے آیا۔ یہ تھیٹر کا مشہور و معروف ڈرامہ نویس تھا۔ اس نے چھوٹتے ہی کہا۔

"یہ مکان تو برسوں سے آسیب زدہ ہے اور یہاں کسی انسان کا بہ ہوش و حواس رہنا مشکل ہے۔ بہت دنوں کی بات ہے میرے ایک خبطی دوست نے چند روز کے لیے یہ مکان لیا تھا' مگر تین دن بعد ہی پاگل ہوکر بھاگ گیا۔ راتوں کو کوئی نامعلوم ہستی دروازوں پر دستک دیتی ں' سیڑھیاں چڑھنے اور اترنے کی آوازیں سنائی دیتیں' کبھی کبھی ہنسنے' گانے اور رونے کی آوازیں بھی آیا کرتیں۔"

"کیا تم نے بھی کبھی یہ آوازیں سنی تھیں؟" کاؤنٹ نے پوچھا۔

"کیوں نہیں؟ مجھے خود ایک رات اس مکان میں کاٹنے کا اتفاق ہُوا۔ شاید کہ

کمرہ تھا جس میں اس وقت ہم لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ آدھی رات کے بعد کسی نے دروازے پر دستک دی۔ میں سمجھا شاید میرا کوئی دوست ہے جس نے مکان لیا تھا اور جو میرا میزبان تھا۔ میں نے اُٹھ کہ دروازہ کھولا' تو وہاں کوئی نہ تھا۔ ابھی میں اِدھر اُدھر دیکھ ہی رہا تھا کہ دروازے پھر کسی نے تھپتھپایا۔ اب تو میرے ہوش اڑے۔ دروازہ تھپتھپانے والا نظر نہ آتا تھا' البتہ آواز رہ رہ کر بدستور آرہی تھی اور کواڑ بھی ہل رہا تھا۔ آخر میں نے ہمت کرکے کہا۔ 'تم کون ہو؟ اور کیا چاہتے ہو۔' مجھے اس سوال کا فوراً" جواب ملا۔"

"کیا جواب تھا وہ؟" کاؤنٹ نے ازحد اشتیاق سے پوچھا۔

ہنری ہملٹن نے قلم' کاغذ اور لفافہ طلب کیا۔ تینوں چیزیں اسے دی گئیں۔ اس نے کاغذ پر کچھ لکھا اور لفافے میں بند کرکے کاؤنٹ کی طرف بڑھایا۔ "وہ جواب میں نے اس پرچے میں لکھ دیا ہے۔ تم خود بھی اس رُوح سے اس کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کرو اور جو کچھ جواب وہ دے' اس کا مقابلہ میری تحریر سے کرو۔ میرا خیال ہے ان دونوں جوابوں میں کوئی خاص فرق نہ ہوگا"۔

کاؤنٹ ہیمن نے یہ طریقہ پسند کیا اور وعدہ کیا کہ ایسا ہی کیا جائے گا۔

اس کے بعد کئی ہفتے امن اور سکون سے گزر گئے۔ راتوں کو روح کا چلنا پھرنا اور دروازے پر دستک دینا موقوف رہا۔ شاید اس نے سمجھ لیا تھا یہ لوگ اس مکان سے جانے والے نہیں۔

ایک رات کاؤنٹ نے چند دوستوں کو رات کے کھانے پر بلایا۔ کھانے سے فارغ ہوکر سب لوگ ڈرائنگ روم میں آتش دان کے پاس آن بیٹھے اور قہوہ پیتے ہوئے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ گفتگو زور و شور سے جاری تھی کہ یکایک میز پر رکھا ہُوا شیشے کا ایک خوبصورت اور نہایت قیمتی پیالہ آپ ہی آپ کھنکنے لگا۔ گفتگو ایک دم رک گئی اور ہر شخص سہمی ہوئی نگاہوں سے پیالے کو بجتے ہوئے دیکھنے اور سننے لگا۔ یقیناً" کوئی غیر مرئی ہستی اس پیالے کے ذریعے اپنا پیغام

دینا چاہتی تھی۔ کاؤنٹ ہیمن نے دوستوں سے کہا۔

"براہِ کرم سب لوگ کسی خوف کے بغیر اسی طرح بیٹھے رہیں۔ یہ ہمارے ایک دوست کی روح ہے جو اس مکان میں ہمارے ساتھ رہتی ہے اور غالباً کچھ کہنے کے موڈ میں ہے"۔ یہ کہہ کر اس نے جلدی سے کاغذ سامنے رکھا اور پنسل پکڑلی۔ پھر نا معلوم ہستی کو خطاب کرتے ہوئے کہا۔

"ہم سب آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں اور جاننا چاہتے ہیں' آپ کی خواہش کیا ہے۔ اس کا طریقہ یہ مناسب رہے گا کہ میں انگریزی زبان کے تمام حروفِ تہجی باری باری بولتا جاؤں اور آپ جن حرفوں کے ذریعے اپنا پیغام دینا پسند کریں' ان حرفوں کا نام آتے ہی پیالے کو بجا دیں"۔

جملہ ختم ہوا۔ کمرے میں چند لمحے خاموشی طاری رہی' پھر ہیمن نے بلند آواز میں حروف تہجی کی تکرار شروع کی اور روح نے پیالے کو مختلف حرفوں کے نام پر بجانا شروع کر دیا۔ چند لمحوں کے اندر اندر ایک واضح پیغام ان کے سامنے تھا۔

"میرا نام کارل کلنٹ ہے۔ میں اس مکان میں گذشتہ ایک سو بیس برس سے رہ رہا ہوں، اگر آپ لوگ نچلی منزل کے چھوٹے کمرے میں چلیں' تو میں اپنی بات زیادہ واضح انداز میں عرض کر سکوں گا"۔

بعض لوگ چھوٹے کمرے میں جانے کے لیے فوراً آمادہ ہوگئے جبکہ بعض کا کہنا تھا' ایسا کرنا حماقت ہوگی۔ بھلا ایک سو بیس برس پرانی بَد رُوح کا کیا اعتبار؟ ممکن ہے وہ کسی نوع کا نقصان ہی پہنچادے' لیکن کاؤنٹ ہیمن کو اصرار تھا کہ ایسا نہ ہوگا۔ اگر روح کسی نوع کا ضرر پہنچانے پر قادر ہوتی' تو اب تک پہنچا بھی چکتی اور اتنی مدت تک انتظار نہ کرتی۔ غرض یہ سب لوگ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے تجسّس' خوف اور تعجب کے مراحل سے گزرتے ہوئے نچلی منزل کے اُس چھوٹے کمرے کے قریب پہنچے جہاں جانے سے کتے اور بلی نے خوف کھایا تھا۔ کاؤنٹ ہیمن نے قفل کھولا اور سب اندر داخل ہوئے۔ اس کمرے کی فضا میں عجیب سی مرطوب بَد بُو پھیلی ہوئی تھی۔ ایسی بدبُو جیسی کسی پرانی بوسیدہ قبر کی مٹی

میں سے آیا کرتی ہے۔ انہوں نے کمرے کے اندر ایک چھوٹی میز بچھائی اور رائٹر کی صورت میں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ پرکنس نے چند موٹی شمعیں جلانے کے لئے ساتھ لے لی تھیں' یہ شمعیں فوراً" روشن کر دی گئیں۔ اس کے بعد سب لوگ چپ چاپ روح کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔

دفعتہ" میز پر سے ایسی آواز اٹھی جیسے کسی نے آہستہ سے گھونسا مارا ہو۔ پھر یکے بعد دیگرے کئی آوازیں آئیں اور ہر آواز پہلی آواز سے زیادہ تیز تھی۔ لکڑی کی میز بری طرح کانپنے اور تھرتھرانے لگی اس کے فوراً" بعد روح نے جو پیغام دیا وہ یہ تھا۔

"میرا نام کارل کلنٹ ہے۔ میں اس مکان کا مالک ہوں۔ میں نے اپنے ایک دوست آرتھر لڈل کو اسی کمرے میں قتل کیا اور اس کی لاش یہیں فرش کھود کر دبادی"۔

کاؤنٹ نے لرزتی آواز میں کہا۔

"ہم لوگ آپ کے لیے کیا کر سکتے ہیں کارل کلنٹ؟"

جواب ملا۔ "کچھ نہیں"۔

"ہم تمہاری بخشش اور نجات کے لیے خدا سے دعا تو کر سکتے ہیں؟"

"مجھے تمہاری دعاؤں کی ضرورت نہیں"۔ جواب ملا۔ "ہاں' تم صرف یہ کر سکتے ہو کہ یہ مکان خالی کر کے چلے جاؤ اور مجھے یہاں رہنے دو"۔

"تم خود ہی یہاں سے کیوں نہیں چلے جاتے کارل کلنٹ؟" کاؤنٹ ہیمن نے کہا۔ یہ جملہ بمشکل اس کی زبان سے ادا ہوا تھا کہ کمرے میں جیسے بھونچال آگیا۔ میز الٹ گئی۔ دیواریں لرزنے لگیں۔ چوبی چھت سے چرچر کی ایسی آواز آئی جیسے ابھی چھت آن پڑے گی اور فوراً" ہی جلتی ہوئی شمع گل ہوگئی ان لوگوں پر اتنی دہشت طاری ہوئی کہ سب بے تحاشا گرتے پڑتے وہاں سے بھاگے اور ڈرائنگ روم میں آکر دم لیا۔

دوستوں کو رخصت کر دینے کے بعد کاؤنٹ ہیمن نے ہنری ہملٹن کا دیا ہوا

لفافہ چاک کر کے کاغذ نکالا اور اسے پڑھا۔ اس پر جو الفاظ درج تھی ان میں اور روح کے موجودہ پیغام میں ایک حرف کا بھی فرق نہ تھا۔ کاؤنٹ ہیمن نے طے کیا کہ وہ اس عمارت اور اس کے مکینوں کی قدیم تاریخ کا سراغ لگا کر رہے گا تاکہ اس معمے کی تہ تک پہنچا جاسکے' چنانچہ اگلے ہی روز اس نے اپنی تحقیق و تفتیش کا آغاز کیا..... مکانوں کی تعمیر کا ریکارڈ محفوظ رکھنے والے دفتر کا رخ کیا' متعلقہ مکان کے کاغذات نکلوائے معلوم ہوا کسی زمانے میں یہ مکان ایک چھوٹا سا فارم ہاؤس تھا اور فارم ہاؤس میں وہ چھوٹا سا کمرہ بھی شامل تھا' جس میں روح نے انہیں بلا کر پیغام دیا تھا۔ مزید تفتیش سے یہ بات بھی ریکارڈ کے ذریعے سامنے آگئی کہ اس فارم ہاؤس کا مالک کارل کلنٹ نام کا ایک جرمن شخص تھا۔ جس کا قیام ۱۷۴۰ء اور ۱۸۰۰ء کے درمیانی عرصے میں اس مکان میں رہا۔ کارل کلنٹ کا ایک انگریز دوست آرتھر لڈل' اکثر اس مکان میں آکر رہا کرتا۔ ان دونوں میں خاصی گہری دوستی اور بے تکلفی تھی' پھر اچانک ایک روز آرتھر غائب ہوگیا۔ پولیس اور دوسرے لوگوں کی سرتوڑ کوشش کے باوجود آرتھر کا سراغ نہ ملا۔ کارل کلنٹ سے بھی پوچھ گچھ کی گئی' مگر اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اسے تو خود اپنے دوست کے گم ہو جانے کا شدید صدمہ تھا۔

آرتھر کی گمشدگی کے چند سال بعد کارل کلنٹ اس مکان سے رخصت ہوگیا اور اس نے ایک دوسرے مکان میں سکونت اختیار کر لی۔ اس کے جانے کے بعد یہ مکان مختلف ہاتھوں میں آیا' بار بار بکا اور خریدا گیا۔ ہر آنے والے نے اس میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہی کیا۔ حتیٰ کہ انسویں صدی کے اختتام تک اس مکان کے نواح میں جو کھیت واقع تھے' وہ سب غائب ہوگئے اور ان کی جگہ مکان بنتے چلے گئے۔

کاؤنٹ ہیمن کو اب سب کچھ معلوم ہو چکا تھا' لیکن اس رات کے بعد سے کارل کلنٹ کی روح نے اسے پریشان نہیں کیا۔ کاؤنٹ کا خیال تھا شاید اس کی روح نے مایوس ہوکر مکان کا وہ کمرہ خالی کر دیا ہے۔ تاہم کاؤنٹ نے وہ کمرہ مقفل

ہی رہنے دیا' لیکن ایک رات کاؤنٹ ہیمن آرام سے اپنے بستر میں لیٹا گہری نیند کے مزے لے رہا تھا کہ دروازے پر زور سے دستک دی گئی۔ کاؤنٹ ہیمن کی آنکھ کھل گئی اور اس نے دستک کی آواز پھر کئی مرتبہ سنی اور جب اٹھ کر دروازہ کھولا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ روح ابھی تک مکان میں موجود ہے۔

اگلے روز اس نے ایک نابینا' ماہرِ روحانیات کو اپنے مکان میں بلایا جس کا نام سیسل ہسک تھا۔ یہ شخص نہ صرف روحوں کو طلب کرنے کا ماہر بلکہ خاص عمل کے ذریعے جس روح کو چاہتا مجسم ہوکر حاضر ہونے کا حکم دے سکتا تھا۔ نابینا عامل نے پُراسرار روح کی طلبی کا عمل ڈرائنگ روم میں کرنے کا فیصلہ کیا۔ کاؤنٹ نے اپنے خاص خاص دوستوں کو بھی اس عمل میں شرکت کے لیے بلوایا تھا۔سب لوگ ایک گول میز کے گرد دائرے کی صورت میں بیٹھ گئے۔درمیان میں شیشے کا ایک لیمپ روشن کرکے رکھا تھا۔ لیمپ پر سرخ کاغذ کا شیڈ لگا دیا گیا۔ اس لیمپ کی روشنی کے سوا مکان کی دوسری تمام برقی اور غیر برقی روشنیاں گل تھیں۔ اب نابینا عامل نے زیرِلب کوئی عمل پڑھنا شروع کیا۔ اس دوران میں کسی کو بولنے یا حرکت کرنے کی اجازت نہ تھی۔

"عمل شروع کیے پندرہ بیس منٹ گزرے ہوں گے کہ نچلی منزل کے ایک کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی' پھر قدموں کی چاپ..... جو نزدیک آتی گئی..... اس کے بعد جیسے کوئی سیڑھیاں چڑھتا ہے ..... یہ آواز ڈرائنگ روم کے دروازے کے پاس پہنچ کر ایک ثانیے کے لئے رُکی' پھر دروازہ آپ ہی آپ کھل گیا اور سرد ہوا کا ایک جھونکا سا اندر آیا۔ میز کے گرد بیٹھے ہوئے افراد کے بدن میں جیسے سوئیاں سی چبھنے لگیں۔ کمرے میں پھیلی ہوئی مدھم روشنی میں لوگوں نے دیکھا کہ دروازے کے قریب دھوئیں کا ایک ستون سا بن رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے یہ دُھواں اور گہرا ہوگیا' پھر یہ دُھواں سمٹ کر ایک انسانی ہیولے کے خدوخال بننے لگا۔ پہلے سر دکھائی دیا' پھر کندھے' اس کے بعد ہاتھ۔ آہستہ آہستہ ایک

کروں"۔

"کوئی شخص میرے لیے کچھ نہیں کرسکتا"۔ روح نے جواب دیا۔

"شاید تمہاری روح کو چین نہیں مل سکا..... اگر ایسا ہوتا' تو یوں بھٹکتے' نہ پھرتے اور ہم لوگوں کے آرام اور سکون میں خلل انداز نہ ہوتے"۔

"خواہ کچھ ہو' میں یہاں سے ہرگز نہیں جاسکتا۔ جس رات مرا ہوں' اس رات سے لے کر اب تک اسی مکان میں ہوں"۔

"اچھا' یہ بتاؤ تم نے اپنے دوست آرتھر لڈل کو کیوں قتل کیا؟"

"جن دنوں میں زندہ تھا اور اس مکان میں رہتا تھا' تو یہیں مجھے ایک عورت سے محبت ہوگئی۔ اس کا نام کارلوٹی تھا۔ میں اسے اپنی جان سے زیادہ چاہتا ..... ابھی ہماری شادی نہ ہو پائی تھی کہ میرا دوست آرتھر لڈل ہمارے درمیان آکودا۔ وہ دوست تو میرا تھا' لیکن آہستہ آہستہ اس نے کارلوٹی پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے اور چونکہ آدمی مالدار تھا اس لیے اس نے کارلوٹی کو روپے کا لالچ بھی دیا اور یہاں تک کہا کہ اگر وہ اس کے ساتھ بھاگ چلے' تو وہ اپنی تمام دولت اسی کو دے گا۔ آرتھر کے مقابلے میں مَیں ایک غریب اور معمولی کسان تھا' لیکن کارلوٹی بھی مجھے چاہتی تھی' چنانچہ اس نے سب باتیں مجھے بتادیں۔ میں نے آرتھر سے تعلقات منقطع کرلئے' لیکن ایک رات وہ میری غیر حاضری میں اس مکان پر آیا اور اس نے کارلوٹی پر دست درازی کرنے کا ارادہ کیا۔ کارلوٹی نے بڑی مشکل سے اپنی عزت بچائی۔ اتنے میں مَیں بھی پہنچ گیا اور جب مجھے اس کے کرتوت کا علم ہوا' غصے میں پاگل ہوگیا۔ میں نے اپنی کلہاڑی اٹھائی اور آتھر کا سر قلم کر دیا۔ پھر اسی کمرے میں گھڑا کھود کر لاش خاصی گہرائی میں دبادی۔ اسے دفن کرنے سے پہلے میں نے گڑھے میں چونے کی خاصی بڑی مقدار بھی بھردی تاکہ لاش جلد گل سڑ جائے اور ایسا ہی ہُوا۔ کارلوٹی اس حادثے کے بعد بھی میرے پاس ہی رہی' مگر اس کے ذہن نے اس حادثے کا ناگوار اثر قبول کیا۔ چنانچہ چند سال بعد وہ بیمار ہوئی اور مرگئی۔ اس مکان کے قریب ہی جو قبرستان ہے' کارلوٹی کی قبر وہیں

شکل نمایاں ہوتی چلی گئی' زرد رنگ کا ایک مردانہ چہرہ جس کی آنکھیں بے نور اور حلقوں میں دھنسی ہوئی تھیں۔ ٹھوڑی پر گھنی ڈاڑھی' سر کے بال سرخ' ناک بڑی اور کسی قدر خمدار' ہونٹ پتلے اور بھنچے ہوئے۔ یہ ایک ایسے شخص کا چہرہ تھا جس کی عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان تھی۔

"تم کون ہو؟" نابینا عامل کی آواز کمرے کے سناٹے میں گونجی۔

روح نے جو اَب انسانی شکل وصورت میں ظاہر ہوگئی تھی' جواب دینے کے لئے اپنے ہونٹوں کو جنبش دی' مگر کوئی آواز سنائی نہ دی۔ نابینا نے ایک بار پھر اپنا سوال اور بلند آواز میں دہرایا۔ روح کے چہرے پر کرب اور اذیت کے آثار نمودار ہوئے جیسے جواب دیتے ہوئے اسے سخت تکلیف پہنچ رہی ہو۔ اس مرتبہ فضا میں تیرتی ہوئی سرگوشی کی مانند' ایک باریک آواز سب کے کانوں میں پہنچی۔

"میرا نام کارل کلنٹ ہے ....." اور اس کے ساتھ ہی آواز یک لخت بلند ہو گئی۔ "تم کون لوگ ہو اور میرے مکان میں کس واسطے جمع ہوئے ہو؟"

"یہ سب میرے دوست ہیں اور میں اس مکان کا کرائے دار ہوں"۔ کاؤنٹ نے جواب دیا۔

"ہم سب تمہاری مدد کرنا چاہتے ہیں۔ کیا تم اپنے بارے میں ہمیں کچھ بتاؤ گے؟" کارل کلنٹ کی روح نے گھور کر کاؤنٹ ہیمن کو دیکھا اور پھر آواز آئی۔

"میں تمہیں اپنا نام بتاچکا ہوں۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے' میں اس مکان میں گذشتہ ایک سو بیس برس سے رہ رہا ہوں اور کبھی کسی نے مجھے پریشان نہ کیا۔ میں نہیں جانتا کتنی طویل مدت تک یہاں رہوں گا۔ وقت تم لوگوں کے لیے کوئی اہمیت رکھتا ہوگا' میرے لیے ہرگز نہیں۔ وقت ہرگز نہیں بدلتا اور نہ ختم ہوتا ہے ..... البتہ انسان بدل جاتے ہیں اور انسان فانی بھی ہیں... تم لوگ یہ بتاؤ میرے مکان میں کس لیے آئے؟"

"دراصل مجھے ایک ایسے ہی مکان کی ضرورت تھی۔" کاؤنٹ نے جواب دیا۔ "اب میری کوشش ہے کہ کسی نہ کسی صورت میں تمہارے لئے کچھ

ہے"۔

"کارلوٹی کے مرنے کے بعد تم نے کیا کیا؟"

"پھر میں کیا کرتا۔ یہاں میری دلچسپی کا کوئی سامان نہ تھا' چنانچہ میں اپنے وطن جرمنی چلا گیا' مگر کارلوٹی کی یاد نے میری زندگی سے سکون اور آرام ختم کر دیا تھا' لہٰذا ایک رات میں نے خودکشی کرکے اپنی زندگی ختم کر ڈالی اور ایک روز آپ کو اس مکان کی نچلی منزل کے چھوٹے کمرے میں پایا۔ اس وقت سے لے کر اب تک مَیں یہیں ہوں۔ میری روح کو اس مکان میں سکون ملتا ہے۔ لہٰذا میرے یہاں سے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہی ایک ایسی جگہ ہے جسے میں اپنا گھر کہہ سکتا ہوں۔ یہیں میری جان سے عزیز محبوبہ رہتی تھی۔ میرے لئے اب اور کوئی جگہ نہیں .....مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہیں رہنا ہے اور ہاں' کارلوٹی کی روح بھی میرے ساتھ رہے گی۔"

"کارل کلنٹ چونکہ تم نے قتل کا بہت بڑا گناہ کیا ہے' اس لیے تمہاری روح پر یہ عذاب ہو رہا ہے۔ تمہیں سکون .....ابدی سکون کی ضرورت ہے ..... بتاؤ ہم تمہارے لیے کیا کرسکتے ہیں؟"

"میں کہہ چکا ہوں تم لوگ میرے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔ اب سب راستے بند ہیں .....ہاں' تم صرف یہ کر سکتے ہو کہ جس کمرے میں میری اور کارلوٹی کی روحیں رہتی ہیں' اسے ہمیشہ مقفل رہنے دو۔ نہ وہاں خود جاؤ' نہ کسی اور کو جانے دو۔ ہوسکے تو وہاں ایک میز اور دو کرسیاں ضرور رکھوا دو، بس اور کچھ نہیں۔ مَیں پھر تنبیہہ کرتا ہوں کہ سورج غروب ہونے کے بعد اس کمرے میں کوئی شخص داخل ہونے کی جرأت نہ کرے۔ میں تمہاری خوشیوں میں حارج نہیں ہوں گا۔ باقی تمام مکان' اس کمرے کے سوا تمہارا ہے"۔

اور یوں یہ پُراسرار ڈرامہ ختم ہوا۔ کاؤنٹ نے وعدہ کیا کہ اس کمرے میں کوئی نہ جائے گا۔ اس نے اگلے ہی روز دو کرسیاں اور ایک میز وہاں رکھوادی اور دروازہ ہمیشہ کے لیے مقفل کر دیا۔

وقت گزرتا چلا گیا۔ مہینے برسوں میں بدل گئے' پھر کارل کلنٹ کی روح نے کاؤنٹ ہیمن اور اس کے گھر والوں کو تنگ نہ کیا۔ روح کے کمرے میں تاریکی اور خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا۔ کئی برس بعد کاؤنٹ نے یہ مکان چھوڑ کر دوسری جگہ جانے کا فیصلہ کیا، مگر وہ چاہتا تھا کہ اپنے اس فیصلے سے کارل کلنٹ کی روح کو ضرور آگاہ کرے۔ چنانچہ ایک رات اس نے پھر نابینا عامل کے ذریعے روح کو مجسم شکل میں طلب کیا۔ جب دھوئیں نے انسانی ہیولے کی صورت اختیار کرلی' تو کاؤنٹ ہیمن نے کہا۔

"کارل کلنٹ' میں نے تمہیں یہ بتانے کے لئے یہاں آنے کی زحمت دی ہے کہ ہم لوگ عنقریب یہ مکان خالی کر رہے ہیں۔ اس دوران میں تم نے اپنا وعدہ پورا کیا اور ہمیں تنگ نہ کیا' میں اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ کاش! کوئی طریقہ ایسا ہوتا جس سے ہم تمہاری روح کو شادماں کرسکتے"۔

کاؤنٹ ہیمن کا بیان ہے کہ یہ سن کر کارل کی رُوح چند لمحے خاموش رہی' پھر اس نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔

"تم یہاں سے جارہے ہو؟ پہلے میری خواہش تھی کہ تم یہاں سے چلے جاؤ' مگر اب میں چاہتا ہوں تم یہیں رہو۔ تمہارے یہاں رہنے سے مجھے سکون ہے۔ تم چلے جاؤ گے اور تمہاری جگہ جو کوئی اور آئے گا' تو وہ مجھے تنگ کرے گا..... نہیں نہیں ..... تم نہ جاؤ....."

"اچھا' جاؤ۔ کاش! میں بھی تمہارے ساتھ نئے مکان میں جاسکتا"۔ کارل کی رُوح نے یہ الفاظ کہے' تو کاؤنٹ اور کمرے میں موجود سبھی لوگ بیحد حیران ہوئے۔

"مگر میں نے تو دوسرا مکان لے بھی لیا ہے۔" کاؤنٹ نے کہا۔ "اب میں تم سے رخصت ہونے کی اجازت چاہتا ہوں۔"

"دیکھو میرے کمرے میں شمالی دیوار کے پیچھے کارلوٹی کی ایک پرانی تصویر چھپی ہوئی ہے۔" رُوح نے کہا۔ "میری خواہش ہے تم یہ تصویر اپنے ساتھ لے جاؤ

اور نئے مکان کے اس کمرے میں لگالو جہاں تم رہنا پسند کرو"۔

کاؤنٹ ہیمن نے ایک بار پھر روح کے کمرے کا تالا کھولا اور شمالی دیوار کو دیکھا بھالا تو پردے کے پیچھے سے ایک پرانی قلمی تصویر برآمد ہوئی، جس پر گرد کی دبیز تہ جمی ہوئی تھی۔ گرد صاف کی گئی تو ایک خوبصورت جواں سال عورت کے خدو خال اُبھر آئے۔ کاؤنٹ نے یہ تصویر بغل میں دبائی۔ کمرہ مقفل کیا اور کارل کی روح کو الوداعی سلام کرکے اس مکان سے رخصت ہوگیا۔

کاؤنٹ لوئیس ہیمن عرف کیرو کا حلفی بیان ہے کہ اس داستان کا حرف حرف سچا اور حقیقت پر مبنی ہے۔ ابھی پہلی جنگ عظیم تک اس مکان کے آثار مرکزی لندن میں باقی تھے اور دیکھے جاسکتے تھے لیکن ایک رات جرمن طیاروں نے لندن پر ایسی شدید بمباری کی کہ بہت سے مکان گرگئے اور بعض مقامات پر ہولناک آگ لگی جس نے اس مکان کا رہا سہا نشان بھی ہمیشہ کے لئے مٹا دیا۔

جنرل کی کھوپڑی

اس رات دھند اور کہر کی چادر لندن میں اس قدر دبیز تھی کہ برقی قمقمے دیوں کی مانند ٹمٹما رہے تھے اور کاروں کی روشنیاں اتنی مدھم تھیں کہ ہر آن ان کے ٹکرانے کا خدشہ تھا لیکن لندن کے ٹیکسی ڈرائیور اس موسم کے ہمیشہ سے عادی رہے ہیں اور ان کے لیے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ میں گاڑی کی پچھلی نشست پر ٹھنڈ کے باعث سکڑا سکڑایا بیٹھا تھا۔ کھڑکی سے باہر سوائے مدھم روشنیوں کے اور کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ دوسری گاڑیاں دائیں بائیں زن زن کرتی ہوئی نکل رہی تھیں۔ صرف ان کے انجنوں کی آواز سے پتا چلتا تھا کہ زندگی حرکت میں ہے۔ خدا کی پناہ! کیسا خوفناک موسم تھا اور سردی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جارہی تھی۔

ایک دم بریکیں لگیں، ٹائر چیخے اور گاڑی رک گئی۔ میں نے دیکھا سامنے لندن کے مشہور و معروف کارڈ ینیل کلب کی شاندار عمارت ہے اور گاڑی فٹ پاتھ کے ساتھ کھڑی ہے۔ کلب کا باوردی ملازم دوڑتا ہُوا آیا۔ اس نے جھک کر ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھولا۔ میں اوور کوٹ پہننے کے باوجود ٹھنڈ سے بے حال ہوتا ہُوا باہر نکلا۔ ڈرائیور کو کرایہ ادا کیا اور کلب کے مؤدب ملازم کی رہنمائی میں چند قدم چل کر اندرونی ڈیوڑھی میں داخل ہُوا۔ یہاں خاصی گرمی تھی۔ ایک دم جیسے جان میں جان آگئی۔ فوراً ہی دوسرے ملازم نے جھک کر سلام کیا اور میرا اوور

کوٹ اور ٹوپی تھامنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ تیسرے آدمی نے مجھے کلب کے ہال میں پہنچادیا۔ میرے قدموں تلے نہایت دبیز اور قیمتی قالین بچھا تھا۔ خاصا بڑا ہال تھا اور اس کی بے پناہ آرائش پر بے شمار روپیہ خرچ کیا گیا ہوگا۔ فرنیچر' کراکری' پردے سبھی بیش قیمت تھے۔ ہال میں چاروں طرف برقی آتش دان روشن تھے اور پانچ پانچ فٹ کا درمیانی فاصلہ دے کر انتہائی خوبصورت جدید طرز کی میزیں کرُسیاں بچھائی گئی تھیں' جن پر لندن کے شرفا' معزز خواتین و حضرات بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔

ملازم مجھے ایک گوشے میں لے گیا جہاں مخصوص میز کے پاس صرف دو کرسیاں پڑی تھیں۔ ایک کرسی میں دھنس کر میَں نے کوٹ کی اندرونی جیب سے چار انچ لمبا کاغذ کا ایک پرزہ نکالا اور اس پر نظر دوڑائی۔ صبح سے لے کر اب تک کوئی دس مرتبہ میں اس تار کی عبارت پڑھ چکا تھا۔

"شب کے آٹھ بجے ----- کارڈینل کلب میں ملیئے ----- گورمین۔"

مسٹر گورمین حال ہی میں مومباسا سے واپس لندن تشریف لائے تھے۔ افریقہ میں برطانوی مقبوضہ نو آبادیوں میں مومباسا شاید سب سے بڑی نو آبادی تھی اور مسٹر گورمین ----- بلکہ یوں کہئے کہ سر مائلز گورمین ----- وہاں برطانوی ڈپلومیٹ کی حقیقت سے کام کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ آپ کی آنجہانی جنرل رینڈلف لوسائی کے بہت پرانے اور بے تکلف دوست ہونے کا شرف بھی حاصل تھا۔ آخر الذکر صاحب افریقہ میں تمام برطانوی نو آبادیوں کے نگران اعلیٰ اور ہائی کمشنر وغیرہ بھی تھے۔ جنرل لوسائی کی موت دو ماہ قبل نہایت عجیب اور پراسرار حالات میں واقع ہوئی تھی۔ یہ حالات کیا تھے؟ ان کا علم کسی کو نہ ہوسکا۔ صرف اتنا پتا چلا کہ جنرل مرتے وقت بھی اپنی سرکاری ڈیوٹی پر کام کر رہا تھا۔ اچانک وہ مرگیا اور اس کی لاش لندن لاکرسینٹ جان کے قبرستان میں چپ چپاتے دفنادی گئی۔ بعض برطانوی اخباروں نے کچھ ایسی سرخیاں لگائیں جن سے شبہہ ہوتا تھا کہ جنرل لوسائی کی موت طبعی نہ تھی۔ کیا اسے قتل کیا گیا تھا؟ یا کوئی اور حادثہ پیش آیا تھا؟

اخباری رپورٹروں اور نامہ نگاروں کی سرتوڑ کوشش کے باوجود اس راز سے پردہ نہ اٹھایا جاسکا۔ بڑی مصیبت یہ تھی کہ جنرل لوسائی کے دوست' رشتے دار اور خود حکومت کے حلقے بھی پُراسرار انداز میں مہربہ لب تھے۔ اس سے ان شبہات کو مزید تقویت مل رہی تھی کہ معاملہ کہیں نہ کہیں گڑبڑ ضرور ہے۔ ایک باوقار اخبار کے ایڈیٹر کی حیثیت سے مجھے خود اس بارے میں خاصی تگ و دو کرنی پڑی تھی' لیکن میری تمام محنت اکارت گئی۔ کچھ بھی پتا نہ چلا کہ آخر قصہ کیا تھا اور جنرل لوسائی کی ایکا ایکی موت کے اسباب کیا تھے؟ بہر حال دو باتیں ایسی تھیں کہ ان پر جس قدر بھی غور کیا جاتا' یہی چیز باربار سامنے آتی کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ غضب خدا کا' پورے انگلستان میں چند مخصوص افراد کے سوا کسی کو بھی پتا نہ تھا کہ جنرل لوسائی جیسا اہم اور معروف آدمی موت سے ہم کنار کیسے ہُوا؟ دوسری بات پہلی سے بھی زیادہ شک انگیز اور نرالی تھی۔ اس کی لاش ایک بند سربمہر تابوت میں لندن لائی گئی۔ اس کے ساتھ حکومت کے متعلقہ حلقوں کی سخت ہدایات یہ تھیں کہ تابوت ہرگز نہ کھولا جائے گا اور لاش دیکھنے کی اجازت کسی کو نہ ہوگی۔ آخر کیوں؟ ان ہدایات پر پورا عمل کیا گیا اور جنرل کے رشتے داروں کو بھی آخری بار اس کا چہرہ نہ دکھایا گیا۔ بعد میں پتا چلا کہ اس کی موت کیپ ٹاؤن کے ایک ہسپتال میں واقع ہوئی اور ہسپتال کے دو تین ڈاکٹر ہی دنیا بھر میں وہ آخری افراد تھے جنھوں نے آنجہانی کا چہرہ دیکھنے کی سعادت حاصل کی تھی۔

رپورٹروں نے اپنے پیشے اور عادت سے مجبور ہوکر حالات کو کریدنے کی کوشش کی اور بعض الٹی سیدھی باتیں بھی اخباروں کے کالموں کی زینت بنیں' مگر گاڑی آگے نہ چل سکی۔ ویسے بھی کسی فرد کی موت اس کے اور اس کے رشتے داروں کا کچھ پرسنل سا معاملہ ہوتا ہے اور اخلاقی طور پر یہ کچھ اچھا نہیں لگتا کہ خواہ مخواہ کسی کا کفن نوچا جائے۔ اس کے علاوہ جنرل لوسائی کے رشتے داروں کو ابتدا میں خاصا پریشان کیا جاچکا تھا اور وہ قسمیں کھاکر یقین دلا چکے تھے کہ انہیں جنرل کی پُراسرار موت کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے' وہ تو بس حکومت کی

ہدایات پر عمل کرنے کے پابند ہیں۔ آخر اس معاملے کو چھوڑ دیا گیا' لیکن میرے ذہن میں برابر یہ قصہ تازہ رہا تھا' میں نے اسے ذہن سے جھٹک دینے کی بڑی کوشش کی' مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کوئی نادیدہ قوت مجھے اکسا رہی ہے کہ اس کی تہہ تک ضرور پہنچنا چاہیئے' چنانچہ میں نے چپکے چپکے تفتیش جاری رکھی۔ اس تفتیش کے ذریعے پتا چلا کہ اپنی موت سے چند ماہ قبل جنرل لوسائی کار کے ایک حادثے میں شدید زخمی بھی ہُوا تھا' مگر ڈاکٹروں کی کوشش کے باعث اس کے زخم ٹھیک ہوگئے تھے اور وہ دوبارہ اپنے سرکاری فرائض سرانجام دینے کے قابل ہوگیا تھا لیکن حادثے سے ٹھیک آٹھ ماہ بعد جنرل مرگیا۔ یہ بھی معلوم ہُوا کہ ان آٹھ ماہ کے دوران میں اگرچہ وہ جسمانی طور پر صحت مند رہا اور اپنا دفتری کام بخوبی کرتا رہا' مگر اس کی دماغی حالت درست نہ تھی..... اس پر پاگل پن کے دورے پڑنے لگے اور اسے دماغی امراض کے ہسپتال میں لے جایا گیا۔ اس ہسپتال میں وہ کچھ عرصے رہا اور پھر ٹھیک ٹھاک ہوکر واپس اپنی ڈیوٹی پر آگیا۔ ان تمام واقعات کی کڑیاں آپس میں ملتی نہ تھیں' درمیان میں ایک یا دو کڑیاں غائب تھیں۔ سوال یہ تھا کہ کار کا وہ حادثہ کیسے اور کیوں کر ہُوا؟ جنرل کے زخم کہاں تک ٹھیک ہوئے؟ کیا اس کے دماغ پر چوٹ آئی تھی جس کے باعث وہ دماغی ابتری کا شکار ہُوا؟ پھر پاگل خانے میں کتنے دن رہا اور علاج معالجے کے بعد ٹھیک بھی ہوگیا؟ جُوں جُوں میں ان معاملات پر غور کرتا' میری الجھنیں بڑھتی جاتیں۔ میں نے دفتر خارجہ کے چکر کاٹنے شروع کر دیے۔ ان لوگوں کو سب کچھ معلوم ہوتا ہے۔ شاید کسی گم شدہ کڑی کا سراغ ملے' مگر بے سود۔ ہر شخص جنرل لوسائی کا نام سنتے ہی کانوں کو ہاتھ لگاتا اور نفی میں گردن ہلادیتا کہ مجھے کچھ خبر نہیں "اوپر والوں" سے پوچھو۔ "اوپر والے" اول تو ملتے ہی نہیں تھے' طرح طرح کے بہانے کرکے ملاقات سے معذوری کا اظہار کرتے' اگر کبھی مارے باندھے کوئی مل بھی لیتا' تو مجھے ڈانٹ ڈپٹ کر نکال دیتا کہ جاؤ اپنا کام دیکھو' تمہیں جنرل لوسائی کی موت سے کیا سروکار۔ بے چارے کی قضا آئی تھی' مرگیا۔ اس میں کسی کا کیا دوش باقی رہا یہ قصہ کہ

لاش سربمہر تابوت میں افریقہ سے کیوں لائی گئی تھی اور کسی کو اس کا چہرہ دیکھنے کیوں نہ دیا گیا' تو اس کا جواب یہ ہے کہ افریقہ کی شدید گرمی کے باعث اس کی لاش گل سڑ گئی تھی اور تعفن کے مارے بُرا حال تھا۔ یہی وجہ تھی کہ تابوت کھولنے کی اجازت نہ دی گئی وغیرہ وغیرہ۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ "اوپر والے" کچھ نہ کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ادھر سے مایوس ہوکر میں نے جنوبی افریقہ کے اس ہسپتال کے ڈاکٹروں سے خط و کتابت شروع کی جنہوں نے جنرل لوسائی کا علاج کیا تھا۔ وہاں سے پہلا اور آخری جواب ایک سطر پر مشتمل یہ آیا کہ۔ "اس موضوع پر ہم کچھ کہنے سے قاصر ہیں۔ براہِ کرم ہمیں معاف رکھا جائے"۔ چلیے قصہ ختم۔ کوئی شخص بھی جسے کچھ معلوم تھا' اس راز سے پردہ اٹھاتے ہوئے ڈرتا تھا۔ پھر مجھے سَرمائلز گورمین کے بارے میں پتا چلا کہ جنرل لوسائی سے ان کا بڑا یارانہ رہا ہے اور جب اس کی موت واقع ہوئی ہے تو سرمائلز گورمین' جنرل کے آس پاس ہی تھے۔ میں نے موصوف کو کئی زور دار خط لکھے' مگر جواب ندارد۔ مجھے یقین ہوگیا کہ دنیا میں اگر کوئی شخص اس سربستہ راز سے پوری طرح واقف ہے' تو وہ صرف سرمائلز گورمین کی ذات ہے۔ خوش قسمتی ہے انہی دنوں سر گورمین کے لندن آنے کی خبر چھپی۔ میں نے فوراً ان کی سیکرٹری سے رابطہ قائم کرکے ملاقات کا وقت مانگا۔ اس حسین و جمیل عورت نے بڑے اخلاق سے وعدہ کیا کہ سَرگورمین سے وقت لے کر مجھے ضرور مطلع کرے گی۔ لیکن وہ دن کبھی نہ آیا۔ جب بھی میں فون کرتا' وہ یہی کہتی کہ سرگورمین باہر گئے ہوئے ہیں' کچھ پتا نہیں کب واپس آئیں' میں ان سے وقت لینے کی کوشش کر رہی ہوں۔ آپ انتظار کیجیے' صبر سے کام لیجیے وغیرہ وغیرہ۔ کبھی یہ بہانا کہ موصوف کی طبیعت ناساز ہے' ڈاکٹروں نے ملنے جلنے سے منع کر رکھا ہے۔ ان باتوں اور ٹال مٹول نے میری آتشِ شوق کو اور بھڑکا دیا۔ میں سمجھ گیا کہ سرگورمین ملنا نہیں چاہتے اور پیچھا چھڑانے کی فکر میں ہیں۔ آخر میں نے ایک خط انہیں لکھا کہ مجھے ساری کہانی کا علم ہوگیا ہے' صرف آپ کی تصدیق چاہتا ہوں۔ اگر آپ نے اپنا فریضہ

ادا نہ کیا' تو میں یہ کہانی نتائج کی پروا کیے بغیر' من وعن اپنے اخبار میں چھاپ دوں گا۔ یہ دراصل بلف چال تھی جو مجھے چلنی پڑی۔ خط بھیجنے کے تین روز بعد ہی مجھے سرگورمین کا وہ تار ملا جس کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں۔

اور اب میں کارڈ ینیل کلب کے پُرسکون' گرم اور آرائش سے بھرپور ہال میں بیٹھا انہی حالات پر غور کر رہا تھا کہ دیکھیے مسٹر گورمین کیا داستان سناتے ہیں کہ ایک دم میرے قریب کوئی آن کر کھڑا ہوگیا۔ یہ طویل قد اور مضبوط جسم کا ایک باوقار آدمی تھا جس کی بھوری مونچھیں بے حد شاندار اور پلی ہوئی تھیں۔ اس نے سیاہ رنگ کا بیش قیمت ڈنر سوٹ پہن رکھا تھا اور اس کے سیاہ جوتے اتنے چمکدار تھے کہ ان میں بلاشبہ اپنی صورت دیکھی جاسکتی تھی۔

میں ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ نو وارد نے مسکرا کر سوالیہ انداز میں کہا۔

"آپ ہی ایوننگ اسٹینڈرڈ کے ایڈیٹر ہیں؟"

میں نے اثبات میں سرہلایا۔ اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میرا نام مائلز گورمین ہے"۔

"تشریف رکھیے۔" میں نے اسے کے مصافحے اور مسکراہٹ میں خلوص کی سرگرمی محسوس کی۔ وہ میرے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ گیا اور گہری نظروں سے میرا جائزہ لینے لگا۔ وہ ان افراد میں سے تھا جو نہ خود جھوٹ بول سکتے ہیں نہ اپنے مخاطب کو غلط بیانی کرنے کی اجازت دیتے ہیں' پھر اس نے سرد آہ بھری اور نہ جانے کن خیالوں میں گم ہوگیا۔ میں چپ چاپ منتظر رہا کہ گفتگو کا آغاز وہ خود کرے گا۔

اتنے میں بیرا گرم قہوہ لے آیا' سرگورمین نے چونک کر اسے دیکھا اور مسکرایا پھر معذرت آمیز لہجے میں مجھ سے بولا۔ "معاف کیجئے!" "میں یہ سوچ رہا تھا کہ کہاں سے ابتدا کروں۔ مجھے بہرحال یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آپ ٹھیک آٹھ بجے یہاں آ گئے۔ میں نے طے کیا تھا کہ اگر آپ تاخیر سے آئیں گے تو ملاقات سے انکار کر دوں گا۔ میں ایسے لوگوں کو اعتماد کے قابل نہیں جانتا جو وقت کے پابند نہ ہوں۔ فرمایئے!

جنرل لوسائی کے بارے میں آپ کیا جاننا چاہتے ہیں؟ کون سی ایسی بات ہے جو آپ کو پریشان کیے ہوئے ہے؟"

"ان کی پراسرار موت!" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "موت سے پہلے کار کا ایک حادثہ..... پھر دماغی شفاخانہ میں ان کا علاج..... اور اچانک موت..... میرا خیال ہے ان حالات پر آپ سے بہتر کوئی دوسرا روشنی نہیں ڈال سکتا۔ آپ سب کچھ جانتے ہیں"۔

بہت مختصر وقفے کے لیے سرگورمین کے چہرے اور آنکھوں میں گھبراہٹ کے آثار نمودار ہوئے۔ اس نے قہوے کے دو پیالیاں بنائیں۔ ایک میرے آگے سرکا دی' دوسری اپنے سامنے رکھ لی۔ جیب سے رومال نکال کر چہرے پر پھیرا اور پہلو بدل کر بولا۔

"بے شک! میں جنرل لوسائی کی زندگی اور موت کے بارے میں ایسے حالات سے واقف ہوں جو دوسروں کے علم میں نہیں ہیں یا یوں کہئے کہ کم از کم انگلستان والوں کے علم میں تو بالکل نہیں ہیں۔ کیا آپ کو کیپ ٹاؤن سے کچھ نہیں بتایا گیا؟ وہاں کے دو تین ڈاکٹر بھی کچھ نہ کچھ جانتے ہیں"۔

"جی نہیں! اس معاملے میں سبھی گونگی کا گڑ کھائے بیٹھے تھے' کسی نے ایک لفظ بتا کر نہ دیا"۔ میں نے ہنس کر کہا۔ "اور یہی سبب تھا کہ اصل حالات جاننے کی خواہش بڑھتی گئی۔ ویسے بھی میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اس قصے کو اپنی صحیح شکل میں پبلک کے سامنے آنا چاہیے ورنہ قیاس آرائیوں اور چہ میگوئیوں کا دروازہ کھلا رہے گا۔ جنرل لوسائی جس اہم عہدے پر فائز تھے' اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ان کی پراسرار موت کے اسباب بیان کر دینے چاہئیں"۔

گورمین کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے قہوے کی چسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

"آپ اخبار والوں سے خدا بچائے' بال کی کھال نکال لیتے ہیں۔ بھلا یہ آپ

حضرات نے کیسے فرض کر لیا کہ جنرل کی موت کے اسباب پُراسرار بھی ہوسکتے ہیں؟ کیا کسی شخص کی لاش کا سربمہر تابوت میں لایا جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کی موت پُراسرار حالات میں واقع ہوئی ہے؟"

"بے شک۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "اور اس کے ساتھ ساتھ سختی سے یہ ہدایت بھی کہ کسی فرد کو' خواہ وہ جنرل لوسائی کا کتنا ہی قریبی عزیز ہو' اس کا چہرہ نہ دکھایا جائے۔ کیا یہ چیز ذہنوں میں شبہات پیدا نہیں کرتی؟"

گورمین نے اثبات میں گردن ہلائی اور قہوے کی چُسکیاں لیتا رہا۔ پانی ختم کرنے کے بعد وہ چند لمحے خالی خالی نگاہوں سے میز کو گھورتا رہا' پھر کھنکار کر گلا صاف کیا اور کہنے لگا۔ "آپ کا کہنا درست ہے جناب۔ ہم نے کوشش کی تھی کہ اس قصے کو دبا دینا ہی بہتر ہوگا' مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس ساری اسکیم میں کہیں نہ کہیں کوئی غلطی ہوگئی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آپ اس وقت میرے سامنے موجود ہیں اور مجھے یہ لرزہ خیز داستان الف سے یے تک آپ کے گوش گزار کرنا پڑ رہی ہے۔ تاہم میں درخواست کروں گا کہ اگر آپ اسے اپنے اخبار میں شائع کریں' تو زیادہ بہتر ہوگا۔ یوں بھی واقعات اتنے حیران کُن' عجیب اور دہشت انگیز ہیں کہ مشکل ہی سے ان پر یقین کیا جائے گا' لیکن حقیقت بہرحال حقیقت ہوتی ہے۔ میں آپ کو جنرل لوسائی کی زندگی کے آخری چند مہینوں کے واقعات مختصر انداز میں بتاؤں گا"۔

سرمائلز گورمین کی آواز کپکپا رہی تھی اور اس کا چہرہ از حد سنجیدہ ہوگیا تھا۔ جُوں جُوں اس کی آواز میں لرزش بڑھ رہی تھی' توں توں میرے دل کے دھڑکنے کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے بے چینی سے پہلو بدل کر سگریٹ سلگائی اور ہمہ تن گوش ہوگیا۔ شاید میں اس صدی کی سب سے حیرت انگیز اور ڈرانے کہانی سننے والا تھا۔ اس کا اندازہ میں نے سرگورمین کی مضبوط شخصیت کو خوف ہوتے دیکھ کر کرلیا تھا۔ اس نے بھی خوشبودار سگار سلگایا اور ایک دو گہرے لینے کے بعد دھیمے' بھرائے ہوئے لہجے میں بولنا شروع کیا۔

"آج سے ٹھیک گیارہ ماہ پہلے کی بات ہے۔ یہ ہفتے اور اتوار کی درمیانی شب تھی۔ سفارت خانے کے کسی جونیئر افسر کے ہاں ڈنر تھا۔ جن لوگوں کو اس نے مدعو کیا تھا' ان میں میرا اور جنرل لوسائی کا نام بھی شامل تھا۔ رات نہایت حسین تھی۔ کھانا بہت لذیذ اور شراب بے حد نفیس تھی۔ پھر سبھی لوگ آپس میں بے تکلف تھے' خوب چہلیں ہوئیں۔ ہنسی مذاق' ڈھول دھپا بھی ہُوا۔ گانے بجانے اور رقص کی محفل بھی گرم رہی۔ یہ ایک یادگار تقریب تھی جس میں آدمی دل بھر کر حظ و مسرت کے خزانے لٹاتا بھی ہے اور لوٹتا بھی ہے۔ امید ہے آپ میرا مطلب سمجھ گئے ہوں گے۔ سورج نکلنے میں ابھی غالباً" ایک ڈیڑھ گھنٹہ باقی ہوگا کہ ہم نے اپنے میزبان سے اجازت لی۔ اس نے بہت اصرار کیا کہ اس وقت کہاں جایئے گا' تھوڑی دیر میں صبح ہونے والی ہے' ناشتا کر کے روانہ ہوجایئے' مگر میں نے اس کی بات نہ مانی۔ دراصل جنرل لوسائی کی حالت خاصی ابتر ہورہی تھی۔ وہ بلانوش تو پہلے ہی تھا' اس رات ظالم نے نہ جانے کتنی بوتلیں چڑھالی تھیں۔ ہوش و حواس بالکل جواب دے گئے تھے۔ پاؤں رکھتا کہیں تھا' پڑتا کہیں تھا۔ میں نے اسے سنبھال رکھا تھا۔ یوں بھی وہ جب زیادہ شراب پی لیتا تھا تو جسم کے ساتھ ساتھ اس کا دماغ بھی "آؤٹ" ہو جاتا تھا' حالانکہ شراب پینے کے لیے بڑے اونچے ظرف کی ضرورت ہوتی ہے اور بدقسمتی سے یہ ظرف جنرل لوسائی کو حاصل نہ تھا۔ تقریب میں سفارت خانے کے افسروں کی نوجوان اور حسین بیویاں بھی شریک تھیں۔ جنرل نے ان کی موجودگی اور آدابِ محفل کا لحاظ کیے بغیر فحش اشارے اور بے ہودہ زبان استعمال کی' لہٰذا یہ اور ضروری ہوگیا کہ میں اسے وہاں سے لے جاؤں' چنانچہ ہم دونوں مکان سے باہر نکل کر گیراج کی طرف چلے جہاں میری اور جنرل کی کاریں کھڑی تھیں۔ جنرل لوسائی مضر تھا کہ وہ ٹھیک ٹھاک ہے اور اپنی کار خود ڈرائیو کرے گا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ خاصی دور جانا ہے' راستہ بھی خطرناک ہے' ویسے بھی اندھیرا ہے' شاید وہ گاڑی نہ سنبھال سکے' میں اسے اپنی کار میں لے چلتا ہوں۔ یہ سن کر وہ برافروختہ ہوگیا اور مجھے گالیاں دینے

لگا۔ پھر اس نے اپنی گاڑی اسٹارٹ کی اور چل پڑا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ پوری طرح نشے میں ہے اور یقیناً" کسی کھڈیا کھائی میں کار گرا دے گا' مگر جنرل کی ضد مشہور تھی اور وہ اس سے کسی طرح باز نہیں رہ سکتا تھا۔ میں نے اس کے تعاقب میں اپنی گاڑی لگا دی۔ وہ مجھ سے کوئی ایک فرلانگ آگے جارہا تھا اور اس کی کار دائیں بائیں ہچکولے کھاتی ہوئی دوڑ رہی تھی۔ بیس میل تک ہم اسی طرح چلتے رہے۔ راستہ سنسان اور ویران تھا اور ہم ایک جنگل کے اندر سے گزر رہے تھے۔ اس تمام راستے میں مجھے ایک بھی ذی روح دکھائی نہیں دیا۔۔۔

"دفعتہ" میں نے دیکھا کہ جنرل لوسائی کی کار سڑک سے اتر کر چھوٹے بڑے گڑھوں میں "اچھلتی" لڑھکتی پوری قوت سے بھاگتی ہوئی ایک بڑے درخت کے تنے سے ٹکرائی اور رک گئی"۔

"آہ! تو یہ تھا وہ حادثہ جس کا ذکر میں نے سنا۔ گویا اس کہانی کا یہ جزو صحیح نکلا" میں نے کہا۔

"ہاں' یہ خاصا بھیانک حادثہ تھا"۔ گورمین نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں نے رفتار تیز کی اور وہاں پہنچا۔ جنرل کی کار کا بونٹ اور انجن بری طرح تباہ ہوگیا تھا۔ ونڈ اسکرین بھی ریزہ ریزہ تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر جنرل لوسائی اسٹیرنگ وہیل تھامے جھکا بیٹھا تھا۔ اس کی پیشانی' دونوں رخسار' ناک' ٹھوڑی اور گردن خون میں لت پت تھی اور وہ بالکل بے ہوش تھا۔ پہلے مجھے خیال ہُوا کہ وہ مرچکا' لیکن ہاتھ لگانے سے پتا چلا کہ اس میں ابھی زندگی کی حرارت باقی ہے۔ اس کی کار کی بتیاں ابھی تک جل رہی تھیں۔ یہ بھی اچھا ہی ہُوا' ورنہ اس گھپ اندھیرے میں بڑی مشکل ہوتی۔ میری کار جائے حادثہ سے کوئی نصف فرلانگ دور ہی کھڑی تھی۔ میں نے جُوں توُں کرکے بڑی تگ و دو کے بعد بے ہوش جنرل کو ڈرائیونگ سیٹ سے اٹھایا اور کمر پر لاد کر اپنی گاڑی تک پہنچایا۔ ہر لمحے مجھے یہ شبہ ہوتا کہ جنرل چل بسا' لیکن دل پر ہاتھ رکھنے سے پتا چلتا کہ ابھی دم باقی ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اسے کہاں کہاں چوٹ آئی تھی۔ نزدیک ترین

ہسپتال جائے حادثہ سے کوئی سو میل دور تھا۔ اب آپ میری پریشانی کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ خیر' خدا کا نام لے کر میں چل پڑا' مگر اب یہ خدشہ ستانے لگا کہ میری کار میں اتنے لمبے سفر کے لیے پٹرول بالکل نہ تھا۔ زیادہ سے زیادہ میں پچاس ساٹھ میل ہی جاسکتا تھا۔ ادھر جنرل کی حالت ہر لمحہ ابتر ہوتی جارہی تھی۔ خون اس کے زخموں سے برابر رس رہا تھا اور اب وہ زور زور سے سانس لے رہا تھا۔ اتفاق سے میرے پاس تھرمس میں پانی کے دو ایک گھونٹ تھے۔ میں نے وہ پانی اس کے حلق میں ٹپکانے کی کوشش کی' مگر بے سود۔ اس کا جبڑا اس سختی سے بھنچ ہُوا تھا کہ جیسے دوبارہ کبھی نہ کھلے گا۔ میں نے اپنے آپ پر قابو پاکر سوچنے اور غور کرنے کا وقت نکالا۔ یکایک خیال آیا کہ میں واپس اسی جونیئر افسر کے مکان تک تو جاسکتا ہوں' جہاں ہماری دعوت تھی۔ اگر جنرل وہاں پہنچنے تک زندہ رہا تو پھر اسے ہسپتال لے جانے کی تدبیر کی جائے گی۔ ممکن ہے جونیئر افسر کے گھر میں پٹرول موجود ہو یا مہمانوں میں سے کسی کی گاڑی کی ٹنکی پٹرول سے بھری ہوئی ہو جائے۔ قصہ مختصر واپس پہنچا وہ لوگ جنرل کی حالت دیکھ کر ڈر گئے۔ معلوم ہُوا کہ گاؤں کے قریب برطانوی حکومت نے مقامی باشندوں کے علاج معالجے کے لیے ایک چھوٹا سا ہسپتال کھول رکھا ہے۔ وہاں گئے یہ تین کمروں کا ہسپتال تھا۔ ایک کمرے میں صرف تین بستر بچھے اور ایک ڈاکٹر ڈیوٹی پر موجود مل گیا۔ ڈاکٹر نے جنرل کا معائنہ کیا اور اطمینان دلایا کہ کوئی ہڈی نہیں ٹوٹی معمولی زخم ہیں۔ ڈاکٹر نے ان زخموں کی ڈریسنگ کی۔ اس دوران میں جنرل برابر بے ہوش رہا۔ انجکشن ہوش میں لانے کی ہر تدبیر ناکام ثابت ہوئی۔ بہرحال اسے وہیں ہسپتال میں چھوڑا اور میں واپس اپنے مکان پر آن کر سوگیا۔ نیند اور تھکن کے باعث خود میرا برا حال تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"اگلے روز دوپہر کو آنکھ کھلی' تو سرکاری کام سے مجھے فوراً" کئی سو میل جانا پڑا۔ یہ روانگی اس قدر عجلت میں ہوئی کہ میں اپنے زخمی اور بے ہوش دوست جنرل لوسائی کی خیر خبر بھی معلوم نہ کرسکا۔ جمعے کے روز میں واپس

خانے میں آیا اور آپ میری ازحد حیرت کا تصور کرسکتے ہیں' جب میں نے جنرل لوسائی کو سفارت خانے میں موجود پایا۔ وہ اپنے آفس میں ایک بڑی سی میز کے پیچھے بیٹھا انہماک سے کام میں مصروف تھا۔ مجھے اپنی بصارت پر یقین نہ آیا کہ یہ وہی آدمی ہے جسے چند روز پیشتر میں موت و حیات کی کشمکش میں گرفتار ایک ہسپتال کے کمرے میں چھوڑ گیا تھا۔ اگر اس کے سر اور گردن پر سفید سفید پٹیاں نہ بندھی ہوتیں' تو میں یہی سمجھتا کہ جنرل لوسائی کا ہم شکل کوئی اور آدمی ہے جو اس کی نشست پر بیٹھا کام کر رہا ہے۔

"خدا کی پناہ' جنرل..... اب کیا حال ہے؟ تمہیں چند روز آرام کرنا چاہیے تھا"۔ میں نے کہا۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"اس نے نگاہ اٹھا کر مجھے دیکھا' مسکرایا اور کمزور آواز میں بولا۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"اب میں بہتر ہوں۔ معمولی زخم تھے' ٹھیک ہوگئے ہیں۔ کام زیادہ تھا۔ میں نے سوچا اسے نمٹا ہی دوں۔ میں اس کی فرض شناسی کا پہلے ہی قائل تھا اب اور ہوگیا۔ معلوم ہُوا کہ وہ مزید دو روز اسی ہسپتال میں دن رات بے ہوش پڑا رہا۔ ایک ثانیے کے لیے بھی اسے ہوش نہ آیا۔ تیسرے دن خود بخود اس نے آنکھیں کھول دیں اور ڈاکٹر کو بتایا کہ وہ اب اپنی حالت خاصی اچھی محسوس کر رہا ہے' چنانچہ ڈاکٹر نے چند ضروری ہدایات کے بعد اسے ہسپتال سے رخصت کر دیا۔ دن گزرتے گئے جو تھوڑی بہت جسمانی کمزوری خون بہہ جانے سے ہوگئی تھی' وہ بھی دور ہوگئی' زخم بھرگئے اور جنرل کی گردن اور سر سے پٹیاں کھول دی گئیں۔ بظاہر جنرل لوسائی بالکل صحت مند تھا۔ وہ باقاعدگی سے دفتر آتا' مقررہ اوقات میں دلچسپی اور تن دہی سے اپنے سرکاری فرائض سرانجام دیتا اور گھر چلا جاتا"۔

گورمین نے نیا سگار سلگایا' چند لمحے چھت کی طرف گھورتا رہا' پھر دوبارہ بیان شروع کر دیا۔

"ہم سب سمجھ رہے تھے کہ جنرل اب ٹھیک ٹھاک ہے' لیکن ابھی اس حادثے کو تین ہفتے ہی بیتے تھے کہ ایک روز جنرل کے کمرے سے چیخوں کی

آوازیں سنائی دیں۔ یہ چیخیں اتنی بھیانک تھیں کہ دفتر کے سبھی ملازم لرز گئے۔ بھاگم بھاگ جنرل کے کمرے میں پہنچے، تو ایک عجب تماشا نظر آیا ہے۔ بے چارہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے، کٹے ہوئے بکرے کی مانند کمرے کے فرش پر پڑا تڑپ رہا تھا۔ اذیت کی شدت سے اس کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا، آنکھیں حلقوں سے اُبلی پڑ رہی تھیں اور ہونٹوں کے کنارے سے سفید سفید جھاگ اُبھر رہا تھا۔ بڑی مشکل سے اتنا پتا چل سکا کہ بائیں آنکھ کے اوپر، کنپٹی کے آس پاس اتنا شدید درد ہو رہا ہے جو ناقابلِ برداشت ہے۔ دیکھتے دیکھتے جنرل بے ہوش ہوگیا۔ جلدی سے سفارت خانے کے ڈاکٹر کو طلب کیا گیا۔ اس نے جنرل کا بغور معائنہ کیا اور بتایا کہ بظاہر کوئی خرابی دکھائی نہیں دیتی، ممکن ہے اعصابی تکلیف ہو۔ بہرحال اس نے انجکشن لگا دیا اور کوئی دوا بھی جنرل کے حلق میں ناک کے راستے نلکی ڈال کر ٹپکائی۔ اس کا جبڑا تکلیف کی وجہ سے پھر بھینچ گیا تھا اور کوشش کے باوجود کھولا نہ جاسکا----

"دو دن، دو راتیں جنرل بے ہوش پڑا رہا۔ تیسرے روز اسے خود بخود ہوش آگیا۔ اب اسے کوئی تکلیف نہ تھی۔ بائیں کنپٹی کے پاس اُٹھنے والا درد بھی غائب تھا۔ جنرل اپنے آپ کو پُرسکون محسوس کر رہا تھا۔ اس نے بعد میں بتایا کہ بیٹھے بیٹھے ایک دم درد اٹھا اور ناقابلِ برداشت ہوگیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی نادیدہ قوت اس کی رگوں اور شریانوں کو تیزدھار نشتر سے کاٹتی چلی جارہی ہے----

"ایک ہفتہ گزر گیا۔ جنرل ٹھیک ٹھاک اپنی ڈیوٹی پر آتا رہا اور کام کرتا رہا۔ دسویں روز پھر اس کے چیخنے کی آوازیں سفارت خانے کی عمارت میں گونجنے لگیں۔ ایک بار پھر ہم سب نے وہی مہیب نظارہ دیکھا۔ جنرل فرش پر پڑا بری طرح ڈکرا رہا تھا، تڑپ رہا تھا، اس مرتبہ اس نے اپنا سر دیوار پر کئی بار دے مارا۔ آخر بے ہوش ہوگیا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر سراسیمگی پھیل گئی۔ فوراً ڈاکٹر دوڑا ہوا آیا، پھر وہی انجکشن اور وہی علاج معالجہ..... حیرت انگیز بات یہ تھی کہ جنرل کو ہوش میں لانے کی ہر ممکن تدبیر ناکارہ ہو جاتی تھی بعض لوگوں نے دبی زبان سے

جادو اور ٹونے کا ذکر کیا۔ افریقہ کے اس علاقے میں مقامی ساحروں اور جادوگروں کی کمی نہ تھی جو اپنے حریفوں اور دشمنوں کو سحر کے ذریعے بیمار ڈال دیتے یا ہلاک کر دیتے تھے، لیکن جنرل لوسائی کی کسی شخص سے ایسی دشمنی نہ تھی کہ اسے جنرل کو ہلاک کرانے کے لیے جادوگروں کی خدمات حاصل کرنی پڑتیں۔ معاملہ روز بروز پُراسرار ہوتا جا رہا تھا اور جس کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے----

"بہرحال شبہہ مٹانے کے لیے ایک دو جادوگروں کو بھی طلب کیا گیا۔ انہوں نے طرح طرح کے شعبدے دکھائے اور بعد میں بتایا کہ جنرل پر کسی نے جادو نہیں کیا۔ یہ کوئی اور ہی مرض ہے۔ ادھر ہسپتال کے انگریز تجربے کار ڈاکٹروں کی بھی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ چکر کیا ہے۔ وہ لوگ اپنی سی کوشش کرتے تھے، لیکن خود انہیں اپنی ناکامی کا قدم قدم پر احساس ہو رہا تھا۔ جنرل کی جسمانی حالت روز بروز کمزور ہو رہی تھی۔ سر درد کے یہ ناقابلِ برداشت دورے مسلسل پڑنے لگے۔ آخر اسے ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق مکان ہی میں پڑے رہنے پر مجبور کیا گیا۔ دفتر آتا، تو اس کی چیخیں سن کر ہی دوسرے لوگ دہل جاتے اور کوئی شخص دل جمعی سے اپنا کام کرنے کے قابل نہ رہتا۔ ہم لوگ، جو جنرل کے دوست تھے، اس کی یہ ابتر حالت اور اذیت دیکھ دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھتے، لیکن کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جنرل کے دماغ کو اندرونی طور پر کوئی صدمہ پہنچا تھا اور بے پناہ سردرد کی وجہ یہی تھی۔ ایک ڈاکٹر کی رائے تھی کہ دماغ کے بعض خلیے بے کار ہوچکے ہیں اور ان کے اندر خون جم گیا ہے۔ کسی نامعلوم سبب سے اس خون میں جراثیم پیدا ہوگئے ہیں اور جب وہ حرکت کرتے ہیں، تو جنرل تکلیف سے تڑپتا ہے۔ آخر بے ہوش ہو جاتا ہے----

"میں روزانہ ہی جنرل کی عیادت کے لیے اس کے مکان پر جاتا تھا اور یہ جان کر مجھے سخت صدمہ پہنچتا کہ میرا دوست بہت جلد موت کے منہ میں جانے کی تیاریاں کر رہا ہے اس کا وزن تیزی سے گھٹ رہا تھا جیسے کوئی اَن دیکھی طاقت

اس کا خون چوس رہی ہو۔ اب وہ ہڈیوں کا ایک بے حس و حرکت ڈھانچہ دکھائی دینے لگا۔ درد کی ناقابلِ برداشت اذیت سے نجات پانے کے لیے ڈاکٹروں نے اسے مارفیا اور اسی قبیل کی مسکن' نشہ آور اور سلا دینے والی دوائیں دینی شروع کردی تھیں۔ بعد میں یہ طے پایا کہ اسے کیپ ٹاؤن کے بڑے ہسپتال میں منتقل کر دیا جائے....''

''دماغی امراض کے ہسپتال میں؟'' میں نے دریافت کیا۔

سرگورمین نے نفی میں گردن ہلائی۔

''نہیں' یہ آگے چل کر ہُوا۔ فی الحال یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ کیپ ٹاؤن کے ہسپتال میں' جنرل لوسائی کے دماغ کا آپریشن کیا جائے تاکہ مرض کی اصل نوعیت کا سراغ لگایا جاسکے۔ یہ بڑا نازک اور خطرناک آپریشن تھا۔ جس کے لیے ایک بیحد تجربے کار اور خاص سرجن کو مقرر کیا گیا تھا۔ ہسپتال میں چند روز تک جنرل پر مختلف قسم کے تجربے کیے جاتے رہے جو ایسے آپریشنوں کے لیے ضروری ہُوا کرتے ہیں۔ بعض نئی دوائیں بھی اسے استعمال کرائی گئیں۔ اس امید میں کہ شاید درد جاتا رہے اور کھوپڑی کھولنے کی نوبت نہ آئے' لیکن ساری تدابیر بے کار ثابت ہوئیں۔ آخر آپریشن کا مرحلہ آہی گیا۔ اس کے سوا ڈاکٹروں کے پاس چارہ بھی کیا تھا-----

''میں نے خصوصی اجازت لی تاکہ آپریشن تھیٹر میں داخل ہوکر مشاہدہ کرسکوں۔ عام حالات میں کسی بھی غیر متعلقہ شخص کو ایسے نازک اور اہم آپریشنوں کے وقت آپریشن تھیٹر میں گھسنے کی اجازت نہیں دی جاتی' لیکن جنرل سے میرے خصوصی اور قریبی مراسم کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ انہیں اجازت دینی ہی پڑی۔ تھیٹر کے ساتھ ہی شیشے کے ایک الگ چیمبر میں انہوں نے میرے لیے کرسی ڈال دی وہاں بیٹھ کر میں سب کارروائی اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا تھا۔ یہ کہنے میں مجھے کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی کہ حد درجہ مضبوط اعصاب کے باوجود اس روز میرے دل کی دھڑکنوں میں کچھ زیادہ ہی اضافہ ہوگیا تھا اور میں بار بار اپنی

پیشانی سے پسینہ پونچھنے پر مجبور تھا۔ کچھ ایسا احساس ہو رہا تھا جیسے میں کوئی انوکھی بات معلوم کرنے والا ہوں۔۔۔۔

"چند لمحوں میں میرے دوست کو پہیوں والی کرسی پر بٹھا کہ آپریشن تھیٹر میں لایا گیا۔ خدا رحم کرے' اس کی حالت میں کتنا عظیم تغیر رونما ہو گیا تھا۔ پہلی نظر میں میں اسے پہچان نہ سکا کہ یہی وہ شخص ہے جو اپنی صحت کے اعتبار سے پوری ایمبیسی میں ممتاز و نمایاں تھا اور جس کے قہقہے رات کے سناٹوں میں دُور دُور تک سنے جاتے تھے۔ ایک قوی ہیکل' صحت مند اور مجسم زندگی سے بھرپور جنرل لوسائی کے بجائے اس کرسی پر میں نے ایک مریل' بجھے ہوئے اور زندگی سے بیزار بڈھے کو دیکھا جو تحیر آمیز نظروں سے اس لمبی سی سفید ٹیبل پر نگاہ جمائے ہوئے تھا' جس پر چند لمحے بعد لیٹ کر اسے آپریشن کے کڑے مراحل سے گزرنا تھا۔ ایسا آپریشن جو اسے نئی زندگی بھی بخش سکتا تھا اور موت کے اتھاہ اندھیروں میں بھی دھکیلنے پر قادر تھا۔۔۔۔

"ڈاکٹروں کی ہدایت پر ایک حجام نے اس کا سر اچھی طرح مونڈ دیا تھا اور آپریشن تھیٹر کی تیز روشنیوں میں جنرل لوسائی کی کھوپڑی اس انڈے کی مانند چمک رہی تھی جسے دھوپ میں رکھ دیا گیا ہو۔ جب اسے کرسی سے اٹھا کر آپریشن ٹیبل پر لٹا یا گیا اور سرجن نے کھوپڑی پر آنکھوں سے کوئی پانچ انچ اُوپر کھوپڑی چیرنے کے لیے نشان لگا کر ایک چمکدار پتلی سی آری اٹھائی' تو دہشت سے کانپ کر میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ مجھ میں یہ ہولناک خونیں منظر دیکھنے کی ہمت تھی نہ حوصلہ۔ اس دوران میں ڈاکٹروں نے جنرل کو کلورو وفارم سونگھا کر بے ہوش کر دیا تھا۔ چند منٹ بعد میں نے انگلیوں کی جھری میں سے دیکھا' تو معلوم ہُوا کہ سرجن آپریشن شروع کر چکا ہے۔ جنرل کی کھوپڑی کا خون آلود اور کٹا ہوا حصہ مجھے صاف دکھائی دے رہا تھا۔"

سرگورمین نے دونوں ہاتھوں سے یکایک اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور سسکیاں لے لے کر رونے لگا۔ غالباً وہ منظر اس کے ذہن میں اپنی تمام جزئیات اور تفصیلات

کے ساتھ تازہ ہو چکا تھا۔ میں دم بخود اپنی نشست پر بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا مگر اس کی حالت دیکھ کر کچھ کہنے کی جرأت ہی نہ ہوئی۔ گورمین نے رومال سے اپنی آنکھیں پونچھیں۔ پانی کا گلاس حلق سے اتارا اور ایک غم انگیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "معاف کیجئے میں کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ منظر میں مرتے دم تک فراموش نہ کر پاؤں گا۔ آپ میری جگہ ہوتے' شاید یہی کیفیت آپ کی ہوتی جو اس وقت میری ہو رہی ہے۔ ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ یہ ہیبت ناک آپریشن شروع ہُوا اور کامل ایک گھنٹے تک جاری رہا۔ سرجن نے انگلی کے اشارے سے مجھے قریب بلایا۔ میں اپنے چیمبر سے نکل کر آپریشن ٹیبل کے پاس جا کھڑا ہُوا۔ سرجن نے مجھے بتایا کہ جنرل کا دماغ بالکل صحیح حالت میں ہے اور کسی قسم کی خرابی کا سراغ نہیں مل سکا ہے۔ ہر چیز نارمل حالت میں ہے اور دماغ کو کسی نوع کا کوئی صدمہ بھی نہیں پہنچا ہے۔

سرجن ابھی مجھ سے دبے لہجے میں یہ باتیں کر ہی رہا تھا کہ آپریشن تھیٹر کی فضا میں ایک چیخ گونجی۔ یہ چیخ اس نرس کے حلق سے برآمد ہوئی تھی جو آپریشن میں مدد دینے کے لیے وہاں حاضر تھی۔ سب آنکھیں ایک دم اس نرس پر مرکوز ہو گئیں جس کا رنگ ڈھلے ہوئی کپڑے کی مانند سفید پڑ گیا تھا۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے' پھر اس نے ہاتھ سے جنرل لوسائی کے خون سے لتھڑے ہوئے سر کی طرف اشارہ کر کے سحرزدہ لہجے میں کہا۔۔۔۔

"اُدھر۔۔۔۔ وہاں ..... میں نے کسی کو حرکت کرتے دیکھا ہے.... کوئی چیز تھی ..... زندہ ....."

"بجلی کی مانند سرجن' جنرل لوسائی کی طرف لپکا اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھایا اور کوئی چیز اٹھائی جو خون میں لتھڑی ہوئی تھی۔ میں نے حیرت اور خوف سے دیکھا۔ اس کی انگلیوں میں کوئی جاندار دبا ہُوا تھا جس کی نصف انچ لمبی کئی ٹانگیں تھیں اور یہ سب ٹانگیں تیزی سے حرکت کر رہی تھیں۔ میں نے آگے بڑھ کر غور سے دیکھا اور میرے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔ خدا کی پناہ.....

یہ تو چھ ٹانگوں والی چھوٹی سی ایک مکڑی تھی۔ اس کی ٹانگوں پر باریک باریک بال بھی تھے اور وہ سرجن کی انگلیوں میں دبی ہوئی بری طرح ٹانگیں چلا رہی تھی۔۔۔

"مکڑی؟" میں چلا اٹھا۔ "جنرل لوسائی کی کھوپڑی میں مکڑی؟"

"ہاں۔" سرگورمین نے اثبات میں گردن ہلا کر جواب دیا۔ "قیاس کچھ ایسا تھا کہ جب کار کا حادثہ ہُوا اور جنرل لوسائی کو لے کر اس افریقی گاؤں کے چھوٹے ہسپتال میں چھوڑ کر آیا' تو یہ مکڑی بے ہوش جنرل کے قریب آئی۔ اس وقت یا تو یہ اس بستر پر پہلے سے موجود ہوگی یا چھت پر سے گری ہوگی۔ بہر حال یہ کسی طرح جنرل کے چہرے پر رینگ گئی' پھر اس نے جنرل کے نتھنوں کا رخ کیا۔ بایاں نتھنا اسے گرم لگا اور وہ اندر چلی گئی۔ جنرل کو پتا بھی نہ چلا کہ ایک ننھا سا جاندار کیڑا اس کی ناک کے راستے دماغ کی جانب بڑھ رہا ہے.....وہ بے ہوش پڑا تھا۔ بعد میں جب اسے سردرد کے دورے پڑنے لگے' تو اس کی وجہ بھی یہی منحوس مکڑی تھی جو اس کا دماغ چاٹتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔۔۔۔"

"خدا کی پناہ!" میں نے دہشت سے تھرا کر کہا۔ "واقعی یہ اذیت تو ناقابلِ برداشت ہوگی"۔۔۔۔

"بلاشبہ یہ جنرل کا حوصلہ تھا کہ برداشت کر گیا۔" سرگورمین نے کہا۔ "بہر حال مکڑی نکل گئی۔ آپریشن کامیاب رہا۔ چند روز جنرل لوسائی ہسپتال میں رہا۔ اس کا سردرد جاتا رہا تھا اور تیزی سے اس کی گم شدہ صحت واپس آ رہی تھی۔ سب خوش تھے۔ چند ماہ کے اندر اندر وہ پوری طرح ٹھیک ہو گیا۔ اگرچہ اسے کسی قدر جسمانی نقاہت محسوس ہوتی تھی لیکن وہ بضد تھا کہ اسے دفتر جانے اور اپنی مصروفیات میں ڈوب جانے کی اجازت دے دی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جس روز وہ طویل غیر حاضری کے بعد دفتر آیا' تو پورے عملے نے خوشی کا اظہار کیا اور جنرل کو نئی زندگی پانے پر مبارک باد دی۔"

"کیا اسے بتا دیا گیا تھا کہ آپریشن کے بعد اس کے دماغ میں سے زندہ مکڑی برآمد ہوئی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں نہیں۔ ڈاکٹروں نے سختی سے ہدایت کی تھی کہ جنرل کو یہ بات ہرگز معلوم نہ ہو' ورنہ اس کے ذہن اور اعصاب اس خبر سے متاثر ہو سکتے ہیں' ویسے بھی یہ بات اسے بتانا مناسب نہ تھی۔ چنانچہ ایسا کوئی ذکر اس کے سامنے نہ آیا۔ میرے اور دو تین ڈاکٹروں یا اس نرس کے علاوہ مکڑی کا راز کسی اور کو معلوم بھی نہ تھا۔ بہر حال دن گزرتے گئے۔ جنرل روز بروز کھوئی توانائی حاصل کرتا گیا۔۔۔

"ایک دن جبکہ ایمبیسی کی عمارت میں سب لوگ خاموشی سے اپنے اپنے کام میں مصروف تھے' جنرل لوسائی کے کمرے سے ہولناک چیخوں کی آوازیں بلند ہوئیں۔ پہلے تو سب کے سب سکتے میں آ گئے کہ شاید ان کے کان بج رہے تھے' لیکن جب یہ آوازیں تیز ہو گئیں' تو اٹھ کر جنرل کے کمرے کی طرف دوڑے۔ ایک بار پھر سب نے دیکھا کہ بدنصیب آدمی فرش پر پڑا تڑپ رہا ہے۔ وہی درد دوبارہ لوٹ آیا تھا اور اس مرتبہ پہلے سے بھی زیادہ تکلیف تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جنرل کی بینائی اچانک غائب ہو گئی اور اس کے ہوش و حواس بالکل جواب دے گئے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ وہ قطعی پاگل ہو چکا تھا"۔

"اف۔" میں نے کہا۔ "غالباً کوئی اور مکڑی اس کے دماغ میں رہ گئی ہوگی"۔

"نہیں صاحب! کوئی اور مکڑی اس کے دماغ میں نہ تھی۔"

"پھر خدا کے واسطے جلد بتائیے سرگورمین کہ آخر تھا کیا؟" میں نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

اس نے میرے سوال کو نظرانداز کر کے اپنی کہانی جاری رکھی۔

"جیسا کہ میں نے کہا جنرل لوسائی پاگل ہو چکا تھا۔ ایک بار پھر اسے اسی ہسپتال میں لے جایا گیا جہاں ڈاکٹروں نے اس کی کھوپڑی کا آپریشن کیا تھا۔ اتنی جلد دوسرا آپریشن کرنا ممکن نہ تھا اور یوں بھی محض اس شبے پر کہ کوئی اور مکڑی دماغ میں نہ ہو' آپریشن نہیں کیا جا سکتا تھا یا جب تک یقین نہ ہو جاتا۔ دوسری طرف لوسائی کو مکان میں قید رکھنا محال تھا۔ لہٰذا اسے پاگل خانے میں داخل کرا دیا

گیا۔ پہلے پہل میں روزانہ ہی اسے دیکھنے جاتا تھا مگر بعد میں جانا چھوڑ دیا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ دیکھ ہی نہ سکتا تھا کہ اس سے ملاقات کے لئے کون آیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کی دماغی حالت بے حد ابتر تھی' اگر وہ دیکھنے کے قابل ہوتا تب بھی کسی کو پہچان نہیں سکتا تھا۔ چند دنوں کے اندر اندر وہ بتاشے کی طرح گھل گیا اور ایسا نظر آنے لگا کہ چند روز کا مہمان ہے۔۔۔۔۔

"ایک دن وہ سرجن اسے دیکھنے پاگل خانے گیا جس نے اس کا پہلی بار آپریشن کیا تھا۔ وہاں اس نے جنرل کا اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد یہ رائے ظاہر کی کہ مریض بلاشک وشبہہ موت کی سرحد تک پہنچ چکا ہے اور اس میں زندگی کے آثار مفقود ہوتے جارہے ہیں! تاہم تجربے کے لیے ایک اور آپریشن کرنا غیر مناسب نہ ہوگا۔ ممکن ہے قدرت مدد کرے۔ سب نے اس رائے پر غور کیا اور فیصلہ ہُوا کہ جنرل کا دوسرا دماغی آپریشن ہو جانا چاہیئے اس مقصد کے لیے ایک تاریخ مقرر کردی گئی اور اس روز پھر جنرل لوسائی کو پہیوں والی کرسی پر بٹھا کر اسی آپریشن تھیٹر میں لایا گیا۔ ایک بار پھر میں نے اپنے آپ کو اسی چیمبر میں بیٹھے پایا۔۔۔۔

"آپریشن کا نازک مرحلہ شروع نہوا۔ تھیٹر میں موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ ڈاکٹر اور نرسیں یوں حرکت کر رہے تھے جیسے قبرستان میں سفید کفن لپیٹے ہوئے مُردے چل پھر رہے ہوں۔ میرا دوست آپریشن ٹیبل پر بے ہوش پڑا تھا۔ اس کی کھوپڑی کھولی جاچکی تھی۔ دفعتہ" میں نے چیخوں کی آوازیں سنیں' میں چیمبر سے نکلا اور آپریشن ٹیبل کے قریب آیا۔ سب ڈاکٹر پرے ہٹ کر کھڑے تھے اور دبی دبی چیخیں انہی کے منہ سے نکل رہی تھیں۔ میں نے آگے جھک کر جنرل کی لہولہان کھوپڑی کو دیکھا اور میں بھی بری طرح چیخنے لگا"۔

"کیا دیکھا آپ نے سرگومین؟" میں نے بے چین ہوکر پوچھا۔

"مت پوچھو کیا دیکھا۔ خدایا....." وہ ہانپ کر بولا۔ "کیا مرتے دم تک میں وہ تماشا بھول سکوں گا؟ نہیں' کبھی نہیں ..... جنرل لوسائی کے دماغ پر ننھی ننھی سی

ہزار مکڑیاں رینگ رہی تھیں ..... ان کی جسامت چھوٹی سیاہ گھریلو چیونٹیوں کے برابر ہوگی..... آف کیسا مکروہ منظر تھا..... ہم میں سے کسی کو جرأت نہ تھی کہ آگے بڑھے اور ان منحوس کیڑوں کو وہاں سے ہٹادے ..... جنرل لوسائی بے ہوش پڑا تھا..... چند لمحے بعد پتا چلا کہ وہ مرچکا ہے"۔

میں اور گورمین دیر تک خاموش بیٹھے رہے آخر میں نے جرأت کرکے پوچھ لیا۔

"سمجھ میں نہیں آیا کہ اتنی ساری مکڑیاں جنرل کی ناک میں سے ہوکر دماغ میں کیونکر پہنچ گئیں؟"

"یہ بات نہیں تھی"۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "بلکہ یہ سارا فساد اس پہلی مکڑی کا پھیلایا ہوا تھا۔ وہ مادہ تھی اور اس نسل کی مکڑی میں سے تھی جو ہر تین مہینے انڈے دیا کرتی ہیں۔ جن دنوں وہ جنرل کی ناک میں داخل ہوئی تھی' وہ اس کے انڈے دینے کا زمانہ تھا' چنانچہ جنرل کے دماغ سے زیادہ بہتر اور محفوظ جگہ اسے کوئی اور نہ ملی جہاں اس کے انڈوں سے بچے بن گئے اور انہیں حسبِ خواہش گرمی بھی نصیب ہوگئی جو زندہ رہنے کے لئے ضروری تھی ---- جب تک یہ بچے حرکت کرنے کے قابل نہ تھے۔ جنرل ٹھیک ٹھاک رہا لیکن جونہی ان کی ٹانگوں میں حرکت پیدا ہوئی' سردرد لوٹ آیا..... اور چونکہ یہ تمام مکڑیاں آنکھوں کے علاقے میں گھوم رہی تھیں اس لیے جنرل کی بینائی جاتی رہی"۔

اگلے روز میں سینٹ جان کے قبرستان میں جنرل لوسائی کی قبر پر کھڑا تھا۔ میں نے تصور کی آنکھوں سے جنرل کی مسخ شدہ لاش تابوت کے اندر پڑی دیکھی اور اس خیال ہی سے میرا جسم کانپ اٹھا کہ مرنے والے نے کیسے بھیانک اور تکلیف دہ تجربے سے گزر کر موت کا ذائقہ چکھا۔ یکایک میں نے پتلون کے اندر پنڈلی کے پاس ایک چبھن اور سرسراہٹ سی محسوس کی جیسے کوئی کیڑا رینگ رہا ہو۔ پتلون کا پائنچہ الٹ کر میں نے دیکھا اور ایک لمحے کے لیے مجھ پر سکتہ طاری ہوگیا۔ یہ بھورے رنگ کی چھ ٹانگوں والی ایک ننھی سی مکڑی تھی جو قبر کی مٹی میں سے

نکل کر نہ جانے کس وقت میری پتلون کے اندر چڑھ گئی تھی۔ میں نے دیوانوں کی طرح اسے یوں جھٹکا جیسے وہ مکڑی نہیں کوئی زہریلا سانپ تھا۔ ننھی مکڑی میرے پر گر کر ایک ثانیئے کے لیے رُکی' پھر تیزی سے چلتی ہوئی لمبی گھاس میں گم ہو گئی-----

کارمیلا

"کارمیلا" آج سے ایک سو بیس برس پہلے یعنی ۱۸۷۱ء میں پہلی بار لندن کے ایک رسالے' ڈارک بلیو میگزین' میں شائع ہوئی۔ اس کے مصنف کا نام جوزف شیریڈان لی فانو ہے جو وکٹورین عہد کا نامور افسانہ نویس تھا۔ خاص طور پر پُراسرار کہانیاں لکھنے میں صفِ اول کا ادیب سمجھا جاتا۔ یہ وہ دور تھا جب خون آشام انسانی بلاؤں کے بارے میں کہانیاں کہنے اور لکھنے کا آغاز انگلستان میں ہوا تھا۔ برام سٹوکر کی شہرۂ آفاق کہانی "ڈریکولا" بھی اسی دور کی پیداوار ہے۔ یہ ناول ۱۸۹۸ء میں پہلی بار شائع ہوا۔

"کارمیلا" ویمپائر ایج (VAMPIRE AGE) کی بہترین کہانیوں میں شمار ہوتی ہے۔ اردو زبان میں اسے پہلی مرتبہ منتقل کیا جارہا ہے۔ میں نے ضرورت کے تحت آزاد ترجمے سے کام لیا اور موجودہ ماحول کو سامنے رکھتے ہوئے کہیں کہیں معمولی سے اضافے بھی کیے ہیں جس سے کہانی کی اصل دلچسپی اور پلاٹ میں کوئی فرق نہیں پڑا۔

مقبول جہانگیر

آج اتنے برس گزر جانے کے بعد اپنی زندگی کا یہ عجیب مگر نہایت ہولناک واقعہ لکھنے بیٹھی ہوں۔ ممکن ہے بعض قارئین میری اس کہانی کو حقیقت کے بجائے محض افسانہ سمجھیں اور اگر وہ ایسا خیال کریں' تو انہیں مطمئن کرنے کے لیے میرے پاس کوئی واضح دلیل نہیں۔ ان لوگوں کے لئے جو عقل' سائنس یا مادے پر ایمان رکھتے ہیں' شاید یہ داستان من گھڑت قصے سے زیادہ حیثیت نہ رکھے گی' لیکن جو مادے سے ہٹ کر ایک پُراسرار روحانی دنیا کے قائل ہیں' ان

کے لیے یقیناً" سوچنے سمجھنے اور غور کرنے کا خاصا مواد ہے۔

میری پیدائش جنوب مشرقی آسٹریا کے دور افتادہ صوبے سٹریا کے ایک عظیم الشان قدیم قلعے میں ہوئی۔ میرے والد انگریز تھے اور ان کی عمر کا بڑا حصہ آسٹریا میں گزرا اور انہوں نے اپنے کاروبار کے ذریعے اتنی دولت یہاں پیدا کرلی کہ ایک پُر شکوہ قلعے کے مالک ہونے کے ساتھ ساتھ انہوں نے ایک وسیع و عریض جنگل اور اس کی نواحی زمین بھی خرید لی۔ کبھی کبھی وہ اپنے وطن انگلستان کا ذکر نہایت والہانہ انداز میں کرتے اگرچہ وہ جرمن زبان بڑی روانی سے بولتے اور انہوں نے مجھے بھی یہ زبان سکھائی تھی۔ مجھ سے ہمیشہ اپنی قومی زبان انگریزی ہی میں بات کرتے تھے۔

اس قدیم' لیکن شان و شوکت کے ہر ممکن سامان سے معمور قلعے میں ہمارے شب و روز نہایت شاہانہ انداز سے گزر رہے تھے۔ گردو نواح میں دور دور تک کوئی آبادی نہ تھی' البتہ دائیں بائیں چند میل کے فاصلے پر بعض اور اُمرا کے مکان تھے جن سے مہینے میں ایک آدھ بار ہماری ملاقات ہو جاتی۔ میرے والد ابتدا میں آسٹرین حکومت کی ملازمت میں رہے اور ریٹائر ہونے کے بعد تجارت کرنے لگے۔ جس میں توقع سے زیادہ کامیابی نصیب ہوئی۔

جس قلعے کا ذکر میں کرتی ہوں' وہ سرسبز پہاڑی پر سیاہ پتھر سے بنایا گیا تھا۔ اس کے تین طرف سنگلاخ چٹانیں سینہ تانے کھڑی تھیں اور ایک جانب حدِنگاہ تک گھنا جنگل تھا جس میں پتلی سی پگڈنڈی' سانپ کی مانند بل کھاتی گزرتی۔ صدیوں سے لوگوں کی آمدورفت کا یہی واحد راستہ تھا۔ قلعے سے کچھ فاصلے پر گہری خندق پانی سے لبریز رہتی اور جب میں نے ہوش سنبھالا اس میں پانی بہت کم رہ گیا اور زیادہ تر کیچڑ' کائی' گھاس پھونس اور چھوٹے بڑے پتھروں سے بھر گئی تھی۔ اس پر جابجا قلعے کے مختلف چھوٹے بڑے دروازوں تک جانے کے لئے لکڑی کے پل بنائے گئے تھے اور اب یہ نہایت خستہ حالت میں تھے اور جب کوئی گھوڑا گاڑی ان پلوں پر سے گزرتی تو ہر لمحہ خوف رہتا بس پل گرا۔ والد نے بعد میں سب پل بند کرا دیئے اور صرف ایک کھلا رہنے دیا جو قلعے کے بڑے دروازے کے سامنے

واقع تھا۔

ہمارے وسیع اور گھنے جنگل میں جنگلی جانوروں کی کثرت تھی..... خصوصاً" گیدڑ اور سؤر تو ان گنت تھے۔ کبھی کبھار ارد گرد کے اُمرا شکاری کتے اور توڑے دار بندوقیں لے کر آجاتے اور کئی کئی دن تک ہنگامہ برپا رہتا۔ جنگل کے اندر مختلف مقامات پر ندیاں اور جھیلیں بھی تھیں جو گرمیوں کے موسم میں پہاڑی چشموں کے ٹھنڈے اور شیریں پانی سے لبریز رہتیں اور ان کے کناروں پر لاتعداد حسین پھول کھلا کرتے۔ چاندنی راتوں میں یہاں کی سیر زندگی کے ان حسین خوابوں کا ایک حصہ تھی جو نا قابل فراموش ہوتے ہیں۔ والد ہمیشہ میرے ساتھ ہوتے اور ان کے پاس بھرے ہوئے پستول کے علاوہ بندوق بھی ہوتی' لیکن ہمیں کبھی کسی حادثے کا سامنا نہ کرنا پڑا..... والد نے ایک مرتبہ بتایا قلعے سے لے کر دائیں ہاتھ یہ جنگل پندرہ میل لمبا اور بائیں ہاتھ بارہ میل چوڑا ہے۔ ساتویں میل پر جنگل کے اندر اجڑی ہوئی بستی کے آثار ہیں اور بیس میل کے فاصلے پر ایک قدیم عمارت واقع ہے جس میں فوج کا ریٹائر جنرل سپل ڈاروف رہتا ہے۔ اس کی رہائش سے تین میل دور ایک اور بستی کے آثار نظر آتے ہیں۔ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دو سو برس قبل یہاں آفت نازل ہوئی تھی۔ اب وہاں قدیم قبرستان میں چند ٹوٹی پھوٹی قبروں کے نشان' چند مکانوں کے خستہ دروازوں اور کھڑکیوں اور میلوں تک ملبے کے ڈھیر دیکھ کر دل کانپنے لگتا ہے۔ لوگوں کا خیال ہے یہاں اس زمانے میں آسمان سے بد روحیں آئی تھیں اور ابھی تک ان کا اثر ہے۔ بعض یہ بھی کہتے کہ بدروحیں نہیں آئیں' بلکہ اسی آبادی میں پہلے سے انسانوں کی شکل میں موجود تھیں اور یہ کارن سٹین خاندان کے افراد تھے جنہوں نے بلاؤں کا روپ دھارلیا۔ ان کے بوسیدہ اور ڈراؤنے مقبرے آج بھی وہاں دیکھے جاسکتے ہیں جس پر کتبے لگے ہیں۔ یہ خاندان کسی دور میں اس پورے علاقے کا حکمران تھا' پھر ان لوگوں نے سفاکی' بہیمیت اور ظلم کی انتہا کردی۔ اس خاندان کی عورتیں اور مرد اس حد خونخوار تھے کہ وہ زندہ انسانوں کے گلے کاٹ کر ان کا

خون پی لیتے اور گوشت کچا ہی کھا جاتے۔ میرے والد کو ان داستانوں پر بالکل یقین نہ تھا اور ایسی باتیں سن سن کر خوب ہنستے۔ تاہم اس ویران بستی میں جاتے ہوئے ڈر انہیں بھی لگتا جس کا اظہار کئی بار انہوں نے مجھ سے کیا۔

سرِ شام ہی جنگل پر ہولناک تاریکی چھا جاتی اور گیدڑوں کی چیخ پکار بلند ہونے لگتی اور ہمارے قلعے میں بھی پُراسرار سا ماحول بیدار ہوتا چلا جاتا۔ لمبی راہداریوں میں سائے سے رقص کرنے لگتے اور صبح ہونے تک کوئی بھی اپنے کمرے سے باہر نہ نکلتا ' گیلریوں اور ہال کمروں میں مومی شمعیں روشن کردی جاتیں لیکن ان کی روشنی وسیع وعریض کمروں کو تاریکی سے محفوظ رکھنے میں ناکام دکھائی دیتی۔ آسمان پر بڑی بڑی چمگادڑیں پھڑپھڑاتی ہوئی اڑا کرتیں اور چاندنی راتوں میں نہ جانے وہ کہاں سے آجاتیں' جن کے بازو کئی کئی فٹ لمبے اور آنکھیں مشعلوں کی مانند روشن ہوتیں۔ انہوں نے کبھی انسانوں پر حملہ نہیں کیا لیکن نہ جانے انہیں دیکھ کر خوف کیوں آتا تھا؟

قلعے کی دنیا مختصر افراد پر مشتمل تھی۔ چار پانچ نوکر' دو خادمائیں' ایک میرے والد اور ایک خود میں ..... ان دنوں میری عمر مشکل سے اٹھارہ انیس برس تھی اور میرے والد بڑھاپے کی طرف تیزی سے جارہے تھے۔ ان کے قویٰ میں پہلی سی تیزی اور چستی نہ رہی تھی۔ میری ماں میری پیدائش کے دوران ہی میں انتقال کر گئی اور والد نے مجھے بڑی محبت اور شفقت سے پرورش کیا' انہوں نے ایک شفیق اور خود دار خاتون میری دیکھ بھال کے لیے ملازم رکھ لی اور سچ یہ ہے کہ اس عورت نے اپنی جانب سے مجھے ماں کی محبت اور پیار دینے میں کبھی کوتاہی نہ کی۔ اس شفیق خاتون کا نام مادام پیری ڈون تھا اور اس کو کبھی اپنے سے جدا نہ پایا اور اس کی موجودگی میں مجھے کبھی ماں کی کمی محسوس نہ ہوئی۔ مادام پیری ڈون کے علاوہ ہمارے گھر میں دوسری عورت مادام لافونٹن تھی جس کا کام ملازموں کی نگرانی اور گھر کا حساب کتاب رکھنا تھا۔ نہایت شریف' دیانت دار اور محبت کے جذبات سے لبریز عورت۔ فرانسیسی اور جرمن زبانیں بے تکلفی سے بولتی اور مادام پیری

کے بعد ہمارے گھر میں اس کا دوسرا درجہ تھا۔ رات کھانے کی میز پر جب وہ نہ آجاتی' کھانا شروع نہ ہوتا' کبھی کبھار گردونواح کے آسرائی لڑکیاں کئی دن ہمارے ہاں قیام کرتیں اور یوں میرے جی کے بہلنے کا سامان ہو جاتا۔ میں کہیں نہ جاسکتی تھی، ہمیشہ ان دونوں خواتین میں سے کوئی نہ کوئی میرے ساتھ ہوتی یا میرے والد میرے ہمراہ ہوتے۔ بچپن کے زمانے میں کئی برس تک مادام پیری ڈون میرے کمرے میں سویا کرتی اور جب میں بڑی ہوئی' تب وہ الگ کمرے میں سونے لگی۔

بچپن کے دور کا ایک عجیب واقعہ سناتی ہوں۔ ایک ایسا واقعہ جو میرے ذہن پر ہمیشہ کے لیے نقش ہوگیا۔ میری عمر چھ سات سال کی ہوگی' قلعے کی دوسری منزل پر میری خواب گاہ تھی۔ مادام پیری ڈون کا بستر میرے ہی کمرے میں دوسری دیوار کے ساتھ بچھا رہتا تھا۔ یہ کمرہ خاصا وسیع اور اس کی جنوبی شمالی دیواروں میں کھڑکیاں تھیں جن پر بھاری ریشمی پردے پڑے رہتے۔ کمرے کی چھت لکڑی کی تھی اور کونوں میں مکڑیوں نے بڑے بڑے جالے تن رکھے تھے۔

وہ سردیوں کی ایک رات تھی۔ میں اپنے گرم بستر میں لیٹی بے خبر سو رہی تھی۔ دفعتاً میری آنکھ کھل گئی۔ شمع بجھ چکی تھی اور ہر طرف گہری تاریکی تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گئی اور خوف زدہ ہوکر مادام پیری ڈون کو آوازیں دیتی رہی' کوئی جواب نہ ملا۔ چند لمحے بعد میری آنکھیں اندھیرے میں واضح طور پر دیکھنے لگیں اور مجھے کچھ یوں نظر آیا جیسے میری نرس اپنے بستر پر موجود نہیں۔ تنہائی کا احساس ہوتے ہی خوف کی ایک لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ میں نے گھٹی گھٹی آواز میں نرس کو پھر پکارا' لیکن جواب ندارد۔ میں اپنے پلنگ سے نیچے اترنے ہی والی تھی کہ مجھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا' جیسے کوئی لمبے لمبے سانس لے رہا ہو' پھر عجیب سی خوشبو میری ناک میں آئی۔ تب میں نے ایک نوجوان اور حسین عورت کو اپنے پلنگ کی پائنتی کھڑے پایا۔ اس کا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح روشن اور آنکھیں ستاروں کی مانند روشن تھیں اور وہ سر سے پیر تک سیاہ رنگ

کے لبادے میں لپٹی تھی۔ اس کے ہونٹ کبوتر کے خون جیسے سُرخ تھے۔ میں ا
دیکھ کر سکتے کے عالم میں رہ گئی۔ وہ ہلکے ہلکے مسکرائی اور اس کے موتیوں ا
سفید سفید دانت نمایاں ہوگئے۔ اب وہ پائنتی سے ہٹ کر میرے اور قریب آ
اور اس نے جھک کر اپنا ایک ہاتھ میرے کندھے پر رکھ دیا۔ مجھے اس سے ذرا
نہ لگا اور میں بھی اسے دیکھ کر مسکرائی اور میں نے گویا خوش ہو کر پوچھا۔

"آپ کون ہیں اور میری نرس کہاں گئی؟"

وہ کھلکھلا کر ہنسی اور مجھے یوں لگا جیسے کہیں دور گھنٹیاں سی بج رہی ہوں
اب وہ میرے بستر پر بیٹھ گی اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگی۔ م
اختیار میں نے اس کی گود میں اپنا سر رکھ دیا اور اس نے دونوں ہاتھوں سے مجھے
لپٹا لیا اور پھر میں گہری نیند میں ڈوبتی چلی گئی۔ پھر دفعتہ" ایسا لگا جیسے دو سوئیاں
میرے گلے میں چبھی ہوں۔ درد کی شدت سے میری چیخ نکل گئی اور ایک بار پھ
آنکھ کھلی' میں نے دیکھا وہ حسین و جمیل عورت میرے ساتھ ہی بستر پر لیٹی ہے
اچانک وہ بستر سے اٹھی اور آہستہ سے نیچے اتر گئی۔ میں نے خیال کیا شاید پلنگ
کے نیچے چھپ گئی ہے۔

وہشت کے مارے پوری قوت سے میں چیخ اٹھی۔ چند لمحوں بعد مادام پیر
ڈون' مادام لافونٹن اور دوسرے نوکر دوڑے ہوئے آئے۔ انہوں نے بجھی ہوئی
شمع روشن کی' مجھے دلاسا دیا اور پوچھا' کیا ہوا؟ میں نے روتے ہوئے پورا واقعہ
سنایا۔ انہوں نے کمرے میں ادھر ادھر دیکھا' ایک ایک گوشہ اور ایک ایک کو
چھان مارا' مگر اس حسین عورت کا کہیں پتا نہ چلا۔ نوکروں اور نرسوں کا خیال تھ
میں خواب دیکھ کر ڈر گئی! تاہم ان کے چہرے بھی خوف سے زرد تھے۔ ایک بار
سبھی نے کمرہ خوب دیکھا بھالا۔ دفعتہ" مادام لافونٹن نے میرے بستر کی طرف
دیکھا' خوف سے اس کے ہونٹ لرزنے لگے' اس نے نرس سے کہا۔

"خدا کی پناہ..... لڑکی سچ کہہ رہی ہے..... دیکھو' اس کے بستر پر ضرور
کوئی لیٹا رہا ہے..... یہ سلوٹیں صاف بتا رہی ہیں....." پھر اس نے وہاں

ہاتھ لگایا اور بولی "یقیناً" یہاں کوئی لیٹا رہا ہے ..... بستر کا یہ حصہ
ابھی تک گرم ہے ....."

مادام پیری ڈون اور دوسرے نوکروں نے بھی ہاتھ لگا لگا کر میرا بستر دیکھا۔
اور تصدیق کی کہ مادام لافونٹن کی رائے درست ہے۔ پھر میں نے انہیں بتایا میری
گردن میں سخت تکلیف ہو رہی ہے تب انہوں نے میری گردن دیکھی بھالی اور کہا'
یہاں تو کوئی نشان نظر نہیں آتا۔

قصہ مختصر' سب کے سب باقی تمام رات میرے ہی کمرے میں رہے اور آپس
میں باتیں کرتے سنائی دیے۔ اگلے روز انہوں نے والد سے اس کا ذکر کیا۔ انہوں
نے وہم سمجھ کر بات ختم کردی۔ البتہ ہدایت کی کہ نرس اپنا پلنگ میرے پلنگ کے
ساتھ ہی بچھایا کرے۔

ابتدا میں بہت عرصے تک یہ واقعہ میرے ذہن میں تازہ رہا۔ اس نوجوان
حسین عورت کا چہرہ ہر رات میری نگاہوں کے سامنے تصور ہی تصور میں نمودار
ہوتا۔ مجھ پر اس کا ایسا خوف تھا کہ ذرا سی آہٹ یا پردے کی سرسراہٹ سنتے ہی
چونک چونک اٹھتی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ میں بیمار پڑ گئی اور میرا اعصابی نظام
درہم برہم ہوگیا۔ آخر ایک دن والد نے ڈاکٹر طلب کیا جو بیس میل دور رہتا تھا۔
وہ اپنی گھوڑا گاڑی میں بیٹھ کر آیا۔

ڈاکٹر میرے والد کا ہم عمر تھا اور بے حد سنجیدہ۔ اس نے دیر تک میرا معائنہ
کیا۔ اور کہا' گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں ..... یہ محض عارضی کیفیت ہے۔ پھر اس
نے اپنے تھیلے میں سے دوائیں نکالیں۔ انہیں استعمال کرنے کے طریقے بتائے'
اپنی فیس وصول کی اور چلا گیا۔ وہ ہفتے میں ایک بار خود آتا' مجھے دیکھتا اور چلا
جاتا۔ چند روز تک میں نے دوائیں کھائیں' پھر چھوڑ دیں ..... دواؤں سے مجھے کبھی
دلچسپی نہ رہی۔ البتہ اکیلے میں مجھے ڈر لگنے لگا۔ دن رات کے ہر لمحے میں کوئی نہ
کوئی فرد میرے ساتھ رہنے پر مجبور تھا۔

کبھی کبھی والد میرے پلنگ کے قریب آن کھڑے ہوتے اور ہنس ہنس کر مجھ

سے باتیں کرتے۔ مادام پیری ڈون بڑی بھولی طبیعت کی تھی' والد اس سے بھی مذاق کرتے رہتے اور میں ہنس پڑتی۔ یہ تمام باتیں محض مجھے خوش کرنے کے لیے کرتے۔ پھر وہ میری پشت تھپتھپاتے اور کہتے۔

"خوابوں پر یقین نہیں کیا کرتے۔ ایسے ڈراؤنے خواب تو ہر شخص دیکھتا ہے اگر ہم خواب دیکھ دیکھ کر ڈرنے لگیں' تو بس جی چکے"۔

وہ جب تک خوش طبعی سے باتیں کرتے' تو خوف میرے نزدیک نہ آتا لیکن جونہی وہ رخصت ہوتے' وحشت کی نامعلوم سی لہر آتی اور مجھے اپنے ساتھ بہاکر لے جاتی۔ پھر وہی حسین چہرہ اور سر سے پاتک سیاہ لبادے میں لپٹا ہوا جسم میری نگاہوں کے سامنے رقص کرتا اور میں تھر تھر کانپنے لگتی اور بخار بھی چڑھ جاتا۔ سب لوگ یہی یقین دلانے کی کوشش کرتے' میں نے خواب دیکھا ہے۔

مادام پیری ڈون نے ایک بار قسم کھاکر مجھ سے کہا۔

"پیاری لڑکی' سچ کہتی ہوں' وہ تو میں خود تھی..... تم نے مجھے پہچانا ہی نہیں ..... میں نے اس روز سیاہ لبادہ پہنا تھا اور میں ہی تمہارے پاس بستر میں لیٹی تھی....."

بھلا میں اتنی بیوقوف تو نہ تھی کہ اس حسین و جمیل چمکتے چہرے اور مادام پیری ڈون کے پھولے ہوئے گالوں میں تمیز نہ کر سکتی' تاہم میں نے ایسا ظاہر کیا جیسے مجھے نرس کی بات کا یقین آگیا ہو۔

اس واقعے کو کئی برس بیت گئے' میں عمر کی چودہ حدیں پھلانگ چکی تھی کہ ایک اور حیرت انگیز واقعہ پیش آیا۔ وہ گرمیوں کی ایک دلآویز اور خوشگوار شام تھی۔ گذشتہ کئی ہفتوں سے گرمی پڑ رہی تھی اور آسمان پر دور دور تک بادل کا نام و نشان نہ تھا۔ سہ پہر کے وقت یکایک مغرب کی جانب سے ابرِ سیاہ کا ایک ٹکڑا اٹھتا نظر آیا اور اس کے ساتھ ہی فضا کی حدت کم ہوتی گئی۔ والد اس روز اپنے کمرے میں بیٹھے نہ جانے کیا کر رہے تھے' جونہی انہیں اس خوشگوار موسم کا

احساس ہوا اپنے کمرے سے نکل کر میرے پاس آئے اور کہنے لگے۔

"جی چاہتا ہے آج ہم دونوں جنگل کی سیر کر چلیں۔ کیا خیال ہے؟"

"ضرور۔ میں آپ سے یہ بات کہنے ہی والی تھی" میں نے خوش ہوکر کہا۔ والد نے چھڑی ہاتھ میں لی' بندوق کندھے سے لٹکائی اور سیر کے لیے تیار ہوگئے۔

جب پل پر سے اتر کر جنگل کو جانے والی پگڈنڈی پر آئے تو والد نے کہا۔

"جنرل ڈاروف کے آنے کی امید تھی' لیکن افسوس وہ اب کچھ عرصے تک نہ آسکیں گے"۔

میرے لیے یہ خبر رنج کا باعث ہوئی اس لیے کہ میں جنرل ڈاروف کی آمد کا شدت سے انتظار کر رہی تھی۔ اس کی بھتیجی میری ہم عمر تھی اور میں اس سے پہلی بار ملنے والی تھی۔ میں نے سنا تھا' وہ بہت ہی پیاری اور ہنس مکھ لڑکی ہے۔ جنرل ڈاروف نے والد کو اپنی آمد کی اطلاع کئی ہفتے قبل دی تھی اور اگلے روز وہ ہمارے قلعے میں پہنچنے والا تھا۔ جنرل سے زیادہ مجھے اس کی بھتیجی این سے ملنے کا اشتیاق تھا اور میں واقعی ان کی آمد کا ایک ایک دن بے چینی سے گن رہی تھی۔

"آخر وہ کب تک آئیں گے؟" میں نے گلوگیر آواز میں پوچھا۔

"غالباً" موسم خزاں کے بعد ہی آسکیں گے۔" والد نے سرد آہ بھرتے ہوئے جواب دیا۔ یعنی کم از کم دو ماہ بعد..... اور یہ اچھا ہی ہوا ان کی بھتیجی سے تمہاری ملاقات نہ ہوئی"۔

"کیوں؟" میں حیرت سے اپنے والد کو تکنے لگی۔

"وہ مرچکی ہے۔ اگر تم اس سے ملی ہوتیں تو نہ جانے رنج و غم سے تمہارا کیا حال ہوتا۔ مجھے افسوس ہے یہ خبر پہلے نہ سنائی۔ آج صبح جنرل ڈاروف کا خط آیا جس میں اس نے اپنی جان سے عزیز بھتیجی کے مرنے کی اطلاع دی تھی۔ اس وقت تم سو رہی تھیں اور میں نے مناسب نہ سمجھا کہ تمہیں جگا کر یہ منحوس خبر سناؤں"۔

اگرچہ میں نے مس این کو دیکھا نہ تھا۔ لیکن اس کی موت کی خبر نے مجھ

پر سکتے کا عالم طاری ہو کر دیا۔ بے اختیار میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں نے والد کو دیکھا' ان کی آنکھیں بھی تر ہو گئی تھیں اور وہ بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پائے ہوئے تھے۔ چند لمحوں بعد انہوں نے کوٹ کی جیب سے ایک خط نکال کر میری طرف بڑھایا۔

"یہ جنرل کا خط ہے تم خود پڑھ لو۔ مجھے خدشہ ہے وہ اس لڑکی کی موت کا صدمہ برداشت نہ کر سکے گا ۔ اگر وہ یہاں آجائے تو شاید ہم سب مل کر اس کا غم بانٹنے کی کوشش کریں۔ اس کی ساری زندگی فوج میں گزری اور میں جانتا ہوں وہ فولادی اعصاب اور مضبوط دل و دماغ کا آدمی ہے' لیکن وہ اس لڑکی کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا اور اسے ایک پل کے لیے بھی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیتا' کیونکہ وہ اس کے سارے کنبے کی آخری نشانی تھی۔ اب اس کے مرجانے سے جنرل کے دل پر جو بیت رہی ہوگی' اس کا کچھ اندازہ میں کر سکتا ہوں"۔

چیڑ کے چند گھنے درختوں کے نیچے لکڑی کا ایک سالخوردہ بنچ پڑا تھا۔ ہم دونوں اس پر بیٹھ گئے۔ سورج غروب ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی اور مغربی افق پر گہرے نارنجی رنگ کی شفق آہستہ آہستہ سرخی میں بدلتی جارہی تھی' ہوا کے جھونکے دم بدم تیز ہوتے گئے اور اونچے اونچے درختوں کی شاخیں مستی میں جھومنے لگیں۔ میں نے جنرل ڈاروف کا طویل خط دو مرتبہ پڑھا اس کے ایک ایک جملے میں غم و اندوہ کے ہزاروں نشتر چھپے تھے ---- کئی جگہ حروف مٹ یا پھیل گئے تھے اور وہاں کاغذ پر میں جنرل کی آنکھوں سے گرے ہوئے آنسوؤں کے نشان واضح طور پر دیکھ رہی تھی۔ خط پڑھتے پڑھتے میں خود رونے لگی۔ والد نے مجھے اپنے ساتھ پیار سے لپٹا لیا اور کہنے لگے۔

"نہ روؤ پیاری بیٹی' خدا کی حکمت اور مشیت پر صبر کرو۔ میں سمجھتا ہوں' تم نے اپنی ایک ایسی عزیز سہیلی کھودی جسے کبھی دیکھا نہ تھا۔ جنرل ڈاروف کا خط ایک باربلند آواز سے پڑھو تاکہ میں پھر سن سکوں"۔

میں نے رومال سے آنکھیں خشک کیں اور خط پڑھنے لگی۔

پیارے بھائی اور عزیز دوست.... کاش یہ اطلاع تمہیں دینے سے پہلے میں مرچکا ہوتا۔ تم جانتے ہو میرا پورا خاندان فنا ہوگیا اور دنیا میں صرف یہ میری ایک بھتیجی اور میں باقی رہ گئے۔ اب وہ اپنی تعلیم مکمل کرکے ہوسٹل سے واپس میرے پاس آئی تھی اور میں خوش تھا میری تنہائی دور ہوئی۔ تم نے اسے دیکھا تھا نا! کتنی حسین کتنی پیاری' کتنی خوش مزاج اور زندہ دل لڑکی تھی وہ ..... اس میں کیسی رعنائی اور کیسی زندگی تھی..... میں اس کے لیے ویسا ہی شوہر تلاش کرنا چاہتا تھا۔ میری خواہش تھی اس کی شادی کردوں اور اپنی تمام جائیداد اور سارا مال اسی کو دے دوں ..... لیکن آہ! مجھے کیا معلوم تھا وہ صبح کا تارا تھی جو آفتاب کے نکلتے ہی نظروں سے غائب ہو جایا کرتا ہے۔ وہ اچانک ایک پُراسرار مرض میں مبتلا ہوئی' جس نے اسے گھن کی طرح چاٹ لیا اور اس کی رگوں میں سے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا۔ مجھے اندازہ نہ تھا وہ اتنی جلد مجھے چھوڑ کر رخصت ہو جائے گی لیکن ..... وہ چلی گئی۔ اب میرے پاس اس کی یاد میں بہنے والے چند آنسو رہ گئے ..... اور جب وہ جاچکی' تب مجھے اس کی موت کا اصل سبب معلوم ہوا۔ میں صدمے اور طیش میں پاگل ہو رہا ہوں' کاش مجھے پہلے پتا چل جاتا۔ خدا مجھ پر رحم کرے ۔ میں اپنی بھتیجی کی موت کا خود ذمہ دار ہوں۔ میں نے اس کے لیے موت کو ایک حسین و جمیل پیکر میں خود اپنے گھر میں داخل ہونے کی اجازت دی.... یہ حالات اتنے پُراسرار اتنے عجیب اور دہشت انگیز ہیں کہ تم یقین نہ کروگے ، اس دنیا میں ایسا بھی ممکن ہے .... بخدا! مجھ جیسا احمق انسان روئے زمین پر کوئی نہ ہوگا۔ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتا رہا اور کچھ نہ سمجھ سکا۔ میری پیاری لڑکی کا اس حسین بلا نے سارا خون چوس لیا اور میں دم نہ مار سکا۔ کاش! مجھے احساس ہو جاتا... جس بلا نے اسے میرے ہاتھوں سے چھینا ہے' میں مرتے دم تک اسے ڈھونڈتا رہوں گا اور دنیا کو اس کے ناپاک وجود سے پاک کردوں گا۔ اب تو میرے سامنے اندھیرا ہی اندھیرا ہے' تاہم کبھی کبھار امید کی ایک کرن چمک اٹھتی ہے جو یقیناً" میری رہبری کے لئے بہت ہے۔ میں اب اس

بلا کی تلاش میں نکلتا ہوں ، میرے لیے تم دعا کرنا۔ خدا مجھے اپنے اس مقدس مشن میں کامیاب کرے۔ زندہ رہا اور کبھی ملاقات ہوئی تو سارا قصہ زبانی کہوں گا۔ خط میں یہ تمام تفصیلات لکھنا ممکن نہیں۔ میری منزل مقصود اب ویانا ہے۔ مجھے توقع ہے اپنا کام ختم کرنے میں کم از کم دو ماہ لگ جائیں گے اور اگر میں اس بلا کو ختم کر سکا تو ضرور تم سے ملنے آؤں گا ورنہ سمجھ لیتا تمہارا دوست بھی فنا کے گھاٹ اتر چکا..... خدا حافظ..."

ایک بار پھر میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور میں نے سچے دل سے مرنے والی کے حق میں دعائے مغفرت کی۔ والد کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ انہوں نے اذیت ناک خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔

"سمجھ میں نہیں آتا جنرل ڈاروف کس بلا کی تلاش میں ویانا کی طرف روانہ ہوا ہے ۔ میرا خیال ہے صدمے سے اس کا ذہن ماؤف ہوگیا۔ نہ جانے کیونکر اس کے ذہن میں یہ بات سما گئی کہ ایک ناپاک وجود نے اس کی بھتیجی کا خون چوسا ہے..... بہرحال اب دو ماہ بعد ہی صحیح واقعات معلوم ہو سکیں گے۔ اس دوران میں ہمیں صبر سے جنرل کی آمد کا انتظار کرنا ہوگا ..... آؤ' اب گھر چلیں۔ دیکھو سورج غروب ہو گیا اور تاریکی بڑھتی جا رہی ہے۔ چاند تھوڑی دیر بعد نکلے گا۔ آج چودھویں تاریخ ہے....."

ہم واپس قلعے کی طرف چلے اور اب اندازہ ہوا ہم جنگل میں خاصی دور... قریباً" ایک میل اندر تک .... نکل آئے تھے دور ہمارا قلعہ اور والد کے کمرے کی روشنی یہاں سے صاف نظر آرہی تھی۔ جونہی ہم پل کے نزدیک پہنچے سامنے سے کسی گھوڑے کے دوڑنے کی آواز آئی۔ شاید کوئی گھڑسوار اس طرف آرہا تھا۔ ہم نے مادام پیری ڈون اور مادام لافونٹن کو ٹہلتے دیکھا۔ انہوں نے ہمیں اشارے سے سلام کیا اور گردنیں موڑ موڑ کر جنگل میں اس جانب دیکھنے لگیں' جدھر سے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز آرہی تھی ۔ اس طرف پہاڑی کی ڈھلوان تھی اور میں نے دیکھا ادھر سے گہرے سرمئی رنگ کی رقص کرتی ہوئی کہرا دھند آہستہ آہستہ

جمع ہو رہی ہے۔ اسی لمحے مشرقی افق سے چاند کا روشن چہرہ ابھرا اور اس کی روشنی میں پہاڑی کے دامن میں بنا ہوا وہ قدیم مینار دکھائی دیا جس پر کبھی مسلح پہرے دار متعین تھے۔ غالباً" یہ مینار اس راستے اور قلعے کی حفاظت کے لیے بنایا گیا تھا' لیکن اب صدیوں سے ویران پڑا تھا اور اس کے اندر حشرات الارض اور چمگادڑوں نے اپنے اپنے مسکن بنا رکھے تھے۔

"خدا جانے اس وقت کون جنگل سے گزر رہا ہے"۔ مادام پیری ڈون نے کہا۔ "سنا ہے چودھویں کا چاند طلوع ہوتے ہی بدروحیں آزاد ہو جاتی ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے زیرِ لب کچھ پڑھا گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز لحہ بہ لحہ قریب آرہی تھی اور اب یوں لگ رہا تھا جیسے کئی گھوڑے دوڑ رہے ہوں۔ والد محویت کے عالم میں چاند کی طرف تک رہے تھے مادام پیری ڈون کو زیرِ لب کچھ پڑھتے سن کر انہوں نے کہا۔

"مادام تم بھی کیا عجیب بات کرتی ہو۔ بھلا چودھویں کے چاند کا بدروحوں سے کیا تعلق؟ ہاں' میں نے کتابوں میں پڑھا ہے' چاندنی بعض نفسیاتی امراض میں اضافے کا سبب بن جاتی ہے یعنی پاگلوں کا پاگل پن بڑھ جاتا ہے یا چاندنی راتوں میں لوگ ڈراؤنے خواب کثرت سے دیکھتے ہیں۔ خصوصاً" ویسے لوگ جن کے اپنے اعصاب کمزور ہوں۔ بس انہی امراض کا نام وہم پرستوں نے بدروحیں رکھ دیا ہے۔"

"آپ صحیح فرماتے ہیں۔" مادام پیری ڈون نے آہستگی سے کہا۔ "لیکن میں نے ایسے واقعات سنے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے چاندنی راتوں میں بدروحیں بھی سفر کرتی ہیں اور کبھی کبھی خوں آشام چڑیلوں کی شکل میں بھی نمودار ہوتی ہیں ......بہت برس پہلے کی بات ہے' میرا ایک چچا زاد بھائی کسی بحری جہاز پر کپتان کا ساتھی تھا۔ اس نے خود مجھے ایک عجیب واقعہ سنایا۔ کہتا تھا' ایک چاندنی رات کو ہمارا جہاز گہرے سمندر میں سفر کررہا تھا۔ رات کے پچھلے پہر جبکہ چاند پورے جوبن پر تھا' اور سمندر کا منظر نہایت دلفریب ہو رہا تھا' میں جہاز کے عرشے پر پشت

کے بل لیٹا چاند کو تک رہا تھا کہ آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں۔ پھر میں نے خواب دیکھا۔ فضا میں بے شمار ننھے ننھے ذرے رقص کررہے ہیں۔ میرے دیکھتے دیکھتے یہ ذرے جمع ہونے شروع ہوئے' پھر انہوں نے ایک انتہائی حسین و جمیل عورت کی شکل اختیار کرلی۔ یہ عورت سر سے پیر تک سیاہ لبادے میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ روشن اور آنکھیں مشعلوں کی مانند دمکتی ہوئیں اور ہونٹ بے حد سرخ اور جب وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی تو اس کے لمبے نوکیلے سفید دانت چاندنی میں موتیوں کی طرح چمک اٹھے۔ پھر آہستہ آہستہ میرے نزدیک آئی اور مجھ پر جھک گئی.... دفعتہ" میری آنکھ کھل گئی میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور خدا کی قسم وہی عورت جس کو میں نے خواب میں دیکھا تھا' میرے اوپر جھکی مجھے دیکھ رہی تھی۔ خوف سے میری چیخ نکل گئی۔ چند ملاح جو عرشے پر گھوم رہے تھے دوڑتے ہوئے آئے' انہیں آتا دیکھ کر وہ عورت آہستہ آہستہ فضا میں تحلیل ہوگئی...."

مادام پیری ڈون یہ حکایت سنا رہی تھی اور میرے ذہن میں آٹھ سال پہلے کے اس بھیانک واقعے کی یاد تازہ ہورہی تھی جب میں نے آدھی رات کو ایسے ہی ٹیلے کی ایک عورت دیکھی تھی۔ دفعتہ" والد نے ناراض ہوکر اس سے کہا۔

"کیا اوٹ پٹانگ قصے بیان کرتی ہو۔ اتنا بھی خیال نہیں لڑکی ڈر جائے گی۔"

پھر وہ کان لگاکر ٹاپوں کی آواز سننے لگے۔ چند منٹ تک ہم پتھر کے بتوں کی مانند بے حس حرکت کھڑے رہے۔ والد نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ "نہ معلوم کیا بات ہے۔ میرا دل آپ ہی آپ سینے میں بیٹھا جاتا ہے۔ خدا ہم پر رحم کرے۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے جیسے ہم پر کوئی آفت ٹوٹنے والی ہے۔ ممکن ہے جنرل ڈاروف کا غم نامہ پڑھ کر میرے اندر اس احساس نے جنم لیا ہو۔"

عین اسی لمحے ٹاپوں کی آواز اور تیز ہوگئی۔ اب معلوم ہوا گھڑ سوار کے عقب میں کوئی بھاری گھوڑا گاڑی بھی دوڑ رہی ہے۔ پہاڑی سڑکوں اور سنسان جنگل میں اس قسم کی آوازیں دور تک پھیلتی اور دیر تک گونجتی رہتی ہیں۔ چند

ثانیے بعد ہم نے انہیں دیکھ لیا۔ آگے آگے دو گھڑ سوار تھے جو بجلی کی مانند لکڑی کے پل پر سے گزر گئے۔ ان کے پیچھے نہایت شاندار رنگ کی گاڑی تھی جس میں بے حد عمدہ نسل کے چار سیاہ گھوڑے جتے ہوئے تھے۔ دو خادم اس گاڑی کے پیچھے پائیدان پر نہایت مستعدی سے کھڑے تھے۔ صاف ظاہر تھا وہ خاصا طویل فاصلہ طے کر کے آئے ہیں اور یہ بات بھی عیاں تھی کہ اس گاڑی میں اونچی حیثیت کے افراد سفر کر رہے ہیں۔

پل پر سے گزرتے ہوئے یک لخت گھوڑوں نے ٹھوکر کھائی اور آناً" فاناً" گاڑی الٹ گئی۔ کوچبان بھی منہ کے بل گرا مگر فوراً" اٹھ کھڑا ہوا۔ گاڑی کے اندر سے عورتوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں بلند ہوئیں۔ تیز دوڑتے ہوئے گھوڑے کچھ دور تک الٹی ہوئی گاڑی گھسیٹتے لے گئے' پھر رک گئے۔ یہ حادثہ اتنا غیر متوقع تھا کہ دیر تک ہم سب دم بخود اپنی جگہ کھڑے رہے۔ پھر یک لخت والد کو جیسے ہوش آیا۔ انہوں نے مجھے وہیں رکنے کا حکم دیا اور خادموں کو ساتھ لے کر الٹی ہوئی گاڑی کی طرف دوڑے۔

مجھ میں بلاشبہ حرکت کرنے کی ہمت نہ رہی تھی اور میں اس حادثے کی تاب نہ لاکر دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ ڈھانپے کھڑی تھی۔ گاڑی کی جانب سے ابھی تک عورتوں کے چیخنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ یہ آوازیں تھم گئیں تو میں نے ڈرتے ڈرتے منہ پر سے ہاتھ اٹھائے اور ادھر دیکھا در گھوڑے زمین پر گرے پڑے تھے اور بدحواسی سے اچھل رہے تھے۔ پچھلے پائیدان پر کھڑے ہونے والے خادموں میں سے ایک غالباً" مرگیا تھا اور دوسرا زخمی ہونے کے باوجود الٹی ہوئی گاڑی میں سے خواتین کو نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آگے جانے والے دونوں گھڑ سوار ابھی تک شاید حادثے سے بے خبر تھے ورنہ وہ ضرور واپس آجاتے۔

میرے والد نے اس خادم کی مدد سے پہلے ایک عورت کو گاڑی سے باہر نکالا پھر دوسری کو جویا تو بے ہوش تھی یا مرگئی تھی۔ دوسری کو انہوں نے آہستہ سے زمین پر لٹا دیا۔ پہلی عورت طویل قامت اور بھاری جسم کی تھی۔ اس کا چہرہ

نقاب میں پوشیدہ تھا اور وہ ایک لمبا سیاہ کوٹ پہنے تھی۔ اس کے ہاتھ اور برف کی مانند سفید دائیں ہاتھ میں رومال تھا جس سے وہ بار بار اپنے آنسو تھی اس کا لہجہ تحکمانہ اور گفتگو کا انداز بے حد باوقار تھا۔ وہ کئی مرتبہ اور فرش پر پڑی ہوئی عورت کو دیکھا جس کی عمر سترہ اٹھارہ برس سے زائد نہ میرے والد نے چند مناسب الفاظ میں تسلی و تشفی کے کلمات کہے جس کے باوقار خاتون نے رونا دھونا بند کیا اور چہرے سے نقاب الٹ دی۔ اب میں شام کی دھندلی دھندلی فضا میں دیکھا کہ وہ نہایت حسین عورت تھی۔ ناک گردن لمبی' بھویں گہری سیاہ اور ہونٹ پتلے پتلے اور غیر معمولی طور پر سرخ چہرے کا رنگ دودھ کی مانند سفید اور کسی قدر زردی مائل تھا۔ اس نے بار مڑ کر میری جانب دیکھا اور اس کی تیز نگاہیں جیسے میرے دل و جگر کو چیرتی نکل گئیں۔ میں نے گھبرا کر فرش پر پڑی ہوئی نازنین کی طرف دیکھا جس کا بدن کسی قدر برہنہ ہوگیا' لیکن چہرہ گھاس میں چھپا تھا۔ اس کے سینے کے سے اندازہ ہوتا تھا زندہ ہے۔

والد نے مادام پیری ڈون اور لافونٹن کو جلد پانی لانے کا حکم دیا۔ وہ دونوں ہوئی قلعے کی طرف گئیں اور چند منٹ بعد قلعے کے خادم پانی کی صراحی.... اور ایک چھوٹا لوہے کا پلنگ اٹھائے نمودار ہوئے۔ انہوں نے مل جل کر بوش لڑکی کو پلنگ پر لٹایا اور پانی کے چھینٹے اس کے منہ پر مارے۔ وہ سب پلنگ کو گھیرے کھڑے تھے' اس لیے اس مرتبہ بھی لڑکی کی صورت دیکھنے سے محروم رہی۔

باوقار عورت نے بتایا کہ بے ہوش ہونے والی لڑکی اس کی بیٹی ہے۔ پھر اس نے بے قراری سے جھک کر شاید اپنی بیٹی کی نبض دیکھی اور اعلان کیا نبض کی رفتار سست پڑتی جارہی ہے اور اسے فوراً" طبی امداد کی ضرورت ہے' لیکن ان حالت میں فوری طور پر طبی امداد کیونکر دی جاسکتی تھی۔ والد نے کہا ہم اسے اٹھا کر قلعے میں لے چلتے ہیں' پھر ایک ملازم ڈاکٹر کو بلانے روانہ ہوجائے گا۔ یہ سن

کر عورت نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"مگر میں یہاں رک نہیں سکتی.... مجھے بے حد اہم کام سے آگے جانا ہے۔ مجھے افسوس ہے اس حادثے کے باعث آپ لوگوں کو خواہ مخواہ زحمت برداشت کرنا پڑ رہی ہے۔ کاش! میں یہاں کچھ دیر رک سکتی۔ بس یوں سمجھ لیجئے موت اور زندگی کا معاملہ درپیش ہے۔ ایک ایک لمحہ میرے لیے قیمتی ہے اور میں دیکھ رہی ہوں' میری بچی اس حالت میں سفر کے بالکل قابل نہیں اور نہ جانے کب تک سفر کے قابل نہ ہوسکے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں' یہاں سے قریبی گاؤں کس قدر فاصلے پر ہے تاکہ میں اپنی بچی کو وہاں چھوڑ دوں اور واپسی میں اپنے ساتھ لے جاؤں جو کم از کم تین ماہ تک ہوگی....."

والد ابھی کچھ جواب دینے نہ پائے تھے کہ میں نے والد کا کوٹ پکڑ کر انہیں اپنی طرف متوجہ کیا اور چپکے سے کہا۔ "ابا جان کیا ہی اچھا ہو اگر آپ ان خاتون کی بیٹی کو اپنے ہاں ٹھہرا لیں ۔ اگر آپ درخواست کریں تو یقیناً" یہ مان جائیں گی"۔

والد نے آہستہ سے میرا ہاتھ دبایا اور وہ خاتون سے مخاطب ہوئے۔

"مادام' عجیب اتفاق ہے یہ حادثہ میرے مکان کے قریب پیش آیا اور میں آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہوں۔ آپ اپنی بیٹی کو اگر اتنے عرصے کے لیے میرے گھر چھوڑ جائیں تو میں اور میری بیٹی آپ کی مہربانی کے نہایت شکر گزار ہوں گے۔ میں وعدہ کرتا ہوں' آپ کی بیٹی کو اپنی بیٹی سمجھوں گا اور اس کی اسی طرح دیکھ بھال کی جائے گی جس طرح میری حقیقی بیٹی کی دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ میرے تمام نوکر چاکر اس سے عزت واحترام اور محبت کا سلوک کریں گے۔ اگر آپ مجھے اعتماد کے لائق سمجھیں تو یہ حقیر درخواست قبول فرمائیں۔ میری بیٹی لارا کی خواہش بھی ہے کہ آپ کی بیٹی ہمیں اپنی میزبانی کا موقع دیں..... میں یہ بھی عرض کردوں میری بیٹی ان دنوں اپنی ایک ہم عمر لڑکی کے یہاں آنے کی متوقع تھی' مگر آج ہی اس کے والد کا خط آیا جس میں اندوہناک خبر تھی کہ وہ انتقال کر گئی.....

مجھے اور میری بیٹی کو ازحد اداس کر دیا ہے اور مجھے یقین ہے آپ کی بیٹی ہمارے مکان میں کچھ عرصہ قیام کرنے سے ہماری اداسی دور ہو جائے گی..... جہاں تک کسی قریبی گاؤں کا تعلق ہے' وہ یہاں سے کم از کم تیس میل دور ہے جہاں ایک معمولی سرائے ہے اور اس میں آپ اپنی بیٹی کو رکھنا کسی صورت میں پسند نہ کریں گی اور وہاں اس کی وہ دیکھ بھال ممکن بھی نہیں جو میرے غریب خانے پر ممکن ہے۔"

والد کی یہ تقریر اثر انداز ہوئی۔ خاتون کی آنکھوں میں تشکر اور ممنونیت کے آثار نمودار ہوئے۔ عین اسی لمحے وہ دونوں گھڑ سوار جو گاڑی کے آگے سرپٹ جا رہے تھی' واپس آئے اور کانپتے ہوئے اس باوقار خاتون کے سامنے ادب سے کھڑے ہوگئے۔ جس کا نام ابھی تک معلوم نہ ہوا تھا خاتون نے جرمن زبان میں ان سے نہ جانے کیا کہا کہ وہ فوراً" مرے ہوئے ساتھی کی طرف متوجہ ہوئے اور جب دیکھا وہ مرچکا ہے تو اسے وہیں پڑا رہنے دیا' پھر انہوں نے گاڑی سیدھی کی۔ گھوڑوں کو چمکارا۔ اسی لمحے میں نے ایک گاڑی کے اندر سیاہ رنگ کی ایک حبشی عورت بھی موجود ہے جس کے بڑے بڑے سفید چمکیلے دانت باہر نکلے ہیں۔ اسے دیکھ کر میں سخت خوفزدہ ہوگئی اور میں نے والد کا بازو سختی سے تھام لیا۔ دوبارہ مجھے گاڑی کی طرف نگاہ اٹھانے کی جرأت نہ ہوئی۔

گھوڑوں نے چند منٹ کے اندر اندر گاڑی سفر کے قابل بنادی اور اب وہ خاتون کے حکم کے منتظر تھے خاتون نے والد کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔

"جناب والا' میں آپ کے اس کرم کی حد درجہ ممنون ہوں اور آپ پر پورا اعتماد رکھتی ہوں۔ اگر آپ خوشی سے میری بیٹی کو اپنے گھر میں داخل ہونے کی اجازت دیتے ہیں' تو مجھے بھلا کیا انکار ہوسکتا ہے؟ یقیناً آپ کی شرافت اور نیک دلی آپ کے چہرے مہرے سے ظاہر ہے۔ میں بخوشی اسے عارضی طور پر آپ کے سپرد کرتی ہوں' لیکن میری ایک گزارش سن لیجئے۔" یہ کہہ کر والد کو کچھ بتانے لگی اور دبی زبان میں کچھ کہتی رہی۔ جو میں کوشش کے باوجود نہ سن

سکی۔ میں نے دیکھا والد اس کی شخصیت سے از حد مرعوب ہیں اور جو کچھ
رہی ہے اسے اتنے ادب اور اتنی توجہ سے سن رہے ہیں جیسے وہ اس کے
غلام ہوں۔ انہوں نے جواب میں کچھ بھی نہ کہا' بلکہ اس کے ہر ہر جملے پر
کو خم دیتے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا اس عورت نے والد پر کسی قسم کا جادو کر
میں نے سوچا بعد میں میں ان سے پوچھوں گی' اس عورت نے الگ جاکر کیا
کی تھیں۔

تین یا چار منٹ بعد وہ واپس آئی اور اپنی بیٹی پر نگاہ ڈالی جو ابھی تک
حس وحرکت پلنگ پر پڑی تھی اور مادام پیری ڈون کی زیر نگرانی تھی' پھر وہ گھ
کے بل جھک کر زمین پر بیٹھ گئی اور اپنے ہونٹ بے ہوش لڑکی کے ایک گا
رکھ کر نہ جانے کیا کہا اور اس کی پیشانی کا بوسہ لے کر اٹھ کھڑی ہوئی اور
گاڑی کی طرف چل دی' اس نے مڑکر ہم سب کو اشارے سے الوداعی سلام
کوچبان نے بڑھ کر دروازہ کھولا' وہ اندر جا بیٹھی' گاڑی کا دروازہ بند ہوگیا۔
گھڑ سوار اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ ایک خادم حسب معمول گاڑی
پچھلے پائیدان پر کھڑا ہوا۔ کوچبان نے لمبا چابک فضا میں لہرا کر گھوڑوں کی
رسید کیا اور چشم زدن میں گھڑ سوار اپنی وجیہہ اور شاندار سواری لے کر
میں گھس گئے۔ چند لمحوں تک ٹاپوں کی آواز آتی رہی اور پھر مدھم ہوکر
ہوگئی۔

☆ ☆ ☆

گاڑی نظروں سے اوجھل ہونے کے بعد بھی دیر تک ہم سب اسی
نظریں جمائے دیکھتے رہے۔ تاریکی خاصی بڑھ گئی تھی اور دھند لمحہ بہ لمحہ گہر
جاری تھی۔ ہمارے ایک نوکر کے ہاتھ میں لالٹین تھی لیکن کوشش کے
روشن نہ ہوسکی۔ کئی مرتبہ دیا سلائی رگڑی گئی' مگر جلتے ہی بجھ جاتی۔
"قلعے میں چلو۔ اب یہاں رکنے کا کیا فائدہ؟" والد کی آواز گونجی
فوراً" لوہے کے پلنگ کی طرف بڑھے تاکہ اٹھا کرلے چلیں۔ میں کچھ دور

پاس کھڑی تھی۔ دفعتہ" پلنگ پر لیٹی بے ہوش لڑکی کے جسم میں حرکت ہوئی۔ پھر
ایک سریلی آواز میرے کانوں تک پہنچی۔ وہ مادام پیری ڈون سے پوچھ رہی تھی۔
"تم کون ہو؟ اور میری والدہ کہاں ہیں؟"

چونکہ اس نے کروٹ بدل کر اپنا منہ مادام کی طرف کرلیا تھا' اس لیے میں
اس کا چہرہ نہ دیکھ سکی اور ویسے بھی اس اندھیرے میں اس کے خدوخال کا اندازہ
کرنا ناممکن تھا۔ مادام پیری نے خوش ہوکر جواب دیا۔

"خدا کا شکر ہے تمہیں ہوش تو آیا۔ اچھا یہ تو بتاؤ زیادہ چوٹ تو نہیں لگی؟"

"نہیں' مجھے کوئی چوٹ نہیں لگی۔" لڑکی نے اپنی حددرجہ مترنم آواز میں کہا۔
"مگر یہ بتایئے میں ہوں کہاں' یہ کون سی جگہ ہے۔ ہماری گاڑی کہاں گئی' میری
ماں کہاں ہے؟"

مادام پیری ڈون نے نہایت شفقت سے اس کے تمام سوالوں کا جواب دیا۔
وہ خاموشی سے سنتی رہی' لیکن جب اسے یہ بتایا گیا' اس کی ماں اسے تین ماہ کے
لیے چھوڑ گئی ہے اس نے رونا شروع کر دیا۔ میں نے چاہا آگے بڑھ کر اسے دلاسا
دوں مگر فوراً" مادام لافونٹن نے مجھے روک دیا اور کان میں کہا۔

"بیٹی تم اس وقت کچھ نہ کہنا۔ فی الحال ہم ہی اسے سنبھالتے ہیں تم دور ہی
رہو۔"

میں پھر آگے نہ بڑھ سکی۔ لافونٹن نے چند تشفی آمیز جملے کہے اور لڑکی کا
رونا بند ہوا۔ مجھے تعجب تھا رونے میں بھی اس کی بے مثال سریلی آواز کی نغمگی
باقی رہی۔

قلعے میں جاتے ہی ایک کھلے اور بہت صاف ستھرے کمرے میں اس کے لیے
بستر بچھایا گیا۔ اس پر اسے آرام سے لٹا دیا گیا اور وہ دوبارہ سوگئی تو مادام لافونٹن
واپس میرے پاس آئیں اور انہوں نے بتایا لڑکی بے حد خوبصورت اور معصوم ہے
اور باتیں تو اتنی پیاری کرتی ہے کہ بس سنا کرو۔ فی الحال مادام پیری ڈون اس کے
نگرانی کے لیے موجود ہیں۔ یہ سن کر مجھے کچھ اس سے کمرے میں جانے

اشتیاق ہوا' لیکن اس مرتبہ والد نے مجھے روک لیا اور کہا۔ اسے بے آرام نہ کرو۔ جب وہ بیدار ہو جائے گی تب ملاقات کر لینا۔ اس دوران میں انہوں نے ایک خادم کو فوراً" ڈاکٹر کو لانے کا حکم دیا تاکہ دیکھ لیں کوئی تشویش کی بات تو نہیں۔ والد کا حکم پاتے ہی وہ ڈاکٹر صاحب کو لینے روانہ ہوگیا۔ جو تیس میل دور ایک قصبے میں رہتے تھے۔

ہم سب اس وقت ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے جو اس قلعے کا سب سے اچھا کمرہ تھا۔ اس کی چھت اندازاً" تیس فٹ اونچی اور شاہ بلوط کی بنی ہوئی تھی۔ دیواریں خاصی موٹی اور ان پر سنہری رنگ کا روغن پھیرا گیا تھا۔ کمرے میں شمالاً" جنوباً" چار کھڑکیاں تھیں جن پر بھاری ریشمی پردے پڑے تھے۔ کمرے کا طول و عرض ساٹھ اور چالیس فٹ کے لگ بھگ ہوگا اور پورے کمرے میں قدیم طرز کا فرنیچر تھا..... دیواروں پر بارہ سنگھوں' ہرنوں اور ریچھوں کی کھوپڑیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ کہیں کہیں زمانۂ قدیم کی تلواریں' بھالے' خنجر اور زرہ بکتریں آویزاں تھیں۔ ان کی علاوہ دس بارہ بڑی بڑی تصویریں بھی ان افراد کی تھیں جو اپنے اپنے دور میں اس قلعے کے مالک رہ چکے تھے۔ ایک کھڑکی سے جنگل اور اس کی پگڈنڈی اور لکڑی کا پل صاف دکھائی دیتا اور اس وقت میں ایک اونچی کرسی پر بیٹھی اسی جانب دیکھ رہی تھی' جہاں تھوڑی دیر پہلے یہ حادثہ رونما ہوا تھا۔

کمرے میں لمبی لمبی موی شمعیں روشن تھیں۔ والد ایک صوفے میں دھنسے پائپ سے شغل کر رہے تھے اور مادام لافونٹن دیوار پر لگی ایک خاتون کی تصویر دیکھ رہی تھیں' جو ڈیڑھ سو برس قبل اس قلعے کے مالک کی بیوی تھیں۔ چند لمحوں بعد مادام پیری ڈون بھی آگئیں اور انہوں نے اعلان کیا لڑکی اب گہری نیند سو رہی ہے اور وہ باہر سے دروازہ مقفل کر کے چلی آئی ہیں تاکہ اس کے لیے ناشتے کا بندوبست کریں۔

"اماں سنائیے' آپ کا ہمارے معزز مہمان کے بارے میں کیا خیال ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ارے بٹی' کیا بتاؤں؟ میں تو اسے دیکھتے ہی فریفتہ ہوگئی۔ بخدا میری اتنی عمر ہونے کو آئی، سینکڑوں ہزاروں لڑکیاں ایک سے ایک حسین دیکھی ہوں گی' لیکن ایسی خوبصورت لڑکی آج تک نظر نہ آئی۔ جنت کی حور ہے۔ حور بلکہ حوریں بھی اسے دیکھ کر شرما جائیں۔ کہنے کو تم بھی بہت خوبصورت ہو' لیکن اس لڑکی کی بات ہی کچھ اور ہے' تصویر ہے تصویر۔ آواز ایسی پیاری جیسے جلترنگ بج رہا ہو اور باتیں اتنی بھولی بھالی کہ بیان سے باہر۔ میرا بس چلے تو اسے یہاں سے جانے ہی نہ دوں"۔

سچ تو یہ ہے میں رشک کے جذبات سے اپنے آپ کو بچا نہ سکی۔ مادام لافونٹن نے ان سب خوبیوں کی تائید کی جو پیری ڈون نے بیان کی تھیں۔ دفعتہً" والد نے کہا۔

"یقیناً یہ بچی ان تمام خوبیوں کی مالک ہے جو تم نے بیان کیں' لیکن کیا تم نے محسوس نہ کیا اس گاڑی میں اس لڑکی اور اس کی ماں کے علاوہ ایک عورت اور بھی تھی۔ بالکل سیاہ چہرے والی جو آخری وقت تک گاڑی سے باہر نہ آئی"۔

میں نے چونک کر والد کی طرف دیکھا۔ اچھا تو انہوں نے بھی اس جشن کو دیکھ لیا تھا۔ اب معلوم ہوا وہ میرا وہم نہ تھا۔ بلاشبہ ایک ایسی عورت گاڑی کے اندر موجود تھی۔ دونوں خادماؤں نے نفی میں گردنیں ہلائیں۔ والد ان کے بیان پر مایوس ہوئے مگر جب میں نے انہیں بتایا واقعی اس گاڑی میں ایک عورت اس طرح بیٹھی تھی تو انہوں نے کہا۔ "بہت خوب! تم نے بھی اسے دیکھا تھا؟ سوال یہ ہے وہ عورت کون تھی اور گاڑی سے باہر کیوں نہ آئی؟ اس کا جواب ہمیں یہی لڑکی دے سکتی ہے"۔

"میں تو ان کے کوچبان اور گھڑ سواروں کو دیکھ کر ڈری تھی۔" مادام لافونٹن نے کہا۔ "خدا رحم کرے! وہ کسی اور ہی دنیا کے دکھائی دیتے تھے.... کیسے پیلے پیلے چہرے تھے ان کے اور ہاتھ پاؤں گویا لکڑی کے بنے ہوں۔ جب وہ حرکت کرتے تو ایسی مکروہ آواز آتی تھی جیسے کوئلے چٹخ رہے ہوں"۔

"ہاں یہ بات میں نے بھی دیکھی۔" والد نے کہا۔ "وہ سب کے سب ا
خاتون سے ڈرتے اور سہمے ہوئے نظر آتے تھے۔ ان کی ٹانگیں خوف سے لرز
تھیں۔ اور تو اور میں نے ان کے سیاہ گھوڑے دیکھے' وہ بھی دہشت سے کانپ
رہے تھے، اگر یہ موسم سردیوں کا ہوتا تو میں خیال کرتا ان کے کانپنے کی وجہ
سردی سے مگر...."

وہ یک لخت چپ ہوگئے اور انہوں نے جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔

"میرا خیال ہے ہم سب کچھ اس لڑکی سے پوچھ لیں گے۔ یہ کون لوگ ہیں'
کہاں سے آئے اور اس کی ماں کو آخر زندگی اور موت کا کون سا مرحلہ درپیش
ہے؟" میں نے کہا۔

والد یہ سن کہ مسکرائے اور گردن ہلا کر بولے۔

"اور میرا خیال ہے لڑکی ہمیں کچھ نہ بتا سکے گی"۔

میرا دھیان فوراً" اس پُر اسرار گفتگوؤں کی طرف چلا گیا جو رخصت ہونے
سے تھوڑی دیر پہلے اس خاتون نے والد کو ایک طرف لے جاکر کی تھی۔ یقیناً وہ
ان کے کسی راز سے آگاہ کئے گئے ہیں اور شاید ہمیں بتانا پسند نہ کریں' مگر پوچھ
لینے میں آخر ہرج ہی کیا ہے؟ چنانچہ میں نے اس سلسلے کا آغاز کیا۔

"اس عورت نے آپ کو الگ لے جاکر سرگوشی میں کیا کہا تھا؟"

والد کے لبوں پر ایک بار پھر معنی خیز تبسم نمودار ہوا اور انہوں نے کہا۔ "وہ
کہتی تھی آپ مجھ سے وعدہ کریں ہمارے بارے میں میری لڑکی سے کوئی سوال نہ
کریں گے اور اگر آپ نے کوئی سوال کیا بھی تو یقین رکھیئے وہ جواب میں ایک
حرف بھی زبان سے نہ نکالے گی۔ میں نے اسے سختی سے منع کر دیا ہے....."
والد ایک لمحے کے لیے رک گئے کہا۔ "غالباً" اس نے بے ہوش لڑکی کے کان میں
یہی بات کہی تھی"۔

"تعجب ہے....." میں نے کہا۔ "آخر بے ہوش لڑکی سے کچھ کہنے کا کیا
فائدہ؟"

"ہمیں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت ہی کیا ہے"۔ والد نے کہا۔ "ہمیں اس کے بارے سے آگاہ ہونے کا شوق نہیں اور نہ میں اس لڑکی سے کچھ پوچھنے کی اجازت دوں گا۔ ہرفرد خوب غور سے سن لے کہ لڑکی سے اس کے یا اس کی ماں کے بارے میں کوئی جرح نہ کی جائے۔ ہاں وہ خود اپنی مرضی سے کچھ بتادے' تو ٹھیک ہے"۔

مجھے اس لڑکی کو دیکھنے اور اس سے باتیں کرنے کا اتنا اشتیاق تھا کہ نیند بھی غائب ہوگئی' ورنہ رات کا کھانا کھالینے کے بعد مَیں فوراً" سو جانے کی عادی تھی۔ ڈنر رات کے نو بجے کھایا گیا۔ اس دوران میں مادام پیری ڈون دومرتبہ معزز مہمان کے کمرے میں گئیں اور دونوں مرتبہ واپس آن کر بتایا کہ وہ گہری نیند سو رہی ہے۔ کھانے کے بعد دیر تک قہوے کا دور چلتا رہا اور اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ سب کو اب اس نوکر کا انتظار تھا جسے ڈاکٹر لانے کے لیے بھیجا گیا تھا۔

رات کے ٹھیک ایک بجے ڈاکٹر اور نوکر قلعے میں داخل ہوئے۔ والد نے مختصر الفاظ میں سارا واقعہ بیان کیا اور ان کو لے کر خود اس کمرے میں گئے۔ مجھے اس وقت بھی جانے کی اجازت نہ ملی۔ آدھ گھنٹے بعد والد واپس آئے۔ ڈاکٹر نے اعلان کیا مریضہ قطعی صحت مند ہے' اسے کوئی اندرونی اور بیرونی چوٹ نہیں لگی۔ اس کی نبض ٹھیک چل رہی ہے' سانس کی آمدورفت صحیح ہے' اسے صرف اپنی ماں سے جدا ہونے کا صدمہ ہے اور وہ یہ صدمہ برداشت کرلے گی۔ تین ماہ کی مدت کچھ زیادہ نہیں"۔

"ڈاکٹر صاحب' کیا میں اُن سے اِس وقت مل سکتی ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں ہاں ضرور۔ تمہیں اس سے فوراً" ملنا چاہیئے۔ وہ تمہاری ہم عمر ہے اور تمہی جیسی حسین ..... یقیناً" وہ تمہیں دیکھ کربے حد خوش ہوگی"۔

"مگر دیکھو.تو آدھی رات جاچکی ہے۔ اس وقت ملنا غیر مناسب ہوگا.... صبح ....." والد نے کہنا شروع کیا' مگر اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوچکا تھا۔ مزید کچھ کہے سنے بغیر میں دوسری منزل کی طرف دوڑی اور جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھ کر اس کمرے کی طرف چلی جس میں وہ آرام کر رہی تھی۔ ایک ثانیہ دروازے پر رک کر میں نے اپنا پھولا ہوا سانس درست کیا' پھر دروازے پر انگلی سے دستک دی۔

"آیئے۔" اندر سے ایک دلفریب آواز آئی اور میں آہستہ سے دروازہ کھول کر کمرے میں چلی گئی۔ وہ مسہری پر پیٹھ موڑے بیٹھی تھی۔ اس کے لمبے گھنے سیاہ بال پوری کمر چھپائے ہوئے تھے۔ اس کا سیاہ گاؤن گردن تک لپٹا ہوا تھا۔ کمرے میں دوسفید مومی شمعیں روشن تھیں۔ میرے قدموں کی آہٹ پاکر اس نے اپنی لمبی گردن موڑکر میری طرف دیکھا۔ دو بڑی گہری سیاہ چمک دار آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔ میری اس کی نگاہیں چار ہوئیں۔ اس کی حسین و جمیل صورت دیکھتے ہی مجھ پر سکتے کا عالم طاری ہوگیا۔ میں پتھر کے بے جان مجسّمے کی مانند اپنی جگہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی اور پھٹی پھٹی نظروں سے اسے تکنے لگی۔ وہی چہرہ' وہی ناک نقشہ' وہی لباس' وہی سرخ سرخ ہونٹ' وہی نوکیلے سفید دانت' وہی تبسم اور وہی جسم کے پار ہو جانے والی سحر انگیز نظریں.... یہ وہی لڑکی تھی جسے برسوں پہلے' اپنے بچپن میں مَیں نے آدھی رات کو اپنے بستر کے قریب کھڑے پایا تھا.... اس تصور کی ساتھ ہی دھڑام سے غش کھاکر گری اور گہری تاریکی میں ڈوبتی چلی گئی۔

کارمیلا : اس کی آنکھیں انگاروں کی مانند دہک رہی تھیں۔ پھر اس کے ہونٹ کھلے اور جب وہ میری گردن کا بوسہ لینے کو جھکی' تو اس کے لمبے نکیلے سفید دانت باریک سوئیوں کی مانند میری گردن میں چبھے' درد کی ہلکی سی چیخ میرے منہ سے نکل اور پھر میں بے ہوش سی ہوتی چلی گئی۔

کارمیلا دست قدرت کا نادر اور بے مثال شاہکار تھی۔ اس کا جسم جیسے نور کے سانچے میں ڈھالا گیا تھا۔ اعضا اتنے متناسب اور نازک جیسے پھول کی پنکھڑی اس کی آواز میں ایک جادو تھا' ترنم کا جادو۔ جب وہ بولتی' تو یوں لگتا جیسے دور' بہت دور کسی معبد میں صبح صادق کی گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ اس کی بڑی بڑی غزالی

آنکھوں میں بلا کی تیزی اور چمک تھی۔ جوں جوں سورج مغرب میں جھکتا چلا جا
کارمیلا کی آنکھوں میں سرخی جھلکنے لگتی۔ اس کے بے حد خوبصورت ترشے ہوئے
یاقوتی ہونٹ خونِ کبوتر کی مانند سرخ تھے اور یہ سرخی مصنوعی نہیں' اصلی تھی۔
اس کے دانت غیر معمولی طور پر لمبے' نکیلے اور سفید تھے اور جب وہ مسکراتی' تو ان
خوبصورت دانتوں میں بجلیاں سی لہراتی نظر آتیں۔

میں نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا' تو دہشت سے غش کھاکر گر پڑی۔ یہ تو وہی
لڑکی ہے جسے بارہ سال قبل' میں نے آدھی رات کو اپنے بستر کے قریب کھڑے پایا
تھا اور اس وقت سے لے کر اب تک ایک لمحے کے لیے بھی اس کا یہ دلفریب
چہرہ میرے حافظے کی لوح سے محو نہ ہوا تھا۔

چند لمحے بعد میں خود ہی ہوش میں آگئی۔ کیا دیکھتی ہوں اس کا حسین چہرہ مجھ
پر جھکا ہوا ہے' پھر ایک مترنم اور دل کش آواز میرے کانوں میں ہلکورے لینے
لگی۔

"پیاری بہن' اٹھو..... کیا تم مجھے دیکھ کر ڈر گئیں؟"

اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور ایک عجیب سی سنسنی میرے جسم کے روئیں
روئیں میں دوڑ گئی۔ میں بلاشبہ اس وقت کانپ رہی تھی اور یوں لگتا جیسے میری
قوتِ گویائی سلب ہوگئی ہو۔ شاید آج پھر بارہ سال پہلے کا وہی بھیانک خواب دیکھ
رہی تھی۔

"اف! .... کیسی حیرت انگریز بات ہے۔" اس نے ہنس کر کہا۔ "ٹھیک بارہ
برس قبل میں نے تمہاری صورت خواب میں دیکھی تھی اور جب سے اب تک
ایک لمحے کے لیے بھی تمہارا چہرہ میرے تصور سے غائب نہ ہوا"۔

یہ کلمات سن کر میں اور خوف زدہ ہوگئی۔ خدا رحم کرے بالکل یہی بات تو
میں سوچ رہی تھی اور پھر یک لخت میری گم شدہ قوتِ گویائی واپس آگئی۔ میں نے
کہا۔

" مجھے بھی تعجب ہے کہ آج سے بارہ برس پہلے جب میں چھوٹی سی تھی'

آدھی رات کے بعد اپنی خواب گاہ میں مجھے تمہارا چہرہ نظر آیا تھا' لیکن وہ خواب
نہیں تھا' میں نے حقیقت میں تمہیں اپنے بستر کے قریب کھڑے دیکھا اور پھر تم
میرے برابر میں لیٹ گئی تھیں ..... اور اب میں تمہیں دوبارہ دیکھ رہی ہوں۔
خدا کی پناہ! یہ کیسا عجیب واقعہ ہے"۔

اس نے اپنی چمکیلی آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔ اس کی نظروں کی تاب
نہ لا کر میں نے گردن جھکالی اور میرا دل جیسے بیٹھنے لگا۔ دفعتاً" اس نے اپنا ہاتھ
میرے شانے پر رکھا اور مسکرانے لگی۔ اس وقت اس کا چہرہ چودھویں کے چاند کی
طرح روشن تھا اور سرخ سرخ لبوں اور موتی کی طرح سفید دانتوں سے جیسے پھول
برس رہے ہوں۔

"ہاں' کیسا عجیب واقعہ ہے!" اس نے کہا۔ "میں نے تمہیں خواب میں دیکھا
اور تم نے مجھے بیداری میں ..... اور اب قسمت نے مجھے تمہارے پاس پہنچا دیا۔
یوں کہو تمہاری کشش مجھے یہاں کھینچ لائی۔ آہ! تم کتنی خوبصورت ہو' کیا نام ہے
تمہارا؟"

"میرا نام لارا ہے اور تمہارا؟"

"مجھے کار میلا کہتے ہیں .... کیا تمہیں یہ نام پسند آیا"؟

"ہاں' بہت پیارا نام ہے۔ بالکل تمہاری طرح .... تم بہت خوبصورت اور
پیاری ہو کارمیلا....."

اس کے تروتازہ اور شاداب رخسار مزید سرخ ہوگئے اور اس نے محبت سے
میرا ہاتھ دبایا۔

"تم بھی کچھ کم خوبصورت نہیں لارا پیاری۔ آؤ ہم تم دونوں پکی سہیلیاں بن
جائیں۔" میں ان دنوں خاصی شرمیلی تھی اور شاید اس کی وجہ وہ تنہائی تھی جس
میں میری پرورش ہوئی تھی۔ کارمیلا کی یہ بات سن کر میں اس طرح شرمائی جیسے
کسی طرحدار نوجوان نے مجھ سے شادی کی درخواست کر ڈالی ہو۔

"ہم تو پہلے ہی سہیلیاں ہیں۔ کیا ہماری دوستی بارہ سال پرانی نہیں؟" میں نے

شرماتے ہوئے کہا اور کارمیلا ہنس پڑی ..... اس نے مجھے گلے سے لگالیا اور پیار کرنے لگی۔ اس کے جسم سے عجیب سحر انگیز خوشبو اٹھ رہی تھی جس نے مجھے مدہوش کر دیا۔ اس عالم میں میں نے دیکھا، اس کی آنکھیں انگاروں کی مانند دہک رہی ہیں۔ پھر اس کے ہونٹ کھلے اور جب وہ میری گردن کا بوسہ لینے کو جھکی تو اس کے لمبے نکیلے سفید دانت باریک سوئیوں کی مانند میری گردن میں چبھے۔ درد کی ہلکی سی چیخ میرے منہ سے نکلی اور کارمیلا نے فوراً اپنے ہونٹ گردن سے ہٹا لیے۔ دونوں ہاتھوں سے میرا منہ اوپر اٹھایا اور آنکھیوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"میں تمہیں اپنا بارہ سال پرانا وہ خواب سناتی ہوں جب میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا تھا..... بالکل اسی طرح جیسے میں اب تمہیں دیکھ رہی ہوں۔ اس وقت میری عمر چھ سال کی تھی اور یقیناً جب تم نے مجھے دیکھا تو ان دنوں تمہاری عمر بھی چھ سات سال کی ہوگی۔ گویا ہم دونوں کم سن تھے۔ خیر' ایک رات سوتے سوتے میری آنکھ کھلی اور میں اپنے آپ کو اجنبی جگہ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ یہ وہ کمرہ تو نہیں تھا جہاں میری والدہ مجھے سلایا کرتی تھیں۔ میں اپنے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی اور غور سے اپنے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ ہر طرف گہری تاریکی تھی اور خوفناک سناٹا۔ میں نے اپنے آپ کو وسیع و عریض کمرے میں پایا جس میں طرح طرح کا سامان کھچا کھچ بھرا تھا۔ لکڑی کی میزیں' کرسیاں' پلنگ' الماریاں اور پتا نہیں کیا کیا۔ کھڑکیوں پر سیاہ رنگ کے بڑے بڑے پردے لٹکے ہوئے تھے اور دروازے کھلے ہوئے تھے۔ دفعتہ" ہوا کے جھونکوں سے ایک پردہ ہلا اور میں نے دیکھا سامنے ایک گھنا جنگل ہے۔ جس میں کچھ فاصلے پر چراغ جل رہا ہے۔ مجھے اس وقت بڑا خوف محسوس ہوا اور یہ خوف ایک اجنبی جگہ' اندھیرے اور تنہائی کا تھا۔ اب میں اندھیرے میں بخوبی دیکھنے لگی تھی۔ میرے دائیں بائیں دو پلنگ پڑے تھے جن پر بستر بچھے ہوئے تھے مگر ان پر سونے والا کوئی نہ تھا میرے سرہانے لوہے کا ایک شمع دان دھرا تھا جس میں موم بتیاں لگی تھیں مگر یہ سب کی سب بجھی تھیں.....

"یکایک میں نے عجیب سی آواز کمرے میں سنی جیسے کوئی دبے پاؤں چل رہا ہے۔ میں نے خوف سے چیخنے کی کوشش کی' لیکن حلق سے آواز ہی نہ نکلی اور پھر میں نے تمہیں دیکھا ..... تمہیں ....."

کارمیلا ایک لمحے کے لیے رکی اور میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔ میں چپ چاپ اس کے ہونٹ تکے جا رہی تھی..... "تم گردن سے پیروں تک سیاہ لبادے میں لپٹی ہوئی تھیں۔ تمہارے سنہرے بال کھلے تھے اور تمہاری نیلی آنکھوں میں محبت کے کنول روشن تھے۔ تم مجھے دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔ پھر تم نے اپنے دونوں بازو آگے کیے جیسے مجھے لپٹانا چاہتی ہو۔ میں بے اختیار تمہارے بازوؤں میں آگئی اور پھر آنکھیں آپ ہی آپ بند ہوگئیں۔ شاید میں گہری نیند سو گئی تھی۔ یک لخت چیخوں کی آواز سن کر میری آنکھ کھلی۔ میں نے دیکھا تم میرے بستر پر بیٹھی بری طرح چیخ رہی ہو۔ تمہیں اس حالت میں دیکھ کر میں خوفزدہ ہو گئی اور بستر سے نیچے اتری اور اس کے بعد ایسا لگا جیسے میں بے ہوش ہوگئی۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو میں نے اپنے آپ کو اسی خواب گاہ میں پایا جہاں میں ہمیشہ سویا کرتی تھی۔ میری والدہ میرے سرہانے کھڑی تھیں۔ انہوں نے مجھے بتایا میں کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی تھی اور میرے رونے اور چیخنے کی آواز سن کر خواب گاہ میں آئی تھیں۔ اس وقت سے لے کر اب تک تمہارا خوبصورت چہرہ میں نہیں بھولی ..... اور میں پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ بارہ سال قبل جس لڑکی کو میں نے خواب میں دیکھا تھا' یقیناً" وہ تم تھیں"۔

کارمیلا اپنا خواب بیان کر رہی تھی اور میں حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھی۔ اس کا خواب ہو بہو وہی تھا جو میں نے اپنی بیداری میں دیکھا تھا۔ پھر میں نے تفصیل سے پوری بات سنائی۔ وہ بڑی دلچسپی سے سنتی اور مسکراتی رہی جب میں چپ ہوئی تو اس نے مجھے گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے ہم دونوں کے ساتھ نہایت حسین مذاق کیا..... بچپن ہی سے ہمیں ایک دوسرے کی نہ صرف شکل دکھادی بلکہ آپس میں محبت بھی پیدا کردی۔ پیاری

لارا' وعدہ کرو تم مجھ سے جدا نہ ہوگی۔ میں نے وعدہ کیا اور جب یہی وعدہ اس سے لینا چاہا تو ایک لمحے کے لیے وہ اداس ہوگئی۔

"ابھی کوئی وعدہ نہیں کرسکتی۔ میں اپنی ماں کے قبضے میں ہوں۔ وہ واپس آئے گی تب بتاسکوں گی ان کا کیا ارادہ ہے۔ بہرحال میں تمہیں کبھی نہ بھولوں گی....."

کارمیلا نے سرد آہ بھری اور اس کی غزالی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میں بھی رونے لگی۔ کتنی ہی دیر ہم چپکے چپکے آنسو بہاتے رہے دفعتہ" جنگل میں سے کسی مرغ کے بولنے کی آواز آئی..... کارمیلا چونک پڑی۔ اس نے جلدی سے کہا۔

"لارابہن' اب تم جاؤ۔ آرام کرو' مجھے بھی نیند آرہی ہے۔ باقی باتیں کل ہوں گی"۔

"ارے معاف کرنا' مجھے باتوں باتوں میں پتا نہ چلا کہ صبح ہونے والی ہے"۔ میں نے اس کے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر کی رائے ہے تمہارے کمرے میں ایک خادمہ کو سونا چاہیے۔ وہ غالبا" باہر انتظار کر رہی ہے۔ تمہیں اس کی کسی بھی وقت ضرورت پڑ سکتی ہے"۔

"نہیں' نہیں"۔ کارمیلا نے گھبرا کر کہا۔ "میں ہمیشہ سے اپنے کمرے میں تنہا سونے کی عادی ہوں۔ کسی دوسرے کی موجودگی میں مجھے نیند نہیں آتی' تاہم تمہاری اس مہربانی کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ خادمہ سے کہو وہ تکلیف نہ کرے۔ مجھے کسی کی ضرورت نہ پڑے گی۔ میں اندر سے ہمیشہ اپنا کمرہ مقفل کرکے سونے کی عادی ہوں۔ ایک بار ہمارے مکان میں ڈاکو گھس آئے تھے تب سے ڈاکوؤں اور نقب زنوں کی ہیبت میرے دل پر بیٹھی ہوئی ہے۔ مجھے یقین ہے تم میری اس حرکت کا بالکل بُرا نہ مانوگی۔ قفل کی کنجی مجھے نظر آرہی ہے۔ اب تم جاؤ' آرام کرو' تمہاری آنکھوں میں نیند بھری ہوئی ہے شب بخیر....."

میں کمرے سے باہر نکل آئی' کارمیلا نے دروازہ بند کرلیا۔ پھر قفل میں کنجی

گھومنے کی ہلکی سی آواز آئی..... باہر سیڑھیوں کے قریب مادام پیری ڈون ایک کرسی میں بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ "اپنے کمرے میں چلی جاؤ' مہمان کو تمہاری ضرورت نہیں ہے"۔

☆ ☆ ☆

اگلے روز دوپہر کے بعد جب سورج مغرب کی طرف ڈھل رہا تھا' کارمیلا اپنے کمرے سے برآمد ہوئی۔ صبح ایک نوکر جب اس کا ناشتا لے کر گیا' تو کمرے کا دروازہ مقفل نہ تھا۔ کارمیلا نے اس کی آمد سے پہلے ہی دروازہ کھول رکھا تھا' لیکن وہ اپنے بستر پر نہ تھی۔ شاید برابر والے کمرے میں ہوگی یا غسل خانے میں ہوگی..... نوکر ناشتا میز پر رکھ کر چلا آیا۔

دن کے اجالے میں کارمیلا کا حسن اور نکھر آیا تھا۔ جو اسے دیکھتا' دیکھتا ہی رہ جاتا۔ اس کی شخصیت میں بڑی کشش اور بڑا وقار تھا۔ چال شہزادیوں کی سی۔ پرانے قلعے میں پالتو پرندوں کے علاوہ روسی نسل کے سفید کتوں کا ایک جوڑا بھی تھا۔ کارمیلا کو ان کتوں نے دیکھا' تو دُم دبا دبا کر ٹیاؤں ٹیاؤں کرتے پردے کے پیچھے جا چھپے۔ جب تک کارمیلا اس کمرے میں بیٹھی رہی وہ ایک کونے میں دبکے رہے۔

والد ایک زمانے میں جنوبی افریقہ کی سیاحت کو گئے اور وہاں سے طرح طرح کے طوطے خرید لائے ۔ ان میں میکاؤ نسل کے طوطوں کی ایک جوڑی بھی تھی۔ قد و قامت میں یہ طوطے چھوٹے موروں کے برابر تھے اور نہایت ذہین..... گھر کے تمام افراد کو بے تکلف ان کے ناموں سے پکارتے اور گھنٹوں بولتے۔ میں نے کارمیلا سے کہا۔ "آؤ تمہیں طوطے دکھاؤں۔" وہ مسکرائی اور میرے ساتھ چلتی ہوئی والد کے کمرے کی طرف گئی۔ وہ آگے آگے اس بے تکلفی سے چلی جا رہی تھی جیسے اس قلعے کے ایک ایک چپے سے آگاہ اور برسوں سے یہاں رہ رہی ہو۔ میں نے اس وقت کارمیلا کی ان پُراسرار خاصیتوں پر غور نہ کیا۔ اور اب خیال آتا ہے اگر میں اس وقت ان باتوں پر غور کرتی' تو اس لرزہ خیز بربادی اور

تباہی سے ہمارا قلعہ محفوظ ہو جاتا جو کچھ عرصے بعد ہم پر نازل ہوئی۔ واقعہ یہ ہے کہ میں اپنی ایک ہم عمر سہیلی پاکر سب کچھ فراموش کر چکی تھی۔ میں اوّل نظر ہی میں کارمیلا پر فریفتہ ہو گئی تھی اور کسی قیمت پر نہ چاہتی کہ یہ قلعے سے جائے۔

والد اپنے کمرے میں موجود تھے اور میز پر بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ طوطوں کی زور زور سے بولنے کی آوازیں ہمارے کانوں میں آرہی تھیں۔ جونہی میں دروازے میں قدم رکھا۔ طوطوں نے "لارا آگئی' پیاری بیٹی آگئی" کے نعرے لگانے شروع کیے اور خوشی سے اپنے پنجرے میں رقص کرنے اور پھڑپھڑانے لگے مگر دوسرے ہی لمحے ان کی حالت میں عظیم تغیر رونما ہوا۔ وہ ایک دم ساکن وسامت ہوگئے' ان کی کترنی کی طرح چلتی ہوئی زبانیں بند ہوگئیں اور آنکھوں کی گردش کرتی ہوئی پتلیاں تھم گئیں۔ انہوں نے اپنے پھیلے ہوئے بڑے بڑے پَر سکیڑ لئے اور گردنیں جھکا کر ایک دوسرے کے پیچھے پناہ لینے کی کوشش کرنے لگے۔

طوطوں کے یک لخت خاموش ہوتے ہی والد نے گردن اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا' پھر ان کی نظر ہم پر پڑی' وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور ہمیں اندر آنے کا اشارہ کیا۔

"ابا میں اپنی سہیلی کی ملاقات طوطوں سے کرانے آئی ہوں' مگر شاید انہیں ہمارا آنا' ناگوار گزرا ہے۔ ذرا دیکھیے تو یہ ایک دم چپ ہوگئے اور اب ہم سے نظریں چرائے ہوئے ہیں"۔

والد نے پنجرے میں طوطوں کی حالت کا غور سے جائزہ لیا اور حیرت کے عجیب تاثرات ان کے چہرے پر پھیل گئے۔ انہوں نے پنجرے کے قریب جاکر پیار بھرے انداز میں انہیں پکارا' مگر ان کی حالت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ وہ اس طرح ڈرے اور سہمے ہوئے تھے جیسے انہوں نے بلی اپنے قریب دیکھ لی ہو۔ والد نے ہنس کر کہا۔

"تعجب ہے ابھی چند لمحے قبل یہ طوطے خوشی سے چلا رہے تھے اور تم لوگوں

کے آنے کے ساتھ ہی چپ ہوگئے۔ غالباً" یہ ہمارے معزز مہمان سے شرما رہے ہیں۔ شاید چند دن بعد مانوس ہو جائیں"۔

کارمیلا نے زبان سے ایک لفظ بھی نہ کہا اور مسکراتی رہی' پھر اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور والد کو سلام کرکے کمرے سے باہر آگئی۔ اس کا باہر آنا تھا کہ طوطوں کے بولنے اور باتیں کرنے کی آواز دوبارہ سنائی دینے لگی۔

"تم نے تو ہمارے طوطوں کو ڈرا ہی دیا کارمیلا"۔ میں نے مذاق میں کہا۔ "اور یہی حال ہمارے کتوں کا ہُوا۔ کہیں تم ہمیں ہی نہ ڈرانے لگنا۔"

وہ قہقہہ مار کر ہنسی اور آہستہ سے کہا۔ "یہ سب تمہارا وہم ہے۔ بھلا میں ہوں اور طوطوں کو کیوں ڈرانے لگی۔ کیا میں کوئی چڑیل ہوں یا بد روح؟" دن کا اکثر حصہ ہم نے قلعے میں گھومتے پھرتے کاٹ دیا۔ اس دوران میں دو مرتبہ میں نے پانی پیا اور کچھ پھل بھی کھائے' مگر اصرار کے باوجود کارمیلا نے کوئی چیز کھائی نہ پینے پر ہی لگی۔ وہ کہتی تھی۔ "اس نے صبح اچھی طرح ناشتا کرلیا ہے اور کیونکہ وہ بچپن ہی سے ایک مرتبہ ناشتا کرنے اور کھانا لینے کی عادی ہے' لہٰذا دوپہر کے کھانے یا شام کے کھانے میں شمولیت پر اصرار نہ کیا جائے اس کی یہ بات سن کر میں کسی قدر حیران ہوگئی' مگر کارمیلا نے مجھے دوسری باتوں میں لگالیا۔

"یہ جنگل بہت خوبصورت ہے کیا خیال ہے کسی دن سیر کو چلیں؟"

"ضرور۔" میں نے خوشی دلی سے کہا۔ "مگر ابا کو ہمارے ساتھ جانا پڑے گا۔ ان کے پاس بندوق ہے۔ یہ جنگل جانوروں سے بھرا پڑا ہے۔ گیدڑ' بھیڑیے اور نہ جانے کون کون سی بلائیں ہزاروں کی تعداد میں یہاں پھرتی ہیں۔ میں ہمیشہ والد کے ساتھ ہی جایا کرتی ہوں اور اتنا عرصہ ہونے کو آیا۔ آج تک ایک دو میل سے زیادہ دور نہیں گئی"۔

"اوہ لارا تم کتنی اچھی ہو" کارمیلا نے کہا۔ "مگر ایسی بھی کیا بزدلی کہ تم نے آج تک پورا جنگل ہی نہیں دیکھا۔ بندوق چلانا تو میں بھی جانتی ہوں۔ کیا تمہارے والد اپنا بندوق مجھے دے دیں گے! دیکھو نا' اگر وہ بھی ہمارے ساتھ گئے تو ہم

کھل کر باتیں نہ کر سکیں گے"۔

"ٹھیک ہے یہ تو میں نے سوچا ہی نہ تھا۔ خیر' میں والد سے کہوں گی' بندوق تمہارے حوالے کر دیں گے' پھر ہم جنگل میں چلیں گے ..... لیکن زیادہ دور نہ جانا واقعی اس میں بھیڑیے بہت ہیں"۔

کارمیلا نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "تم بھیڑیوں کی فکر نہ کرو میں ان سے نمٹنا اچھی طرح جانتی ہوں"۔

سورج غروب ہونے سے چند منٹ پہلے وہ خاصی بے چین اور مضطرب نظر آئی۔ میں نے خیال کیا وہ اتنی دیر گھومنے پھرنے سے تھک گئی ہے چنانچہ اسے اپنے کمرے میں جانے کی اجازت دے دی۔ کارمیلا نے جاتے ہوئے کہا۔

"لارا' دیکھو ایک ہدایت تمہیں کرتی ہوں اور تم گھر کے دوسرے افراد کو بھی سمجھا دینا کہ کوئی شخص رات کے وقت' اجازت کے بغیر میرے کمرے میں آنے کی زحمت نہ کرے۔ میں ابتداہی سے تنہائی پسند ہوں اور اپنے آرام میں خلل اندازی پسند نہیں کرتی۔ صبح یا دوپہر کو میں خود آجایا کروں گی۔ کوئی شخص مجھے جگانے یا بلانے کی کوشش بھی نہ کرے اور نوکر سے کہہ دو' وہ میرا ناشتہ کمرے کے باہر ہی رکھ کر چلا جایا کرے۔ میں خود جب جاگوں گی' دروازہ کھول کر ناشتا اٹھالیا کروں گی۔ ہے تو یہ بدتہذیبی کی بات' مگر میں کیا کروں' بچپن ہی سے میری یہ عادتیں پختہ ہوگئی ہیں۔ امید ہے تم ان باتوں کا برا نہ مانوگی اوریوں بھی میں تمہارے گھر میں ایک مہمان کی حیثیت سے آئی ہوں اور مہمان کی تکلیف اور خوشی کا خیال رکھنا معزز میزبانوں کا اخلاقی فرض ہے ....."

اس کا لب ولہجہ تحکمانہ تھا جیسے وہ اس قلعے کی مالک ہو اور سب اس کے نوکر چاکر۔ ایک لمحے کے لیے اس کی یہ باتیں میری طبع پر بے حد ناگوار گزریں' مگر میں نے انہیں نظر انداز کر دیا۔ اپنے کمرے میں آکر بڑی دیر تک کارمیلا کی باتوں پر غور کرتی رہی' لیکن کچھ سمجھ میں نہ آسکا۔ آخر ان کا مطلب کیا ہے؟ کی روشنی میں اس کی شخصیت کے بارے میں کچھ اور باتوں کا مجھ پر انکشاف ہو

جس نے مجھے مزید سوچنے پر مجبور کر دیا۔ یہ تو میں پہلے ہی بتا چکی ہوں' کارمیلا کو قدرت نے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا۔ اس کے چہرے مہرے میں کہیں انگلی رکھنے کی گنجائش نہ تھی۔ اس کا قد لمبا تھا نہ پست' بلکہ درمیانہ اور اس کی چال میں شاہانہ انداز تھا' تاہم ایک دو مرتبہ مجھے یہ احساس ہوا وہ لنگڑا کر چلتی ہے۔ ممکن ہے گاڑی سے گرنے میں اس کی ٹانگ پر چوٹ آئی اور یہ بھی ممکن ہے میرا وہم ہو۔ اس کے بال نہایت نرم اور سنہری تھے جیسے ریشم کے لچھے۔ حیرت انگیز حد تک طویل اور گھنے۔ مگر سوال یہ تھا کہ ابھی اتنی چھوٹی عمر میں اس کے بال اتنے طویل کیونکر ہوگئے؟ میرا خیال ہے سر سے پاؤں تک بال ایک دو برس میں نہیں بڑھتے' اس کے لیے ایک طویل عرصہ چاہئے۔ اس کے دونوں ہاتھ برف کی مانند سفید اور انگلیاں پتلی پتلی اور غیر معمولی طور پر لمبی تھیں' لیکن مجھے جس مشاہدے نے دوچار کیا' وہ یہ تھا کہ اس کی دونوں ہتھیلیوں پر بھی بالوں کی طرح نرم نرم رواں موجود تھا..... اس کے ناخن ترشے ہوئے نوکیلے اور خاصے لمبے تھے۔ جب میں نے اس سے پوچھا ہتھیلیوں پر بال کیسے اگ آئے تو اس نے ہنس کر کہا۔ "یہ ہمارا خاندانی ورثہ ہے۔ میری والدہ کی ہتھیلیوں پر بھی ایسے ہی بال ہیں"۔

ایک اور غیر معمولی بات میں نے محسوس کی کہ کارمیلا کے سانس میں عجیب سی خوشبو آیا کرتی ہے۔ کچے گوشت یا خون کی ہلکی سی بو۔ میں نے بارہا اسے کریدنے کی کوشش کی کہ وہ اپنے خاندان کے حالات بتائے' مگر ہر بار اس نے ہنس کر ٹال دیا اور کہا۔ "میں اپنی ماں کی اجازت کے بغیر کچھ نہیں بتا سکتی۔ صرف اتنا کہہ سکتی ہوں۔ ہمارا خاندان کسی زمانے میں بہت قدیم اور عظیم تھا اور ہمارا گھر یہاں سے مغرب کی جانب بہت دور ہے"۔

کبھی کبھی وہ پیار سے اپنی باہیں میرے گلے میں ڈال کر مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیتی اور میری گردن اور رخساروں پر بوسے دیتی۔ اس وقت مجھ پر خوف کی سی کیفیت چھا جاتی اور یوں لگتا جیسے کوئی جانور اپنی زبان سے مجھے چاٹ رہا ہو' مگر جونہی یہ کیفیت ختم ہو جاتی اور میں سُروں میں آکر آنکھیں بند کرلیتی۔ کارمیلا

نے اسی طرح ایک دن مجھے لپٹا لیا اور میرے کان میں چپکے سے کہا۔

"لارا' تم میری ہو..... ہمیشہ کے لیے..... تمہارا خون میرا خون ہے .... اور میرا خون تمہارا....."

اس وقت میں سمجھی وہ محبت سے مجبور ہوکر ایسا کہہ رہی ہے اور آج اتنے برس بعد یہ تمام واقعات لکھتے ہوئے میرا ہاتھ کانپ رہا ہے۔ خدا کی پناہ! کاش میں اس جملے کا مطلب بھی سمجھ جاتی۔

وہ روزانہ سورج غروب ہونے سے کچھ دیر پہلے اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ اس وقت دنیا کی کوئی طاقت کارمیلا کو اپنے کمرے میں جانے سے باز نہ رکھ سکتی تھی۔ کئی مرتبہ ہم باتوں میں اس قدر محو ہو جاتے کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہ رہتا' لیکن جونہی سورج مغرب میں اپنا چہرہ چھپا لیتا وہ ایک دم اچھل کر کھڑی ہو جاتی۔

"پیاری لارا' اب میں جاتی ہوں۔ کل دوپہر کو ملاقات ہوگی"۔

یہ کہہ کر دوڑتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی جاتی۔ اسے ہمارے گھر میں داخل ہوئے کئی دن ہوگئے' لیکن اس کا لباس وہی تھا جو اس نے اوّل دن سے پہن رکھا تھا۔ میں نے ایک دومرتبہ اسے اپنے نئے اور نفیس کپڑے دینے کی کوشش کی مگر اس نے نفی میں گردن ہلائی اور اس انداز سے میری جانب دیکھا کہ مجھے دوبارہ اس پیش کش کی جرأت نہ ہوئی۔

وہ ٹھیک ایک بجے دوپہر اپنے کمرے سے برآمد ہوتی اور سیدھی میرے پاس آتی۔ کتے اگر میرے قریب بیٹھے ہوتے تو اسے دیکھتے ہی بھاگ جاتے۔ ایک دفعہ اس نے ایک کتا پکڑ لیا' تو بے چارے جانور پر اتنی دہشت طاری ہوئی کہ بیان سے باہر' بالکل جیسے مرگیا ہو' لیکن جونہی اسے چھوڑا' وہ دُم دبا کر بھاگا اور بہت دیر تک دکھائی نہ دیا۔

کارمیلا کو روشنی سے جیسے نفرت تھی۔ دن کے وقت بھی باغ کے اس حصے میں جاتی جو حد درجہ گنجان اور گھنا تھا اور جہاں اونچے اونچے درختوں کی شاخیں

آپس میں اس طرح ملی ہوئیں کہ سورج کی روشنی مشکل سے زمین تک پہنچ پاتی۔ لکڑی کے ایک سال خوردہ بنچ پر ہم دونوں بیٹھ جاتے اور باتیں شروع کر دیتے۔

ایک دوپہر کا ذکر ہے' ہم دونوں باغ کے اسی تاریک حصے میں بنچ پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ جنازے کا ایک جلوس آتا دکھائی دیا۔ ایک دن پہلے ہی جنگل کے چوکیدار کی لڑکی مرگئی تھی اور اب وہ اسے دفنانے جارہے تھے۔ جنازے کے جلوس میں دس بارہ سے زیادہ آدمی نہ تھی اور سب کے سب ادنیٰ درجے کے۔ غم واندوہ سے ان کے سر جھکے ہوئے' مدھم آوازوں میں دعائیہ کلمات پڑھتے ہوئے آرہے تھے۔

جب وہ ہمارے قریب آئے تو جنازے کے احترام میں مَیں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ان کی آواز میں آواز ملاکر دعا کرنے لگی۔ کارمیلا ویسے ہی بیٹھی رہی۔ یک لخت اس نے کرخت لہجے میں کہا۔

"لارا چپ ہو جاؤ..... میں کہتی ہوں چپ ہو جاؤ۔"

میں نے حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیوں؟ ہمیں جنازے کا احترام اور مرنے والے کے حق میں دعا کرنی چاہیے"۔

"نہیں' نہیں' نہیں...." اس نے چلاتے ہوئے جواب دیا اور اس کی حالت میں دفعتہً ایسا تغیر برپا ہوا کہ میرا دل کانپ اٹھا۔ وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں شعلے برسارہی تھیں' منہ کھلا ہوا اور سرخ سرخ ہونٹوں میں لمبے سے نوکیلے سفید دانت جھانک رہے تھے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یوں لگا جیسے کسی درندے کا جبڑا کھل گیا ہو۔ شدتِ غیظ سے اس کا چہرہ بھی لال انگارہ ہو رہا تھا۔ چند ثانیے تک اس کی یہی حالت رہی۔ بغیر یک لخت پرسکون ہوگئی۔

"معاف کرنا لارا' میں کچھ زیادہ ہی ناراض ہوگئی۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑلیا۔ "تم خفا تو نہیں ہوئیں؟"

"نہیں ..... میں خفا تو نہیں ہوئی' مگر مجھے حیرت ہے دعائیں پڑھنے سے

تمہیں چڑکیوں ہے؟"

"ہمارے خاندان میں ایسا رواج نہیں۔" کارمیلا نے سنجیدگی سے کہا۔ "ان دعاؤں سے بھلا کیا فائدہ؟ ہر شخص کو جلد یا بدیر مرنا ہے۔ مجھے بھی' تمہیں بھی سب کو .... آؤ اب گھر چلیں ....."

"والد گھر پر نہ ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "وہ قبرستان میں جنازے کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ چوکیدار کی لڑکی بہت اچھی تھی۔ نہایت تندرست اور خوش و خرم مگر چند دن کے اندر اندر سوکھ کر کانٹا ہوگئی اور پھر موت کے خونیں پنجے نے اس کا گلہ دبا دیا"۔

"لارا' اب یہ موضوع بند کر دو۔" کارمیلا نے غصے سے کہا۔ "سبھی کو ایک نہ ایک دن مرنا ہے۔ مجھے اس ذکر سے وحشت ہوتی ہے"۔

"مگر سنو تو کارمیلا۔" میں نے اس کا غصہ نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "مرنے سے پہلے لڑکی بار بار یہی کہتی کہ اس نے جنگل میں ایک چڑیل کو گھومتے دیکھا ہے اور وہی چڑیل اسے ہر رات تنگ کرتی رہی ہے"۔

کارمیلا نے قہقہہ لگایا۔ "کیسے بے وقوف ہیں یہ لوگ! چڑیلیں بھلا کسی کا کیا بگاڑ سکتی ہیں۔ میں تو جب جانوں کوئی چڑیل مجھے تنگ کرے"۔

اس طرح کی باتیں کرتے ہوئے ہم دونوں قلعے میں واپس آگئے۔ شام قریب تھی۔ کارمیلا اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ مادام پیری ڈون اور مادام لافونٹین میرا انتظار کر رہی تھیں۔ خوف اور وحشت سے ان دونوں کے چہرے زرد تھے۔ انہوں نے مجھے ایک لرزہ خیز کہانی سنائی۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ گردونواح میں گذشتہ کئی روز سے عجیب و غریب اور نہایت پراسرار وارداتیں ہو رہی ہیں۔ چوکیدار کی لڑکی کے علاوہ ایک کسان کی بیوی بھی اس بیماری سے مری ہے۔ یعنی جسم سے خون کا غائب ہو جانا' جنگل میں اکثر جانوروں کو اس عالم میں دیکھا گیا کہ ان کی گردنیں روندی ہوئی تھیں۔ کئی گیدڑ اور بھیڑیے اس حالت میں پائے گئے۔ ان کے علاوہ چرواہے کی دو بھیڑیں بھی یکے بعد دیگرے گم ہوئیں۔

چاندنی راتوں میں کئی لوگوں نے جنگل اور پہاڑی کے اوپر کسی کو چلتے پھرتے دیکھا ہے اور سب لوگ اس خوف سے سہمے ہوئے ہیں کہ واقعی کوئی بلا نازل ہوگئی ہے۔

مادام پیری ڈون نے مجھے سمجھایا آئندہ تم جنگل کی طرف نہ جانا' اور اگر جاؤ بھی تو صرف والد کے ساتھ۔ ابھی یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ والد آگئے۔ ان کے چہرے پر بھی غور و فکر کی گہری لکیریں نمایاں تھیں۔ آرام کرسی پر بیٹھ کر انہوں نے کہا۔

"چوکیدار کی لڑکی کی موت عجیب حالات میں واقع ہوئی۔ میرا خیال ہے وہ پاگل ہوگئی تھی۔ وہ راتوں کو سوتے سوتے چلانے لگتی۔ مجھے چڑیل چمٹ گئی ہے اور خون چوس رہی ہے۔ جب اس سے پوچھا جاتا چڑیل کیسی ہے تو کہتی ایک بہت بڑی چمگادڑ جس کا چہرہ عورت کا ہے۔ لڑکی نہایت تندرست اور توانا تھی اور سیب کی مانند اس کا چہرہ سرخ تھا' لیکن چند دن کے اندر اندر سوکھ کر کانٹا ہوگئی۔ حیرت انگیز طور پر خون اس کے جسم سے غائب ہو رہا تھا۔ بظاہر اسے کوئی بیماری نہ تھی اور نہ اس کے جسم پر کوئی زخم دیکھا گیا اور عجیب بات یہ کہ مرنے کے بعد جب اس کی لاش تابوت میں رکھی گئی تو وہ پہلے کی طرح تندرست اور توانا دکھائی دینے لگی۔ اس کا چہرہ ویسا ہی سرخ اور سپید ہوگیا جیسا ہوا کرتا تھا اور اسے تابوت میں پڑے دیکھ کر کوئی نہ کہہ سکتا یہ لڑکی مرچکی ہے۔ اس کی آنکھوں میں گہری چمک اور ہونٹوں کا رنگ بھی سرخ تھا۔ لوگوں نے اس کی لاش دیکھی تو خوفزدہ ہوگئے اور کہنے لگے یہ سب جادو ہے اور یقیناً" اس لڑکی کے جسم میں کوئی بد روح سما گئی ہے"۔

والد یہ باتیں کر رہے تھے اور میرا خون خشک ہو رہا تھا۔ تمام ملازمین دائیں بائیں دم بخود کھڑے تھے اور ان کے رنگ زرد تھے۔ چند لمحے چپ رہنے کے بعد والد پھر بولے۔

"بہر حال یہ سب اوہام ہیں۔ میرا خیال ہے وہ لڑکی کسی پراسرار مرض میں

گرفتار ہو کر مری ہے۔ کوئی اچھا تجربہ کار معالج ہی اس کا سراغ لگا سکتا تھا اور ہمارا خستی سے پوکیدار اس قابل نہ تھا کہ بڑے معالج کو بلا کر اپنی بیٹی کا معائنہ کراتا۔ ان چڑیلوں اور بد روحوں کے قصوں کو میں پرکاہ کے برابر بھی اہمیت نہیں دیتا۔ اچھا' اب تم لوگ آرام کرو۔ رات سر پر آچکی ہے"۔

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔

اس رات مادام پیری ڈون میرے کمرے ہی میں اپنا بستر لئے آئی۔ وہ مسلسل زیر لب کچھ پڑھ رہی تھی اور اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر سنجیدہ تھا۔ غالباً اسے رات کو بھی نیند نہ آئی' کیونکہ کئی بار اس کے اٹھنے اور کھڑکی سے باہر جھانکنے کی آہٹ پاکر میری آنکھ کھل گئی۔ ابھی سورج طلوع ہونے میں خاصی دیر تھی کہ مادام نے مجھے اٹھایا۔

"لارا' جلدی سے اٹھو اور کھڑکی سے باہر دیکھو"۔ مادام نے دبے لفظوں میں کہا اور میں نے محسوس کیا دہشت سے اس کی آواز کانپ رہی ہے۔ میں اٹھ کر کھڑکی کی طرف گئی۔ باہر سخت اندھیرا تھا' کچھ نظر نہ آیا۔

"مجھے تو کچھ نظر نہیں آتا"۔ میں نے کہا۔ "آخر تم نے کیا دیکھا؟"

"باغ میں دیکھو..... باغ میں....." مادام نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ "کوئی سفید سفید سی شے تمہیں دکھائی دے گی"۔

اب میں نے غور سے باغ کی جانب دیکھا۔ درختوں کے جھنڈ کے اندر واقعی کوئی سفید سفید چیز حرکت کر رہی تھی۔ یقیناً یہ جانور نہیں ہو سکتا۔ کوئی انسان تھا' مگر اس وقت قلعے کے باغ میں کون ہو سکتا تھا؟ ہم دونوں سانس روکے اور پلک جھپکائے بغیر باغ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ پُراسرار شے جس نے سر سے پیر تک سفید لبادہ اوڑھ رکھا تھا' کئی مرتبہ ہمیں نظر آئی اور پھر غائب ہو گئی۔ خوف سے ہمارا بُرا حال ہو گیا۔ مادام پیری ڈون نے کپکپاتی آواز میں دعائیہ کلمات پڑھنے شروع کر دیئے اور جلدی سے کھڑکی بند کر دی۔ رات کا باقی حصہ ہم نے جاگ کر گزارا۔

اگلے روز والد کو ہم نے یہ قصہ سنایا۔ وہ ملازموں کو لے کر باغ میں گئے ایک ایک گوشہ دیکھا بھالا' مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ انہوں نے اسے ہمارا وہم اور فریبِ نظر قرار دیا۔

ایک بجے کارمیلا اپنے کمرے سے نکل کر میرے کمرے میں آئی۔ میرے چہرے کی اڑی ہوئی رنگت سے اس نے اندازہ کیا کوئی غیر معمولی بات ہے۔ حال پوچھا تو میں نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر دیا۔ کہنے لگی۔ "آؤ جنگل کی طرف چلتے ہیں' وہیں بیٹھیں گے شاید تمہاری طبیعت بحال ہو جائے۔ کارمیلا نے اس پیار سے یہ بات کہی کہ میں بے اختیار اس کے ساتھ ہولی۔ اسی سال خوردہ بنچ پر بیٹھ کر اس نے کہا۔ "ہاں' اب بتاؤ تم اتنی پریشان اور اداس کیوں ہو؟"

میں نے اسے گذشتہ رات کا قصہ سنایا۔ وہ چپ چاپ سنتی اور مسکراتی رہی۔ پھر میں نے والد کی زبانی سنایا ہوا وہ واقعہ بیان کیا جب چوکیدار کی بیٹی تابوت میں رکھی گئی اور دیکھنے والوں کو یوں لگا جیسے وہ مری نہیں' زندہ ہے۔ مرنے سے چند روز پہلے وہ سوکھ کر کانٹا ہوگئی تھی اورخون کا ایک قطرہ بھی اس کے جسم میں نہ تھا۔ لیکن مرنے کے بعد.....؟

یک لخت رک کر میں نے جونہی کارمیلا کی طرف دیکھا۔ اس کے جسم پر لرزہ طاری تھا اور چہرہ تپتے ہوئے تانبے کی مانند سرخ۔ وہ باربار دانت پیس رہی تھی اور میں نے دیکھا اس کے نوکیلے ناخن لکڑی کی بنچ میں گڑے ہوئے تھے۔

"کارمیلا' کیا بات ہے۔ تمہیں سردی تو نہیں لگ رہی؟"

"نہیں مجھے سردی نہیں لگا کرتی۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ آئندہ تم چوکیدار کی بیٹی کا قصہ میرے سامنے نہ کہوگی' میں اسے سنتے سنتے عاجز آچکی ہوں"۔

میں خاموش ہوگئی۔ دیر تک ہم دونوں چپ چاپ رہے۔ مغرب کی جانب سے یکایک سیاہ گھٹا تیزی سے اُمڈی۔ ہوا کے جھونکے جنگل میں سیٹیاں بجانے لگے رہے تھے۔ ہلتی شاخوں اور گرتے پتوں کا شور بے پناہ تھا۔ عین اسی لمحے میں نے دیکھا پل کی جانب سے ایک آدمی ہماری طرف آرہا ہے۔ سر سے پاؤں تک اس کا لباس سیاہ تھا اور زرد رنگ کے چہرے پر لمبی کالی داڑھی۔ اس کے رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئیں۔ بے حد دبلا پتلا' اس کے بائیں ہاتھ میں لاٹھین نتھی اور کمر پر لکڑی کا ایک صندوقچہ دھرا ہوا تھا جس کی پیٹی اس شخص کے گلے میں پڑی تھی۔ میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ یہ ایک شعبدے باز تھا جو اپنے آپ کو جادوگر کہا کرتا اور کبھی کبھی ہمارے قلعے میں آن کر عجیب عجیب شعبدے دکھاتا' والد خوش ہوکر اسے انعام دیتے۔ سال بھر میں ایک دومرتبہ ہی اس کا پھیرا لگتا۔ اس کا پالتو کتا پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ دفعتہً کتا پل عبور کرتے ہی رک گیا۔ ایسا معلوم ہوتا کسی ان دیکھی قوت نے اسے وہیں جکڑ دیا ہو۔ اس کی دم ٹانگوں میں دبی ہوئی تھی۔ پھر اس نے منہ اوپر اٹھا کر بھیانک آواز میں رونا اور بھونکنا شروع کر دیا۔ شعبدے باز نے مڑکر اس کی طرف دیکھا اور اسے آنے کے لیے آواز دی' مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ تب وہ خود پل کے پاس گیا اور کتے کا پٹا پکڑ کر اسے گھسیٹنے لگا' لیکن اس نے اپنے پنجے زمین میں گاڑ دیے۔ اب شعبدے باز اسے گالیاں دے رہا تھا۔ اس نے دوتین لاتیں بھی رسید کیں' مگر بے سود۔ وہ اپنی جگہ سے ہلنے کا نام نہ لیتا تھا۔ تنگ آکر شعبدے باز نے اسے وہیں چھوڑا اور سیدھا ہماری طرف آیا۔ اس نے جھک کر باری باری ہم دونوں کو سلام کیا۔ پھر ہمارے سامنے ہی زمین پر بیٹھ گیا۔

"میں آپ کے لیے ایک تحفہ لایا ہوں معزز خواتین"۔ اس نے ہنس کر کہا۔ پھر گردن موڑ کر کتے کو موٹی سی گالی دی جو ابھی تک منہ اٹھائے بری طرح رو رہا تھا۔ "معافی چاہتا ہوں۔ آج اس نامراد کو نہ جانے کیا دورہ پڑ رہا ہے رونے کا۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا ڈبہ کھولا اور جنگلی لہسن کے پھولوں کا ایک مرجھایا ہوا ہار نکال کر میری طرف بڑھایا۔

"یہ آپ کے لیے ہے خاتون اسے اپنے پاس رکھیے یا گلے میں ڈالیے یہ آپ کو بد روحوں سے محفوظ رکھے گا۔" میں نے جلدی سے ہار لے لیا۔ اب اس

نے دوسرا ہار نکال کر کارمیلا کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ کارمیلا نے وہ ہار اس سے چھین لیا اور توڑ مروڑ کر ایک طرف پھینک دیا۔ اس کے لبوں پر عجیب سی مسکراہٹ تھی اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

"آہ! معزز خاتون کو میرا تحفہ پسند نہیں آیا۔" شعبدے باز نے کہا۔ "مگر میں دیکھتا ہوں معزز خاتون کے دانت بہت خوبصورت ہیں' موتیوں کی طرح تیز کانٹوں کی طرح لمبے اور نکیلے۔ ایسے حسین دانت کبھی کبھار ہی دیکھنے میں آتے ہیں"۔

کارمیلا نے دانت پیس کر ایک طمانچہ شعبدے باز کے منہ پر مارا اور وہ لڑھکنیاں کھاتا ہوا دور جاگرا۔ میں حیران تھی اس نازک لڑکی میں اتنی طاقت چھپی ہوئی ہے۔ اب وہ ایک خونخوار بلی کی مانند اس پر نظریں جمائے ہوئے تھی جو خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا اور اس میں اٹھنے کی سکت نہ تھی۔ دفعتہً وہ سجدے میں گر گیا اور اپنے قصور کی معافی مانگنے لگا۔ کارمیلا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس نے میری سخت تذلیل کی ہے۔ اگر یہ ہمارے علاقے میں ہوتا تو اب تک اس کی لاش پھڑک رہی ہوتی پھر بھی میں تمہارے والد سے اس کی شکایت کروں گی اور ان سے کہوں گی کہ ہنٹروں سے اس کی خوب مرمت کریں"۔

"مگر پیاری کارمیلا' آخر اس کا قصور کیا ہے جو تم اتنی خفا ہوئیں؟"

"یہ ادنیٰ درجے کا آدمی اور میرے دانتوں کی تعریف کرے۔" کارمیلا نے فخر سے گردن اٹھا کر جواب دیا۔ "اب اسے حکم دو یہاں سے دفان ہو جائے .... اور ہاں تم بھی اس کا یہ منحوس ہار پھینک دو۔" اس نے میرے ہاتھ سے ہار لینا چاہا' لیکن میں نے غیر شعوری طور پر ہاتھ پیچھے کر لیا اور ہار اسے نہ دیا۔

"اب غصہ تھوک دو کارمیلا' دیکھو وہ بد نصیب اپنی گستاخی کی معافی مانگ رہا ہے"۔

میں نے وہ ہار تبرکاً اپنے گلے میں ڈال لیا۔ کارمیلا نے دوبارہ کچھ نہ کہا اور شعبدہ باز نفرت و حقارت کی نگاہ ڈالتی ہوئی قلعے کی طرف چل دی۔ میں بیٹھی رہی۔ کارمیلا نے ایک بار بھی مڑ کر میری طرف نہ دیکھا۔ مجھے اس کے رویے پر رنج ہوا۔ تھوڑی دیر بعد شعبدہ باز نے گردن اٹھائی' ایک سرد آہ بھری اور میرے قریب آن کھڑا ہوا۔ میں نے دیکھا اس کے کتے نے بھی رونا اور چلانا بند کر دیا اور دوڑتا ہوا آیا اور اپنے مالک کے پاس کھڑا ہو کر دم ہلانے لگا۔

"مجھے افسوس ہے میں نے معزز خاتون کو صدمہ پہنچایا۔" اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "مگر کیا میں پوچھ سکتا ہوں یہ خاتون کون تھیں اور قلعے میں کب سے ہیں؟"

"تمہیں یہ سوال کرنے کا حق کیونکر ہے؟" اس مرتبہ مجھے طیش آگیا۔ "وہ میرے یہاں مہمان ہے اور بڑے معزز خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ تم کیوں پوچھتے ہو؟"

"میں پھر معافی چاہتا ہوں۔" اس نے عاجزی سے کہا۔ "مجھے شک سا ہوا تھا۔"

"شک؟ کیسا شک؟" میں نے مزید ناراض ہو کر کہا۔

"چلے جانے دیجئے۔" اس نے سلام کرتے ہوئے کہا اور کتے کو لے کر قلعے کی طرف چل پڑا۔ اس کا خیال ہوگا والد سے کچھ رقم اینٹھے۔ تھوڑی دیر بعد میں اٹھی اور قلعے کی طرف چلی گئی۔ شعبدے باز' دروازے کے باہر ہی بیٹھا تھا۔ میں پر سرسری نگاہ ڈالتی ہوئی اندر چلی گئی۔ معلوم ہوا والد کہیں گئے ہیں۔ ان کے لوگوں میں سے ایک چند منٹ پہلے آیا تھا۔ اس نے کوئی پیغام دیا اور فوراً چلے گئے ہیں کہ رات کے کھانے پر ان کا انتظار نہ کیا جائے۔ کارمیلا اپنے کمرے میں آچکی تھی۔ مادام لافونٹین نے بتایا وہ سر میں درد کی شکایت کر رہی تھی اس لئے کہ گئی کسی فرد کو اس کے کمرے میں جانے کی اجازت نہیں ہے۔

والد رات کے کھانے سے قبل ہی آگئے اور آتے ہی انہوں نے ایک ملازم کے بیٹھے ہوئے شعبدہ باز کو کچھ نقدی اور کھانے پینے کی چیزیں دے کر رخصت کرنے کا حکم دیا۔ رات ہوگئی تھی۔ انہوں نے شعبدہ باز سے بہت کہا قلعے میں

آجائے اور صبح چلا جائے' مگر وہ اندر آنے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس نے والد
بھی جنگلی لسن کے پھولوں کا ایک ہار تختے میں دیا جسے انہوں نے کھانے کی
ایک طرف رکھ دیا۔ میں نے دیکھا والد سخت مضطرب اور گھبرائے ہوئے ہیں۔
انہوں نے کھانے میں بھی دل چسپی نہ لی' چند لقمے بمشکل لئے اور اٹھ کھڑے
ہوئے۔ تھوڑی دیر بعد میں ان کے کمرے میں گئی' تو وہ کچھ لکھ رہے تھے۔ مجھے
دیکھ کر لکھنا بند کر دیا اور بڑی شفقت سے اپنے پاس ہی بٹھالیا۔

"ابا آپ خاصے پریشان دکھائی دیتے ہیں۔ کیا کوئی ایسی بات ہے جو مجھے نہیں
بتائی جاسکتی؟"

انہوں نے چند لمحے غور سے میری طرف دیکھا' پھر پھیکا سا تبسم ہونٹوں
لاکر بولے۔

"نہیں بیٹی' بھلا ایسی بات کون سی ہوگی جو میں تم سے چھپاؤ' صرف اس
ذکر نہیں کرتا تمہیں خواہ مخواہ پریشانی ہوگی' ناسمجھ ہو' اس لیے....."

میں نے ان کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور کہا۔

"کیا آپ سمجھتے ہیں آپ کو پریشان دیکھ کر بھی میں افسردہ نہ ہوں گی؟"

"یہ بات تو ٹھیک ہے .... مگر میں خود حیران ہوں کن الفاظ میں تم سے
حادثے کا ذکر کروں جو سہ پہر کو نہ صرف میرے کانوں تک پہنچایا گیا' بلکہ میں
خود اپنی آنکھیں سے دیکھ بھی لیا"۔

معاً میرا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ خدا خیر کرے! والد تو فولادی اعصاب
مالک ہیں' اگر یہ کسی حادثے سے پریشان اور مضطرب ہوسکتے ہیں تو اندازہ
جاسکتا ہے اس کی نوعیت کیسی بھیانک ہوگی..... انہوں نے خود ہی کہنا شروع کیا

"پیاری بیٹی' تم جانتی ہو ہر ہر مرحلے پر خدا کی اور اس کی مشیت ہی کام
ہے۔ سہ پہر کو مزارعوں میں سے ایک شخص آیا تھا اور اس نے مجھے بتایا کہ
نوجوان بہن عالم نزع میں ہے چند روز قبل اس نے غیر معمولی تھکن اور کمزو
کی شکایت کی۔ اس سے پہلے اسے ہلکا سا سردرد اور بخار بھی کبھی نہ ہوا تھا

اس کا صحت مند جسم گھلنے لگا اور چہرے پر پژمردگی چھاگئی۔ لڑکی کا بیان
رات کی تاریکی میں کوئی ذی روح اس کے سینے پر سوار ہو جاتا ہے اور پھر اسے
چھ ہوش نہیں رہتا۔ بیدار ہونے کے بعد حالت غیر ہوتی ہے جیسے برسوں کی
ریض ہو۔ ہلنے جلنے کی سکت بھی نہیں رہتی۔ کسانوں نے ٹونے ٹوٹکے سے اس کا
لاج کیا' مگر بے سود اور آج شام سورج غروب ہونے سے چند لمحے پیشتر اس کا
نتقال ہوگیا"۔

والد نے گہری آہ بھری اور پھر سلسلہ گفتگو شروع کیا۔ "حیرت کن بات یہ
ہے جونہی لڑکی نے جان دی اور اس کی نبض ساکت ہوئی' اس کے جسم کی گم
دہ توانائی لوٹ آئی۔ اس کا چہرہ حسبِ معمول سرخ و سفید ہوگیا۔ اس کی
نکھوں کی چمک دمک میں بھی پہلے سے اضافہ ہوگیا تھا۔ کسان تو یونہی توہم
پرست ہوتے ہیں۔ انہوں نے لاش کے قریب جانے سے انکار کر دیا تھا۔ میں نے
نہیں مجبور کیا' تو اس حد تک تیار ہوئے کہ تابوت اٹھاکر قبرستان تک لے جائیں
اور گورکن کی نگرانی میں چھوڑ دیں۔ دفن کا مرحلہ اب کل طے کیا جائے گا۔ اس
ملاقے میں یہ دوسری پُراسرار انسانی موت ہے اور میں اسی وجہ سے مضطرب ہوں
آخر معاملہ کیا ہے۔ آیا یہ کوئی مرض ہے یا واقعی ...."

"کوئی بد روح ہے۔" میں نے جملہ مکمل کر دیا۔ وہ پھر مسکرائے اور کہنے
لگے۔

"میں نے ایک آدمی کے ہاتھ ڈاکٹر کو پیغام بھیج دیا ہے کہ صبح ہوتے ہی چل
پڑے تاکہ دفن سے پہلے پہلے یہاں پہنچ جائے۔ میں چاہتا ہوں وہ بھی لاش کو ایک
نظر دیکھ لے"۔

"کل میں بھی آپ کے ساتھ قبرستان چلوں گی اور لاش دیکھوں گی۔ آپ
مجھے لے چلیں گے؟"

"ہاں ضرور لے چلوں گا۔ میں نہیں چاہتا میری بیٹی کم ہمت اور بزدل بن
جائے۔" انہوں نے کہا۔ "اب جاؤ اور سوجاؤ"۔

وہ رات بھیانک خواب دیکھتے کٹی۔ لاشیں ہی لاشیں۔ چلتی پھرتی لاشیں:
بڑی بڑی چمگادڑیں جھپٹ رہی تھیں۔ چمگادڑیں جن کے چہرے انسانوں کے
تھے اور ان کے جبڑوں سے خون ٹپک رہا تھا۔

صبح اٹھی، تو طبیعت سخت مضمحل تھی۔ جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا جیسے کسی نے میری خوب پٹائی کی ہو تاہم ناشتے کے لیے آنا ہی پڑا۔ عین اسی لمحے بوڑھا ڈاکٹر ہاتھ میں تھیلا سنبھالے کمرے میں داخل ہوا۔ والد نے خوش آمدید کہا اور اسے بھی ناشتے میں شریک کرلیا۔ اس دوران میں کوئی گفتگو نہ ہوئی۔ فارغ ہوکر ہم سب گھوڑا گاڑی میں سوار ہوئے اور قبرستان کی طرف چلے جو قلعے سے جنوب کی طرف کوئی پانچ میل دور ڈھلوانی راہ پر تھا۔۔ راستے میں والد اور ڈاکٹر دبی زبان سے کچھ ایسی باتیں کرتے رہے کہ کوشش کے باوجود ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہ آیا۔

قبرستان میں گورکن اور کسانوں کے ایک چھوٹے سے گروہ کے سوا کوئی نہ تھا، وہ سب والد کا انتظار کر رہے تھے۔ گورکن کی کوٹھڑی میں تابوت رکھا تھا۔ ہم تینوں افراد کوٹھڑی میں داخل ہوئے۔ والد اور ڈاکٹر نے مل کر تابوت کا ڈھکنا اٹھا کر نیچے رکھا ہم دم بخود رہ گئے۔ میں نے بھی دھڑکتے دل سے تابوت میں جھانکا اور بمشکل اپنی چیخ روک سکی۔

تابوت کے اندر جو کچھ تھا، میں قسم کھا کر کہہ سکتی ہوں وہ لاش ہرگز نہ تھی۔ اس کی آنکھیں کھلی اور ان میں اتنی چمک تھی کہ نگاہ ملانا دشوار ہوگیا۔ اس کے دونوں ہاتھ سفید کفن سے باہر نکلے ہوئے اور ہونٹ کبوتر کی طرح سرخ اور تر۔ ڈاکٹر نے جھک کر لاش کے دل پر ہاتھ رکھا پھر جسم کے مختلف حصے ٹٹولے اور مایوس ہوکر گردن نفی میں ہلائی۔

"اس میں زندگی کی رمق موجود نہیں، مگر ظاہری حالت ایسی ہے کہ اسے مرا ہوا نہیں کہا جاسکتا۔ دل کی حرکت بالکل بند ہے بہر حال اسے دفن کر دینا چاہیئے۔"

تدفین کے مراحل جلد ہی طے ہوگئے اور ہم سب قبرستان سے نکل کر گاڑی
ں سوار ہوئے۔ قلعے میں آئے، تو دوپہر ہوچکی تھی لیکن سیاہ بادلوں کے باعث
رج کا چہرہ نظر نہ آیا۔ ایسا لگتا کسی بھی لمحے موسلادھار بارش شروع ہوجائے
ی۔ فضا میں سردی دم بدم بڑھتی جارہی تھی۔

والد ڈاکٹر کو لے کر سیدھے اپنے کمرے میں چلے گئے اور دیر تک نہ جانے
ن میں کیا گفتگو ہوئی۔ آخر کمرے کا دروازہ کھلا اور دونوں آدمی برآمد ہوئے لیکن
س حال میں کہ دونوں بے حد سنجیدہ تھے۔ مجھے دکھانے کو والد نے ڈاکٹر کی کسی
رگوشی پر ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "میں تو خواہ مخواہ ڈر گیا۔ اچھا یہ بات
ی ؟"

ڈاکٹر کی روانگی کے بعد والد نے مجھے اپنے پاس بلایا اور ابھی بات شروع ہی
کی تھی کہ ملازم نے آن کر خبر دی، شہر سے تصویریں آگئی ہیں۔ آدمی بھی ساتھ
ہے تاکہ انہیں دوبارہ ان کی جگہ پر لگادے والد اٹھ کھڑے ہوئے اور صحن کی
ف چلے۔ میں بھی ان کے ساتھ گئی۔ قصہ یہ تھا ہمارے قلعے میں بے شمار قدیم
رنگی تصویریں سجی ہوئی تھیں جو امتداد زمانہ کے باعث خاصی دھندلی ہو رہی
تھیں عرصے سے ان کی صفائی نہ ہوئی فریم نیم بوسیدہ ہوگئے۔ والد نے یہ سب
ویریں اتروا کر شہر کے ایک مصور کو بھجوادی تھیں کہ وہ انہیں تروتازہ کر
ے اور جن کے فریم خراب ہوگئے ہیں، ان کے فریم بھی نئے بنوا دے۔ لکڑی
دو بڑے بڑے صندوقوں میں یہ تصویریں بھر کر آئی تھیں اور ملازم انہیں
دوقوں سے نکال نکال کر احتیاط سے رکھ رہے تھے۔ جو آدمی انہیں خچر گاڑی پر
لایا تھا، وہ روٹی کھا رہا تھا۔ اتنے میں وہ بھی منہ پونچھتا ہوا آگیا اور والد کو
م کیا۔ والد نے ان تصویروں کی فہرست اپنے کمرے سے منگوائی اور پڑتال
کی۔ میں ایک طرف کرسی پر بیٹھ گئی۔ چند لمحے بعد کارمیلا بھی مسکراتی ہوئی
یرے قریب پڑی ہوئی دوسری کرسی پر آبیٹھی۔ میں نے دیکھا اس کا چہرہ پہلے
کہیں زیادہ تروتازہ اور اس کے گلابی رخسار بے حد شاداب تھے۔ ہونٹوں کی

سرخی میں بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ اس نے محبت سے میرا ہاتھ دبایا اور کہا۔

"اخاہ، اتنی تصویریں..... یہ کہاں سے آئیں؟"

میں نے مختصر الفاظ میں اسے ان تصویروں کے بارے میں بتایا۔ والد نے مسکرا کر کارمیلا کی طرف دیکھا۔ مزاج پرسی کی اور پھر پڑتال میں لگ گئے۔ وہ جس تصویر کا نام لیتے یا نمبر شمار بتاتے، وہی تصویر فوراً انہیں دکھادی جاتی۔ ان میں سے اکثر دوسو اور تین سو سال پرانی تھیں۔ بعض چار چار فٹ لمبی اور اتنی ہی چوڑی تھیں۔ ان میں سے بعض میری والدہ کے خاندانی افراد کی بھی تھیں۔

یکایک والد نے کہا۔ "ایک تصویر غائب ہے جو مرسیا کرسٹین نام کی ایک خاتون کی ہے اور تقریباً دوسو برس پرانی۔ یہ بہت میلی ہوگئی تھی۔ شاید مصور نے اپنے پاس ہی رکھ لی ہو، کیونکہ اسے صاف کرنے میں اس کا خاصا وقت صرف ہوگا"۔

تصویریں لانے والے آدمی نے باری باری دونوں صندوقوں میں جھانکا۔ پھر ایک صندوق سے تصویر نکالتے ہوئے بولا۔ "جی نہیں، وہ تصویر بھی حاضر ہے۔ صندوق میں رہ گئی تھی۔ مصور نے اسے صاف کرنے میں بڑی محنت کی ہے۔"

کہہ کر اس نے تصویر والد کی طرف بڑھائی۔ اب مجھے یاد آیا، میں نے یہ تصویر دیکھی ہے۔ یہ ڈیڑھ فٹ لمبی اور ڈیڑھ فٹ چوڑی تھی جو قلعے کے ہال کمرے۔ صدر دروازے کے عین اوپر لگی ہوئی تھی اور مرسیا کرسٹین ۱۶۹۸ صاف پڑھا جا تھا۔

والد نے تصویر کو ایک نظر دیکھا اور ان پر جیسے سکتے کا عالم طاری ہوگیا۔ وہ کے بت بنے، پلک جھپکائے بغیر اسے تکتے رہے۔ اسی حالت میں بمشکل دو منٹ گزرے ہوں گے کہ انہوں نے قہقہہ لگا کر تصویر میرے سامنے رکھ دی۔

"ارے، یہ تو کارمیلا کی تصویر ہے۔" میں نے چلا کر کہا۔ "بالکل کارمیلا کی تصویر، وہی ناک نقشہ ویسی ہی آنکھیں، ویسے ہی بال، ویسے ہی تھوڑی اور دیکھو، اس کے گلے پر بھی کارمیلا کی طرح ننھا سا تل ہے۔ کارمیلا یہ یقیناً تمہاری تصویر ہے"۔

کارمیلا نے میری بات پر دھیان نہ دیا۔ بے حس و حرکت بیٹھی سامنے خلا میں گھورتی رہی۔ اس کے ہونٹوں پر خوشی اور سرمستی کی پراسرار مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

والد بولے۔ "حیرت انگیز! دونوں میں خاصی مشابہت ہے"۔

"ابا! دیکھیے، تصویر کے کونے میں سنہری حروف میں لکھا ہوا نام بھی اب تک پڑھا جاتا ہے۔ یہ مرسیا نہیں کاؤنٹس مرکالا کرسٹین ہے۔ امی بھی تو کرسٹین خاندان سے تعلق رکھتی ہیں، ان کے ناطے سے میں بھی گویا اسی خاندان کا فرد ہوں۔ یہ تصویر مجھے دے دیجئے اسے میں اپنے کمرے میں لٹکاؤں گی"۔

کارمیلا نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے پہلو بدلا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی آہ نکلی اور بڑے دل گرفتہ لہجے میں بڑبڑائی۔ "اور میں بھی..... میرا خیال ہے میری بھی اس خاندان سے دور دراز کی رشتہ داری ہے۔ کیا اس خاندان کا کوئی آدمی ان ابھی زندہ ہے؟"

"نہیں، والد نے جواب دیا۔" عرصہ ہوا، اس خاندان کا نام ونشان مٹ گیا۔ جنگیں انہیں لے ڈوبی۔ اب تو ان کی عظمت رفتہ کی یادگار ایک قلعے کے کھنڈر ہیں جو یہاں سے تین میل دور ہوں گے"۔

"خوب....." کارمیلا نے بے دلی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر ہال کمرے کے کھلے دروازے سے باہر جھانکتے ہوئے بولی۔ "کتنی حسین چاندنی رات ہے چلو کھلی ہوا میں گھومتے ہیں"۔

"ہاں .... بالکل ایسی خوبصورت چاندنی رات تھی جب تم پہلی مرتبہ یہاں آئی تھیں"۔

کارمیلا نے کوئی جواب نہ دیا۔ اپنی بڑی بڑی چمکیلی آنکھیں میرے چہرے پر گاڑے مسکراتی رہی۔ ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہم دونوں مٹرگشت کرتے باغ میں پہنچ گئے اور پختہ روشوں پر ٹہلنے لگے۔ ٹہلتے ٹہلتے تھک گئے، تو ہم بنچ پر بیٹھ گئے۔ کارمیلا چاند کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر اچانک اس نے اپنا رخ

میری طرف کیا اور سرگوشی کرتے ہوئے بولی۔ "تو تم اس رات کے متعلق سوچ رہی تھی جب میں آئی تھی..... کیا میرے آنے سے تم واقعی خوش ہو؟"

"بہت..... کارمیلا پیاری' میں بہت خوش ہوں"۔

"تمہیں اس عورت کی تصویر بھی اچھی لگتی ہے جس کی شکل مجھ سے ملتی جلتی ہے اور تم اسے اپنے کمرے میں لٹکانا چاہتی ہو"۔

"بالکل...."

اس نے دفعتہ" فرطِ جذبات سے بے قابو ہو کر مجھے اپنے جسم کے ساتھ لپٹا لیا اور پیار کرنے لگی۔ پیار کرتے کرتے اپنا سر میرے کندھے پر رکھ دیا اور اپنے گال میری گردن سے رگڑنے لگی۔ "لارا..... تم کتنی اچھی ہو ہم دونوں ایک جان دو قالب ہیں۔ مجھے ہر وقت تمہارا خیال رہتا ہے اور تم بھی مجھ پر مرتی ہو..."

اس کے لہجے میں نہ جانے کیا بات تھی' میرے جسم میں بے اختیار خوف کی سرد لہر دوڑ گئی اور میں بدک کر نیچے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ مجھے گھور رہی تھی' لیکن اس کی آنکھوں میں پہلی سی چمک اور روشنی نہ تھی۔ چہرہ بھی زرد اور پھیکا پڑ گیا تھا۔ لڑکھڑاتے ہوئے لہجے میں یوں گویا ہوئی جیسے کوئی نیم غنودگی کے عالم میں بول رہا ہو۔ "کیا ہوا میں ٹھنڈک ہے پیاری لارا؟ مجھ پر کپکپی کیوں طاری ہوگئی۔ میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی تھی! چلو اندر چلیں...."

"تمہاری طبیعت ناساز معلوم ہوتی ہے کارمیلا! غشی کا دورہ پڑ گیا تھا شاید۔ اندر چلتے ہیں شراب کے ایک جام سے تمہاری طبیعت فوراً" سنبھل جائے گی"۔

"ہاں' میں اب ٹھیک ہوں۔ چند منٹوں میں میری طبیعت بحال ہو جائے گی۔ تھوڑی سی شراب مجھے ضرور دینا۔" اس نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

دہلیز پر پہنچ کر رک گئی اور میری طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔ "آؤ آخری بار چاندنی کا نظارہ کرلیں۔ آج کے بعد شاید مجھے تمہارے ساتھ چاندنی کا نظارہ دوبارہ نصیب نہ ہو"۔

اس کی حالت میں اس اچانک تغیر سے مجھے بے حد تشویش تھی۔ گردونواح میں پراسرار بیماری کا زور تھا۔ رہ رہ کر خیال آتا' کارمیلا بھی کہیں اس وبا کا شکار تو نہیں ہوگئی۔ چنانچہ اس کی بات سنی ان سنی کرکے پوچھا۔ "اب طبیعت کیسی ہے؟ کیا واقعی ٹھیک ہو؟ پڑوس کے گاؤں میں ایک بہت اچھا اور تجربہ کار ڈاکٹر رہتا ہے وہی جو آج صبح ابا کے ساتھ تھا۔ کہو تو اسے بلوا بھیجیں"۔

"وہ ضرور تجربہ کار ڈاکٹر ہوگا"۔ کارمیلا مسکراتے بولی۔ "لیکن اچھی لڑکی مجھے کسی ڈاکٹر کی ضرورت نہیں۔ معمولی سی کمزوری اور نقاہت کے سوا کیا شکایت ہے؟ میں زیادہ محنت مشقت کی عادی نہیں نا۔ چلنا پڑ جائے' تو جلد نڈھال ہو کر بے دم ہو جاتی ہوں اور مجھ پر غشی کا ہلکا سا دورہ پڑ جاتا ہے ویسا ہی جس کا مشاہدہ تم نے آج کیا۔ دیکھ لو اب میں اچھی بھلی ہوں"۔

رات کے کھانے پر کارمیلا اگرچہ ڈرائنگ روم میں موجود تھی لیکن وہ کھانے میں شریک نہ ہوئی۔ ایک طرف بیٹھی باتیں کرتی رہی۔ اس کی طبیعت خود بخود ٹھیک ہو چکی تھی اور وہ بڑی ہشاش بشاش نظر آتی تھی۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ہم سب تاش کھیلنے بیٹھ گئے۔ والد نے زیادہ دلچسپی نہ لی۔ چند بازیاں کھیلنے کے بعد انہوں نے تاش ایک طرف ڈال دی اور اچانک کارمیلا سے مخاطب ہوئے۔

"تمہاری والدہ کی طرف سے ابھی تک کوئی خبر یا پیغام موصول نہیں ہوا۔ تم جانتی ہو اسے کس پتے پر خط لکھا جاسکتا ہے؟"

"جی نہیں۔" کارمیلا نے سر جھکائے جواب دیا۔ "میں کچھ نہیں بتا سکتی۔" پھر قدرے توقف کے بعد دوبارہ بولی۔ "میں آپ سے اجازت چاہوں گی۔ میری وجہ سے آپ کو خواہ مخواہ زحمت اٹھانا پڑی۔ آپ کا مشفقانہ اور ہمدردانہ سلوک اور مہمان نوازی مجھے عمر بھر یاد رہے گی۔ میرا ارادہ ہے صبح سویرے پہلی گھوڑا گاڑی مل بیٹھ کر یہاں سے نکل جاؤں۔ مجھے یقین ہے' میں جلد ہی کسی نہ کسی طرح والدہ تک پہنچ جاؤں گی' لیکن کیسے؟ اس کا جواب سردست نہیں دے سکتی"۔

"پگلی کہیں کی۔" والد نے پیار سے ڈانٹا اور نہایت مشفقانہ لہجے میں بولے۔ "اس طرح کا خیال بھی دل میں نہ لانا۔ جب تک تمہاری والدہ خود نہ آجائے اس کا کوئی پیغام نہ ملے میں تمہیں اکیلے دربدر بھٹکنے کی اجازت نہ دوں گا۔ تمہاری والدہ تمہیں میرے سپرد کر گئی ہے۔ اس کا کوئی پیغام آجاتا' تو مجھے خوشی ہوتی۔ گردو نواح میں پھیلی ہوئی پراسرار وبا روز بروز تشویشناک صورت اختیار کرتی جارہی ہے۔ ڈرتا ہوں' تمہیں کچھ ہوگیا' تو میں تمہاری والدہ کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گا۔ بیماری کے خطرے کے پیش نظر میں تمہیں یہاں سے کہیں جانے کی اجازت بھی نہیں دے سکتا"۔

والد کا جواب سن کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میری دلی خواہش تھی کارمیلا ابھی یہیں قیام کرے۔ کارمیلا نے چند مناسب الفاظ میں والد کی اس نوازش اور مہربانی کا شکریہ ادا کیا اور اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چل پڑی۔ میں حسب معمول اسے چھوڑنے کمرے تک گئی۔

کمرے میں پہنچ کر ہم بستر پر بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ میں نے قدرے شاکیت آمیز لہجے میں کہا۔ "تمہیں مجھ سے ہرگز سچی محبت نہیں' ورنہ اب تک ضرور مجھے اپنا راز دار بنا چکی ہوتیں۔ کیا مجھ پر بھروسہ نہیں؟"

کارمیلا پہلے تو کچھ نہ بولی۔ شوخ نظروں سے دیکھتی مسکراتی رہی۔ پھر کہنے لگی۔ "میری اچھی بہن' یہ بات نہیں۔ تم مجھے بے حد عزیز ہو۔ تم سے زیادہ اور کون میرا راز دار بن سکتا تھا۔ مجبوری یہ ہے' میں قول دے چکی ہوں۔ میں اپنا راز ابھی کسی پر ظاہر نہیں کر سکتی۔ تم پر بھی نہیں! تاہم وہ وقت زیادہ دور نہیں جب تمہیں سب کچھ خبر ہو جائے گی"۔

گفتگو کے دوران میں اس کی تیز اور چمکتی نظریں برابر میرے چہرے پر جمی رہیں' میں کمرے میں جدھر جاتی اس کی نظریں میرا پیچھا کرتیں۔ اس کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز اور پراسرار مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ میں کوشش کے باوجود اس کا کوئی معنی نہ پہنا سکی لیکن نہ جانے کیوں میرا جی گھبرانے لگا اور اس کی باتوں سے

وحشت ہونے لگی' چنانچہ فوراً" شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں آگئی۔

مجھے اکثر حیرت ہوتی کارمیلا کس وقت عبادت کرتی ہے۔ میں نے اسے کبھی خدا کا نام لیتے یا اس کے حضور جھکتے نہ دیکھا۔ صبح دن چڑھے بیدار ہوتی اور شام کو جب بالائی منزل کے ایک کمرے میں عبادت کے لیے اکٹھے ہوتے' وہ بدستور ڈرائنگ روم میں بیٹھی رہتی۔ مذہب کے موضوع پر ہم میں کبھی گفتگو نہ ہوئی۔ ایک دن اس کے منہ سے اتفاقاً" کرائسٹ کا ذکر نہ سنتی تو یہی سمجھتی وہ عیسائی نہیں کسی اور مذہب کی پیروکار ہے۔

اعصابی مریضوں کی احتیاط پسندی' متعدی امراض کی طرح غیر محسوس طور پر پھیلتی ہے۔ کارمیلا کی طرح میرے ذہن میں بھی یہ خیال راسخ ہوگیا کہ آدھی رات کے وقت چوروں اور نقب زنوں کا خطرہ ہوتا ہے! چنانچہ لیٹنے سے پہلے ہمیشہ سب دروازے' اور کھڑکیاں مضبوطی سے بند کر دیتی۔ رات بھر ایک شمع میرے سرہانے جلتی رہتی۔ یہ میری بچپن کی عادت تھی اور اسے ترک کرتے ہوئے مجھے خوف آتا تھا۔ حفاظتی تدابیر اختیار کرنے کے بعد کسی قدر اطمینان ہو جاتا اور میں مزے سے بستر پر لیٹ جاتی' لیکن ان تدبیروں سے بھلا خوابوں کو کب زنجیریں پہنائی جاسکتی ہیں جو موٹی پتھریلی دیواروں میں سے گزر کر بھیانک جلوے دکھاتے ہیں۔ اس رات میں نے جو ہیبت ناک خواب دیکھا وہ آنے والے دنوں میں کرب واذیت کے ایک طویل سلسلے کی پہلی کڑی تھی۔

میں اسے بھیانک خواب نہیں کہہ سکتی کیونکہ نیند میں ہونے کے باوجود میرا شعور پوری طرح بیدار تھا اور مجھے محسوس ہورہا تھا کہ میں کمرے میں بستر پر دراز ہوں کمرے کی ہر شے اپنی اپنی جگہ پر موجود تھی۔ صرف اتنی تبدیلی ضرور ہوئی تھی کہ روشنی کے بجائے میرے چاروں طرف گہری تاریکی مسلط تھی۔ دفعتہ" محسوس ہوا جیسے پائنتی کی طرف کوئی جاندار شے حرکت کر رہی ہے۔ تھوڑی دیر تک محض ایک ہیولہ سا دکھائی دیتا رہا' پھر آہستہ آہستہ آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوگئیں تو ایک کالا بھجنگ جسیم اور قدآور جانور

نظر آیا۔ اس کی شکل خونخوار جنگلی بلے سے مشابہہ تھی۔ وہ باربار غراتا اور بے چینی سے کمرے میں چکر کاٹ رہا تھا۔ فرطِ خوف سے مجھ پر سکتہ طاری ہوگیا۔ چیخنا چاہا' مگر منہ سے ذرا آواز نہ نکلی۔

جنگلی بلے کی غراہٹ لحہ بہ لحہ بلند سے بلند تر ہوتی جارہی تھی۔ اس کی بے چینی میں اضافہ ہوگیا۔ اس نے تیزی سے کمرے میں چکر لگانے شروع کر دیے۔

جلد ہی کمرے میں پھیلا ہوا اندھیرا گہرا ہونے لگا اور اس نے کمرے کی ہرشے نگل لی' لیکن جنگلی بلے کی دہکتی ہوئی آنکھوں کی روشنی معدوم نہ ہوئی۔ اچانک اس نے چھلانگ لگائی اور پلنگ پر چڑھ آیا۔ بڑی بڑی سرخ انگارہ آنکھیں آہستہ آہستہ میرے چہرے پر جھکنے لگیں۔ اگلے ہی لمحے مجھے اپنے سینے میں شدید چبھن محسوس ہوئی جیسے کسی نے دولمبی' تیز اور نوکیلی سوئیاں جسم میں گھونپ دی ہوں۔ درد کی شدت سے بے اختیار چیخ نکل گئی اور میں تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔

کمرے میں شمع کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس روشنی میں نیا منظر دیکھا۔ پائنتی کی طرف ایک عورت کا ہیولیٰ سا دکھائی دیا۔ سر سے پاؤں تک لمبے ڈھیلے ڈھالے سیاہ لبادے میں لپٹی ہوئی۔ اس کے لمبے سیاہ بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ عورت پتھر کا بت بنی بے حس وحرکت کھڑی تھی سانس لینے کی ہلکی سی آواز سنائی نہ دیتی۔ میں اسے ٹکٹکی باندھے گھورتی رہی لیکن خوف کے مارے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی۔ اچانک وہ دروازے کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ پھر دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی۔

پراسرار عورت کے باہر نکلتے ہی جیسے ایکا ایکی میرے سینے پر سے کوئی بھاری بوجھ ہٹ گیا اور میں پوری طرح بیدار ہوگئی۔ ہوش میں آنے کے بعد سب سے پہلے مجھے کارمیلا یاد آئی۔ میں نے سوچا ضرور اس کی کوئی شرارت تھی۔ رات دروازے کی چٹخنی کھلی رہ گئی اور اسے اندر آنے کا موقع مل گیا۔

بستر سے کود کر دروازے کے پاس پہنچی تو حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اور سارا کمرہ تیزی سے گھومتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ دروازہ اندر سے بدستور مقفل

مارے ڈر کے اسے چھونے یا کھولنے کی جرات نہ ہوئی چند ثانیے بت بنی کی طرح آنکھیں پھاڑے' تالے کو گھورتی ہوئی' پھر جھرجھری سی لے کر طرح دوڑی اور منہ' سرچادر میں لپیٹ کر دبک گئی۔ صبح ہونے تک یونہی کی طرح بے سدھ پڑی رہی۔

خوف کا یہ تجربہ میرے لیے بالکل انوکھا تھا۔ اسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن ۔ بھیانک اور ڈراؤنے خوابوں کا اثر اور احساس کچھ وقت گزرنے کے بعد زائل ہو جاتا ہے لیکن رات کے ڈراؤنے واقعے نے میرے قلب و ذہن طرح جھنجھوڑ ڈالا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی شدت کم تو کیا کچھ اور بڑھ گئی اور جلد ہی میری یہ کیفیت ہوگئی کہ دن کے وقت بھی تنہائی خوف آنے لگا۔ ایک منٹ بھی تنہا نہ بیٹھ سکتی۔

اب سوچتی ہوں مجھے سارا واقعہ والد کے گوش گذار کر دینا چاہیئے تھا' لیکن وجوہ سے ہمت نہ پڑی۔ اول تو اندیشہ تھا وہ میری کہانی سنتے ہی میرا مضحکہ نے کی کوشش کریں گے' پھر اس بات کا امکان بھی تھا کہ وہ مجھے پُر اسرار وبا کا کچھ بیٹھتے اور خواہ مخواہ پریشان ہوتے۔ پچھلے چند دنوں سے وہ ہر وقت کچھ ئے کھوئے سے نظر آتے تھے۔ ایسے میں اپنا قصہ سناکر میں انہیں مزید پریشان نا چاہتی تھی' چنانچہ مجبوراً" خاموشی اختیار کرلی۔

مادام پیری ڈون اور لافونٹن بھی کئی دن تک اصل واقعے سے بے خبر رہیں۔ کا خیال تھا مجھ پر افسردگی کا دورہ پڑا ہے اور کسی اعصابی مرض میں مبتلا ہوگئی ۔ دونوں مجھے خوش رکھنے کے لئے طرح طرح کے جتن کرتیں' لیکن بے میری دہشت کم نہ ہونی تھی نہ ہوئی۔

ایک دن باتوں ہی باتوں میں میں نے انہیں دل کے بوجھ کی حقیقت سے آگاہ دونوں کا ردعمل مختلف تھا۔ مادام لافونٹن نے میری بات سنتے ہی زوردار لگایا اور بولی۔ "تم نے ضرور پھر کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔ میری بچی! بھول جاؤ' سب وہم کی کارستانی ہے"۔

بات ختم کرنے کے بعد مادام لافونٹن نے ایک اور قہقہہ لگایا' لیکن ان قہقہوں میں کوئی جان نہ تھی' مادام کی آواز اور لہجہ اس کے دلی اضطراب اور تشویش کی چغلی کھا رہا تھا۔

مادام پیری ڈون' منہ سے کچھ نہ بولی اور خاموش اپنے ہونٹ چباتی کچھ سوچتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد مادام لافونٹن نے مسکراتے ہوئے انکشاف کیا۔ کارمیلا کے کمرے کی کھڑکی کے نیچے جولیموں کا درخت ہے وہ آسیب زدہ ہے۔ مادٹن گوالے نے کئی مرتبہ صبح منہ اندھیرے اس مقام پر ایک پراسرار عورت کو ٹہلتے دیکھا ہے"۔

مادام پیری ڈون' چپ چاپ باتیں سنتی رہی' آخر نہ رہ سکی۔ مادام لافونٹن کو ڈانٹتے ہوئے بولی۔ "مارٹن کی بکواس لارا کو سنانے سے کیا فائدہ؟ فضول اور ڈرے گی"۔

مادام لافونٹن خاموش ہوکر باہر جانے لگی' تو مادام پیری ڈون نے پکار کر کہا۔ "کارمیلا سے آسیب زدہ درخت کا ذکر نہ کرنا۔ اس کے کمرے سے وہ درخت نظر آتا ہے۔ کارمیلا' لارا سے بھی زیادہ ڈرپوک ہے' خواہ مخواہ ڈر جائے گی"۔

اتنے برس بعد مجھے ٹھیک یاد نہیں کہ بھیانک خواب کی دہشت سے کس طرح نجات ملی' تاہم اتنی بات یقینی ہے' کچھ عرصے بعد میں اپنے کمرے میں پھر تنہا سونے لگی۔ ایک دن کارمیلا کی نظر اتفاقاً" چینی کے ایک گلدان پر پڑ گئی۔ اس میں جنگلی لہسن کے پھولوں کا ہار پڑا تھا جو شعبدے باز نے مجھے بطور تحفہ دیا تھا اور میں اسے گلدان میں رکھ کر بھول گئی تھی۔ کارمیلا نے اسے میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لارا.... یہ ہار لے لو۔ رات سوتے وقت اپنے سرہانے رکھ لیا کرو۔ کہتے ہیں اس کے ہوتے ہوئے ڈراؤنے خواب نظر نہیں آتے اور نہ کوئی روگ لگتا ہے۔ بدروحیں اس کی بو سے نفرت کرتی ہیں اور یہ جس کے پاس ہو اس کے نزدیک بھی نہیں پھٹکتیں۔ میرے پاس بھی اس طرح کا ایک ہار ہے۔ میں اسے ہمیشہ اپنے سرہانے رکھ کر سوتی ہوں۔ خوب گہری نیند آتی ہے"۔

کارمیلا کی سنجیدگی نے میرے دل میں اس ہار کے لیے عقیدت سی پیدا کر میں نے ہاتھ بڑھا کر ہار لے لیا۔ رات اسے اپنے تکیے کے نیچے رکھ کر بستر پر لیٹتے ہی غنودگی چھا گئی اور میں خلاف معمول صبح تک مزے سے گہری وتی رہی' لیکن حیرت انگیز بات ہے۔ صبح بیدار ہوئی تو سارا جسم ٹوٹ رہا تھا یک بے نام سی تھکن اور کسل مندی طاری تھی' حالانکہ نیند بھرکے سونے کا وشگوار ہونا چاہئے تھا۔ وہ سارا دن عجیب بے مزگی اور اداسی میں گزرا۔

اگلی رات بھی خوب گہری نیند آئی' لیکن صبح طبیعت اسی طرح بھاری تھی۔ کے پھولوں کا ہار اپنے پاس رکھنے سے واقعی خوب نیند آتی تھی' مگر یہ بات کوئی روگ نہیں لگتا' بالکل غلط تھی۔ راتوں کو مزے سے گہری نیند سونے کے د میرا جسم روز بروز گھلتا جارہا تھا اور نقاہت و درماندگی بڑھتی جاتی تھی۔ چند ں میں میری شخصیت ہی بدل کر رہ گئی۔ میں خود کو ایک بدلی بدلی سی اجنبی لڑکی س کرنے لگی اور یہ احساس طاری رہنے لگا کہ آہستہ آہستہ موت کے منہ میں ہی ہوں۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس طرح کے بھیانک خیال سے ڈرنا آنے کی بجائے مجھے ایک عجیب سی طمانیت اور سرخوشی کا احساس ہوتا۔

والد ابھی تک میری اس پراسرار بیماری سے بے خبر تھے۔ ایک دن آمنا سامنا وا' تو میری ہلدی کی طرح زرد رنگت اور اندر دھنسی ہوئی آنکھیں دیکھ کر ٹھک گئے اور بولے۔ "تمہیں بخار تو نہیں آتا؟"

میں نے کہا۔ "نہیں' میں بالکل ٹھیک ہوں' مجھے کوئی تکلیف نہیں"۔

وہ مطمئن ہوگئے اور میں ان کا سامنا کرنے سے کترانے لگی۔ میرا جواب یک لحاظ سے درست بھی تھا۔ مجھے کبھی درد کی شکایت ہوئی' نہ جسمانی عارضہ ق ہوا' پھر میں کیونکر کسی بیماری یا تکلیف کی شکایت کرتی؟ میرا روگ جسمانی ں روحانی تھا۔

اس روگ میں مبتلا ہوئے مجھے تین ہفتے ہورہے تھے' لیکن میری ضدی بیت والد کو کچھ بتانے پر آمادہ نہ ہوئی۔ میں سچ مچ اپنے برے بھلے کی تمیز

کھو بیٹھی تھی۔ لگتا تھا کسی غیر مرئی قوت کے زیر اثر میری سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں کند اور مفلوج ہو کر گئی ہیں۔ کارمیلا بھی روز ڈراؤنے اور پریشان کن خوابوں کی شکایت کرتی۔ حیرت انگیز بات یہ تھی۔ میں رات جو ڈراؤنا خواب دیکھتی، صبح کارمیلا ہو بہو ویسا ہی اپنا خواب سنانے لگتی۔ کاش! میری عقل پر پتھر نہ پڑتے، تو میری تباہی اور بربادی کا اسی وقت علاج ہو جاتا۔

اب میں اپنے ایک ایسے ڈراؤنے اور بھیانک خواب کا تذکرہ کرنے چلی ہوں، جو ایک بالکل نئی اور حیرت انگیز "دریافت" کا سبب بنا۔

ایک رات سوتے میں اچانک میرے کانوں میں آواز آئی۔ "تمہاری ماں کہتی ہے اپنے قاتل سے ہوشیار رہو۔" عین اسی لمحے کمرے میں روشنی کا ایک کوندا لپکا اور میں نے دیکھا کارمیلا، میری پائنتی کھڑی ہے۔ اس نے شب خوابی کا سفید لبادہ پہن رکھا ہے اور ٹھوڑی سے لے کر پاؤں تک خون میں نہائی ہوئی ہے۔ یہ منظر دیکھ کر میں پوری قوت سے چیخ اٹھی۔ میرے ذہن میں یہ خیال سمایا ہوا تھا کارمیلا بے چاری کو کسی نے قتل کر ڈالا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے بستر سے کود کر میں دروازے کی طرف لپکی، تیزی سے چٹخنی کھولی اور مدد مدد چلاتی ہوئی راہداری میں پہنچ گئی۔

میری چیخ پکار سن کر مادام پیری ڈون اور مادام لافونٹن بھی گھبرا کر ننگے پاؤں، ننگے سر اپنے کمروں سے نکل آئیں۔ میں بری طرح خوفزدہ تھی۔ انہیں سامنے پاکر کسی قدر حوصلہ ہوا، پھر رک رک کر ٹوٹتے ہوئے الفاظ میں واقعہ سنایا۔

مادام پیری ڈون بولی۔ "جلدی کرو، نجانے بے چاری پر کیا گزری ہے"۔

یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتی کارمیلا کے کمرے کی طرف بڑھی۔ مادام لافونٹن اور میں بھی اس کے پیچھے لپکی۔ دروازے پر پہنچ کر مادام پیری ڈون نے دستک دیتے ہوئے کارمیلا کو آواز دی۔ "کارمیلا کارمیلا دروازہ کھولو"۔

اندر سے کوئی جواب نہ ملا تو میں نے اپنی پوری قوت سے دروازہ کھٹکھٹایا، مگر خاموشی کا طلسم نہ ٹوٹا۔ چند لمحے ہم منتظر رہے، پھر تینوں نے ایک ساتھ دھڑ دھڑ کواڑ پیٹنے اور گلا پھاڑ پھاڑ کر آوازیں دینا شروع کر دیں۔ وہ قیامت کا شور بپا ہوا کہ مردے بھی اٹھ کر بیٹھ جاتے مگر وہاں جواب میں ایک خاموشی تھی۔ ہمیں دروازہ کوٹتے اور چلاتے خاصی دیر ہوگئی اور کسی نے دروازہ نہ کھولا، تو ہم گھبرا گئے اور مجھے سو فیصد یقین ہوگیا، کارمیلا قتل کر دی گئی ہے۔

والد قلعے کے دوسرے حصے میں سوتے تھے۔ ان تک شور کی آوازیں نہ پہنچ سکتی تھیں۔ انہیں مطلع کرنے کے لیے ہمیں خود وہاں جانا پڑتا، لیکن رات کے اس پہر ہمت نہ پڑی۔ آخر آپس میں صلاح مشورہ کرکے طے کیا کہ انہیں زحمت دینے کی بجائے قلعے کے ملازموں کو طلب کیا جائے اور وہ دروازے کا تالا توڑ دیں۔ کارمیلا کے کمرے میں داخل ہونے کے لئے اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ واپس اپنے کمرے میں پہنچ کر رسی سے بندھی ہوئی گھنٹی بجائی جس کی آواز رات کے سناٹے کو چیرتی ہوئی گونجی۔

چند ثانیے کے اندر اندر تین چار ملازم آنکھیں ملتے ہوئے آن موجود ہوئے۔ تالے کو ہاتھ لگانے سے پہلے ہم نے ایک مرتبہ پھر زور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا اور آوازیں دیں، لیکن اس بار بھی کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ آخر میں نے ملازموں کو تالا توڑنے کا حکم دیا۔ انہوں نے چند منٹ میں اسے توڑ کر پرے پھینک دیا۔

ملازموں کو اندر ساتھ لے جانا مناسب نہ تھا۔ جانے کارمیلا کس حال میں ہوتی۔ ہم نے انہیں باہر ہی سے چلتا کیا اور خود شمع لے کر آگے بڑھے۔ اندر تاریکی تھی۔ دہلیز پر رک کر پھر دو تین آوازیں دیں "کارمیلا کارمیلا۔" مگر صدائے برنخاست ہماری آوازیں فضا میں تحلیل ہو کر رہ گئیں۔ شمع کی روشنی میں آگے بڑھتے ہوئے کمرے کے وسط میں جا کھڑے ہوئے۔ کسی افراتفری یا تشدد کے کہیں کوئی آثار نہ تھے۔ کمرے کی ہر شے جوں کی توں اپنی جگہ پر تھی بالکل ویسے ہی جیسے شام کے وقت میں نے دیکھی تھی۔ دل کو قدرے اطمینان ہوا کہ کارمیلا زندہ ہے، قتل نہیں ہوئی، مگر وہ چلی کہاں گئی؟

کارمیلا کا کمرے میں کہیں نام و نشان نہ تھا۔ مادام پیری ڈون کا کہنا تھا، دروازے پر شور اور ہنگامے کی آوازیں سن کر کارمیلا ڈر گئی ہے اور کسی الماری، صوفے، میز، پردوں کے پیچھے یا غسل خانے میں چھپی ہوئی ہے لیکن اس کا خیال غلط نکلا۔ ہم نے کمرے کا ایک ایک گوشہ چھان مارا۔ مختصر وقفوں سے بار بار اس کا نام لے کر آوازیں دیں۔ غسل خانہ بھی خوب اچھی طرح دیکھا بھالا، لیکن کارمیلا کی صورت کہیں نظر نہ آئی۔ میں روہانسی ہوگئی اور اسے اپنی دوستی کا واسطہ دیتے ہوئے گڑگڑائی۔ "کارمیلا پیاری کارمیلا۔ یہ آنکھ مچولی ختم کرو۔ ہم تمہیں نہیں ڈھونڈ سکتے۔ کہاں چھپ گئی ہو باہر نکل آؤ۔" اندر کوئی ہوتا تو جواب ملتا۔

کمرے کی ساری کھڑکیاں اندر سے بند تھیں اور ان میں چٹخنیاں لگی ہوئی تھیں۔ روشندان خاصے اونچے تھے اور ان تک کارمیلا کی رسائی کسی طرح ممکن نہ تھی۔ بہت دماغ لڑایا، کچھ سمجھ نہ آیا۔ آخر یہ معمہ کیا ہے؟ کارمیلا کہاں غائب ہوگئی؟ پھر خیال آیا اسے کسی پرانی خفیہ سرنگ کا سراغ تو نہیں مل گیا؟ میں نے والد سے سن رکھا تھا قلعے میں بہت سی خفیہ سرنگیں ہیں لیکن ان کی نشاندہی یا محل وقوع معلوم کرنا ممکن نہیں اور وہ عرصے سے بند پڑی ہیں۔

آدھی رات کے وقت جب کارمیلا کے ملنے کی ساری امیدیں دم توڑ گئیں تو ہم تھک کر چور ہوگئے تو میں مادام پیری ڈون کے ساتھ اس کے کمرے میں چلی آئی اور باقی ماندہ رات وہیں بسر کی۔

صبح بھی کارمیلا کہیں نظر نہ آئی۔ چاروں طرف ڈھنڈیا پڑ گئی۔ والد نوکروں کی ایک جماعت لے کر اسے گردونواح کے علاقے میں تلاش کرنے نکل کھڑے ہوئے۔ انہوں نے چپہ چپہ چھان مارا۔ لوگوں سے دریافت کیا۔ قلعے کے قریب بہنے والی ندی کھنگال ڈالی لیکن گمشدہ کا کوئی سراغ نہ پاسکے۔ والد پریشان تھے اور سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہے تھے کارمیلا کی ماں واپس آگئی تو اسے کیا جواب دیں گے۔

صبح اس افراتفری اور پریشانی کی نذر ہوگئی۔ سورج سر پر آپہنچا، لیکن کارمیلا کی گمشدگی کا معمہ حل نہ ہوا۔ ایک بجے کے قریب میں شہلتی ہوئی دوبارہ کارمیلا کے کمرے کے باہر جا نکلی۔ دروازہ کھول کر اندر قدم رکھا تو حیرت سے آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ کارمیلا میرے سامنے سنگھار میز کے پاس کھڑی تھی۔

مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ چند لمحے دہلیز میں حیران اور ششدر کھڑی رہی بے یقینی کے عالم میں گھورتی رہی پھر دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔

"کارمیلا..... اچھی کارمیلا۔ تم ٹھیک تو ہو؟ کہاں چلی گئی تھیں؟ کب اور کیسے واپس آئیں؟ ہم رات سے تمہارے لیے پریشان ہو رہے ہیں....." میں نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

"پچھلی رات بھی عجیب وغریب رات تھی...."

"خدا کے لیے پہیلیاں نہ بجھواؤ کارمیلا۔ تفصیل سے بتاؤ، کیا واقعہ پیش آیا؟"

کارمیلا چند ثانیے خاموش کھڑی کچھ سوچتی رہی پھر بولی۔ "میں خود کسی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا، ماجرا کیا ہے؟ اب تمہیں کیا بتاؤں؟ رات حسب معمول دو بجے سونے کے لئے لیٹی۔ دروازے، کھڑکیاں سب بند تھے رات بڑے سکون اور آرام سے کٹی۔ کسی ڈراؤنے خواب نے پریشان نہ کیا، لیکن حیرت ہے صبح آنکھ کھلی تو میں اپنے بستر کے بجائے ڈریسنگ روم کے بڑے صوفے پر پڑی تھی۔ اٹھ کر دروازے دیکھے تو چٹخنیاں لگی ہوئی تھیں۔ خدا جانے بند دروازوں کے بیچ میں سے گزر کر اندر کیسے پہنچ گئی۔ کسی نے اٹھا کر صوفے پر ڈال دیا ہو۔ یہ بھی ممکن نظر نہیں آتا۔ میری نیند بڑی کچی ہے ہلکی سی آہٹ پر آنکھ کھل جاتی ہے"۔

ہم ابھی باتیں کر رہے تھے کہ والد، مادام پیری ڈون مادام لافونٹین اور نوکروں کی ایک جماعت کے ساتھ آپہنچے۔ آتے ہی سب نے کارمیلا کو گھیرے میں لے لیا اور اس کی خیریت دریافت کرنے لگے۔ کارمیلا کا ایک ہی جواب تھا۔ "میں

رات اپنے بستر پر سوئی تھی' صبح ہوئی' تو خود کو ڈریسنگ روم کے صوفے پر پایا۔ مجھے کچھ خبر نہیں' میں خواب گاہ سے ڈریسنگ روم تک کیسے پہنچی"۔

والد اس کی بات سن کر سوچ میں ڈوب گئے۔ دیر تک سر جھکائے کمرے میں ٹہلتے رہے۔ پھر اچانک سر اٹھایا۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے کارمیلا کے پاس صوفے پر بیٹھ گئے اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بڑی شفقت سے بولے۔ "بیٹی معاف کرنا میرے ذہن میں ایک خیال آیا ہے۔ میں تم سے چند سوال کروں گا شاید اس سے تمہاری گمشدگی کی عقدہ کشائی ہو سکے"۔

"ضرور جو سوال مرضی ہے پوچھئے لیکن میری کہانی بڑی مختصر اور الجھی ہوئی ہے۔ مجھے حقیقتاً کسی بات کی خبر نہیں ....." کارمیلا' ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھے کسی قدر آگے کی طرف جھکی بیٹھی تھی کبھی کبھی کنکھیوں سے والد کی طرف دیکھ لیتی۔ مادام پیری ڈون اور میں دم سادھے ہمہ تن گوش تھیں۔ والد نے کنکھار کر اپنا گلا صاف کیا اور بولے۔ "کیا پہلے بھی کبھی تمہیں نیند میں چلنے کی شکایت لاحق ہوئی؟"

"بہت عرصہ پہلے جب میں چھوٹی سی تھی' لیکن ہوش سنبھالنے کے بعد ایسی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی"۔

"خوب۔" والد نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ "اس کا مطلب ہے تمہیں نیند میں چلنے کا عارضہ لاحق رہا ہے"۔

"جی ہاں' میری بوڑھی نرس بچپن کی باتیں سناتے ہوئے اکثر اس عارضے کا ذکر کرتی تھی"۔

کارمیلا کی بات سن کر والد کے چہرے پر بشاشت کی لہر دوڑ گئی۔ وہ مسکراتے ہوئے صوفے سے اٹھ کھڑے ہوئے اور سہلا کر بولے۔ "عقدہ حل ہو گیا۔ سنو! تمہاری گمشدگی کا واقعہ یقیناً کچھ اس طرح پیش آیا ہے۔ تم نے بستر سے اٹھ کر نیند کے عالم میں دروازہ کھولا۔ اسے باہر سے مقفل کیا اور چابی تالے میں چھوڑنے کے بجائے ساتھ لیتی گئیں۔ پھر قلعے کی نچلی یا بالائی منزل کے کسی کمرے

میں پڑ کر سو رہیں۔ یہاں بیسوں ایک جیسے کمرے ہیں اور ان سب کی اچھی طرح تلاشی لینے کے لیے پورے سات دن درکار ہیں۔ تم میرا مطلب سمجھ رہی ہو نا۔ میں کیا کہنا چاہتا ہوں؟"

"جی ہاں۔" کارمیلا نے ہولے سے اثبات میں سر ہلایا۔

والد کچھ اور کہنا چاہتے تھے کہ میں دوبارہ بول اٹھی۔ "لیکن ابا کارمیلا کے صوفے پر سونے کی توجیہہ کیونکر ہو گی؟ رات صوفہ بالکل خالی تھا اور میں ستانے کے لئے دو بار اس پر بیٹھی اس وقت کارمیلا صوفے پر نہ تھی۔ بعد میں کیسے آ گئی؟"

"صبر لڑکی۔ بتاتا ہوں۔ تم لوگ اسے تلاش کر کے چلے گئے تو کارمیلا نیند میں چلتی ہوئی دوبارہ اس کمرے میں آئی اور بجائے بستر پر سونے کے صوفے پر ہی دراز ہو گئی۔ یہ ہے سارا معما"۔

اپنی بات ختم کر کے والد نے زور دار قہقہہ لگایا اور بولے۔ "کیا ہی اچھا ہوتا سارے پراسرار اور الجھے ہوئے واقعات اور گتھیاں اسی طرح چٹکی بجاتے میں سلجھائی جا سکتیں"۔

شام کے وقت مادام لافونٹن نے بتایا وہ آئندہ کارمیلا کے کمرے میں سویا کرے گی تاکہ اس کی نگرانی ہوتی رہے اور وہ نیند کے عالم میں دوبارہ مٹرگشت کرنے اپنے کمرے سے نہ نکل کھڑی ہو۔ والد کی بھی یہی خواہش تھی۔ وہ چاہتے تھے دوبارہ اس طرح کی ناخوشگوار صورت حال پیدا نہ ہو۔ کارمیلا کو پتا چلا تو اس نے بڑی سختی سے تجویز رد کر دی۔ وہ کسی طرح مادام لافونٹن کو اپنے ساتھ کمرے میں سلانے پر رضامند نہ ہوئی' تو والد نے ایک نوکر کی ڈیوٹی لگا دی کہ وہ رات کے وقت کارمیلا کی خواب گاہ کے باہر' دروازے کے ساتھ اپنی چارپائی بچھا کر سویا کرے۔

☆ ☆ ☆

میری صحت روز بروز گرتی جا رہی تھی۔ بظاہر کوئی بیماری یا تکلیف نہ تھی

اس کے باوجود میں خود کو ہمیشہ ہمیشہ تھکی تھکی سی اور نڈھال محسوس کرتی۔ چہ
اور ہاتھ پاؤں کی رنگت ہلدی کی طرح زرد پڑتی جارہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا
نے جسم سے سارا خون نچوڑلیا ہے۔ میری ضد اور ہٹ دھرمی ملاحظہ ہو
صحت کے باوجود والد سے کبھی اس کا تذکرہ نہ کیا۔ میں ڈرتی تھی۔ انہیں خبر
تو ڈاکٹروں اور دواؤں کا ایک لمبا چکر شروع ہو جائے گا۔ جس سے مجھے
نفرت ہے' مگر والد کی تیز اور عقابی نظروں سے میری کیفیت زیادہ دنوں تک
نہ رہ سکی۔ ایک دن جب میرے وہم گمان میں بھی نہ تھا انہوں نے بوڑھے
کو بلوا بھیجا۔ وہ اگلے دن صبح سویرے آپہنچا۔

مادام پیری ڈون کو ساتھ لے کر میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو
بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بڑی شفقت سے بولا۔ "آؤ لارا بیٹی
ہے تمہاری طبیعت کچھ خراب رہتی ہے۔ میں ایک طرف بیٹھ گئی اور ا
تفصیل سے اپنا حال سنایا۔ میرا بیان سننے کے بعد اس کے چہرے پر پھیلی
سنجیدگی کچھ اور گہری ہوگئی وہ کرسی سے اٹھا اور ٹہلنے لگا۔ اس کی عینک کے شیشے
کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی بڑی بڑی روشن آنکھوں میں تشویش و اضطراب
بھیانک سائے لہرا رہے تھے۔ وہ منہ سے کچھ نہ بولا اور میں بھی خاموش بیٹھی
کی حرکات کا جائزہ لیتی رہی۔

پھر وہ ٹہلتے ٹہلتے رکا اور مادام پیری ڈون سے کہا وہ میرے والد کو بلا لا
والد اپنے کمرے میں تھے' ڈاکٹر کا پیغام ملتے ہی فوراً پہنچ گئے۔ انہوں
مسکراتے ہوئے دروازے میں قدم رکھا اور زور سے پکارے۔ "ہیلو ڈاکٹر!"

ڈاکٹر سنجیدہ اور خاموش رہا۔ والد حیرت سے اس کا منہ تکنے لگے۔ ان
آف ہو گیا تھا۔ ساری بشاشت اور شگفتگی جاتی رہی۔ چند منٹ بعد ڈاکٹر نے
ہاتھ پکڑا اور انہیں ڈرائنگ روم کے دوسرے کونے میں لے گیا' پھر
باتیں چھڑ گئیں۔ وہ نہایت مدہم آواز میں گفتگو کر رہے تھے۔ مادام پیری ڈ
میں کوشش کے باوجود ایک لفظ بھی نہ سن سکے۔

اچانک والد نے بلند آواز سے پکارا۔ "لارا بیٹی..... ذرا ادھر آنا۔" بے اختیار میرے دل کی دھڑکن تیز ہوئی اور رگ و پے میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔ نجانے ڈاکٹر کیا فیصلہ سنانے والا ہے۔

آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ان کے پاس پہنچی۔ والد نے ہاتھ بڑھا کر میرا بازو تھام لیا اور کھینچ کر مجھے اپنے قریب کرلیا۔ ان کی نظریں ڈاکٹر کے چہرے پر جمی تھیں اور وہ تشویش بھرے لہجے میں کہہ رہے تھے۔ عجیب بات ہے۔ میری تو عقل کام نہیں کرتی کیا جواب دوں۔ پھر انہوں نے اپنا چہرہ میری طرف گھمایا اور آہستگی سے بولے۔ "بیٹی! ڈاکٹر تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہے' اچھی طرح یاد کر کے ٹھیک ٹھیک جواب دینا"۔

میں نے اثبات میں سرہلایا اور ڈاکٹر کی طرف متوجہ ہوگئی۔ اس نے پوچھا۔ "پہلی مرتبہ جب تم نے ڈراؤنا خواب دیکھا اور گردن پر دو سوئیاں سی چبھتی ہوئی محسوس کی تھیں کیا اس جگہ اب بھی درد ہے؟"

"جی نہیں"۔

"اچھا انگلی رکھ کر اپنے والد کو وہ مقام بتاؤ جہاں درد اور چبھن محسوس ہوئی تھی"۔

"گلے سے ذرا نیچے ...یہاں.... ٹھیک اس جگہ...." میں نے ٹٹولتے ہوئے گردن پر ایک جگہ انگلی رکھ دی۔

گردن کا یہ حصہ قمیص کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ والد نے میرا کالر ذرا نیچے سرکایا اور گردن پر نظر ڈالی' لیکن اگلے ہی لمحے یوں تڑپ کر پیچھے ہٹے جیسے کسی بچھو نے اچانک ڈنگ مار دیا ہو۔ ان کی یہ کیفیت صرف چند ثانیئے قائم رہی۔ جلد ہی انہوں نے اپنے آپ پر قابو پا لیا اور کسی قدر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے "خدا رحم کرے! تم ٹھیک کہہ رہے تھے' ڈاکٹر.... اب کیا ہوگا؟"

ڈاکٹر کے جواب دینے سے پہلے میں فرط خوف سے ایک سایہ نشان بن گئی۔

"ابا بتایئے نا' میری گردن پر کیا ہے؟"

والد خاموش رہے۔ ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر میرا کندھا تھپتھپایا اور بڑی شفقت سے کہا۔ "ارے، کچھ نہیں بیٹی، ایک چھوٹا سا نیلگوں نشان ہے۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گی۔" پھر اس نے مادام پیری ڈون کو قریب بلاتے ہوئے ہدایت کی کہ لارا کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ اس کی دیکھ بھال کے لیے ضروری ہدایات بعد میں دوں گا۔ اس وقت یہ ذہن نشین کر لو کہ دن رات کے کسی لمحے لارا کو تنہا نہیں چھوڑنا ہے۔ تمہیں ہر وقت سائے کی طرح اس کے ساتھ رہنا ہوگا۔

"مادام کی محبت اور شفقت سے مجھے پوری امید ہے وہ ہمیں مایوس نہ کرے گی"۔ والد نے بات آگے بڑھائی اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ "لارا بیٹی تم بھی ڈاکٹر کی اس ہدایت پر سختی سے عمل کرتے ہوئے مادام کو ہر وقت اپنے ساتھ رکھنا"۔

یہ کہہ کر وہ ڈاکٹر کے ساتھ آہستہ آہستہ باتیں کرتے باہر کی طرف چل دیئے۔ میں نے سنا وہ کہہ رہے تھے "تمہیں ایک اور مریض بھی دکھانا تھا۔ اس کی بھی بالکل یہی کیفیت ہے۔ لارا اور وہ دونوں ہم عمر ہیں اور کچھ عرصے سے ہماری مہمان ہے۔ اس وقت تمہیں جانے کی جلدی ہے اور وہ دوپہر سے پہلے بیدار نہیں ہوتی۔ خیر شام کو سہی۔ واپسی پر ادھر آجانا۔ رات کا کھانا اکٹھے کھائیں گے..."

ڈاکٹر نے دعوت قبول کرلی، لیکن وہ شام کو واپس نہ آیا۔

ڈاکٹر کو رخصت کرنے کے بعد والد دیر تک باہر لان میں ٹہلتے رہے۔ اندر آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا، اسے میری طرف پھینکتے ہوئے بولے "جنرل ڈاروف کا خط ہے وہ آج شام یا کل کسی وقت یہاں پہنچ رہا ہے۔"

والد کی آواز بے حد سپاٹ تھی۔ مہمانوں کی آمد پر انہیں ہمیشہ خوشی ہوتی۔ جنرل ڈاروف ان کا گہرا دوست تھا جس کی آمد کی خبر سن کر وہ خوشی سے کھل اٹھتے لیکن اس دن ان کی آواز اور لہجے میں گرم جوشی مفقود تھی۔ چہرے پر پھیلی سنجیدگی ان کے دلی اضطراب کی غماز تھی۔ میں نے ڈاکٹر اور ان کے درمیان

ہونے والی گفتگو کے بارے میں پوچھا تو جھنجلا کر بولے "تنگ نہ کرو بیٹے!"

وہ زندگی میں پہلی بار میرے ساتھ اس قدر رکھائی سے پیش آئے تھے۔ میں بھاری دل کے ساتھ پیچھے ہٹ گئی۔ انہوں نے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات سے میری اندرونی کیفیت بھانپ لی۔ انہوں نے پیار کے سے انداز میں کہا۔ "بیٹی، ذرا صبر سے کام لو، ایک دو روز میں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔" وہ باہر جانے کے لیے مڑے ہی تھے کہ دروازے کے پاس پہنچ کر دوبارہ رکے اور بلند آواز میں بولے۔ "ارے! اصل بات بتانا تو بھول ہی گیا۔ بارہ بجے کارن سٹین جانا ہے۔ فادر ولیم سے ضروری مشورہ کرنا ہے۔ تم بھی تیار رہنا۔ کارمیلا بیدار ہونے کے بعد مادام لافونٹن کے ساتھ بعد میں آجائے گی، پھر سب مل کر وہاں پکنک منائیں گے"۔

☆ ☆ ☆

ٹھیک بارہ بجے گھوڑا گاڑی آگئی اور ہم کارن سٹین کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ راستے میں ایک موڑ پر اچانک جنرل ڈاروف سے مڈبھیڑ ہوگئی جو گھوڑے پر سوار ایک خادم کے ہمراہ قلعے کی طرف آرہا تھا۔ والد نے اسے دیکھ کر بگھی رکوالی اور نیچے اتر کر اس سے بغل گیر ہوئے۔ رسمی علیک سلیک اور مزاج پرسی کے بعد والد نے کہا "تم قلعے میں چل کر آرام کرو، میں ذرا کارن سٹین سے ہو کر آتا ہوں۔"

کارن سٹین کے ذکر پر جنرل کی آنکھیں چمک اٹھیں اور اس نے خاص انداز میں کہا۔ "میں بھی تمہارے ساتھ ہی چلتا ہوں"۔ جنرل گھوڑے سے اتر کر بگھی میں آبیٹھا اور ہم دوبارہ آگے کی طرف روانہ ہوئے۔

جنرل کے چہرے پر کھنڈی ہوئی زردی اور گہری شکنوں سے اس کی ذہنی کشمکش نمایاں تھی۔ برسوں کا مریض نظر آنے لگا تھا، تیز اور چمکیلی آنکھوں کی روشنی مدھم ہوگئی تھی۔ شاید بھتیجی کی موت نے اس کی ساری شادابیاں چھین لی تھیں۔ والد نے مناسب الفاظ میں تعزیت کی۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا، پھر اچانک

سر اٹھایا اور غمزدہ آواز میں کہنے لگا۔ "میں عجیب و غریب افتاد کا شکار ہو چکا ہوں۔ بچی کی پُراسرار بیماری اور موت نے مجھے بہت سی نئی باتیں سکھادی ہیں۔ میں جب تک اس کی جواں موت کا انتقام نہ لے لوں چین سے نہ بیٹھوں گا"۔

"کیسا انتقام؟" والد نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"سب کچھ بیان کرتا ہوں' لیکن پہلے یہ بتاؤں کارن سٹین کا قلعہ کتنی دور ہے؟"

"چھ میل....اب وہاں وحشت ناک کھنڈر کے سوا کچھ نہیں۔ کارن سٹین خاندان کے سارے چشم و چراغ مرکھپ چکے' بستی بھی خالی پڑی ہے....." والد شاید کچھ اور تفصیل بتاتے کہ جنرل نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روک دیا اور بے چین ہوتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے' ٹھیک ہے' کارن سٹین کے بارے میں پہلے ہی بہت کچھ سن چکا ہوں' اس کا اندزہ میری سرگذشت سے ہو جائے گا"۔

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد جنرل نے اپنی دکھ بھری داستان سنانا شروع کی۔ "میری بدقسمتی کا آغاز کاؤنٹ کار فیلڈ کی ضیافت سے ہُوا۔ تمہاری طرح کاؤنٹ بھی میرا گہرا دوست ہے۔ کارن سٹین سے آٹھ دس میل دور اس کی وسیع جاگیر ہے۔ میری بچی اور میں کھانے پر مدعو تھے۔ گردونواح کے تقریباً" سبھی جاگیر دار آئے ہوئے تھے۔ مہمانوں کی تفریح طبع کے لیے رقص و سرود کا معقول انتظام تھا۔ یہ دعوت کے دوسرے دن کا ذکر ہے۔ رات کا کھانا ختم ہُوا اور ہم ہال کمرے میں چلے آئے۔ میری بچی ایک کرسی پر بیٹھ کر نوجوان جوڑوں کے رقص کا تماشا دیکھنے لگی۔ میں اس سے ذراہٹ کر کھڑا ہوگیا اور اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگا شاید کوئی شناسا چہرہ نظر آجائے.....

"معاً" ایک حسین اور خوش پوش خاتون نے میری توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ وہ کارنس کا سہارا لیے ایک طرف تنہا کھڑی تھی۔ اس نے اپنا چہرہ باریک نقاب میں چھپا رکھا تھا۔ میں نے اسے پہچان لیا کہ اس سے دو مرتبہ مڈبھیڑ ہو چکی تھی۔ پہلے دن شام کے کھانے پر وہ ہمارے گرد منڈلاتی رہی اور آج سہ پہر لان میں بھی اس

کا سارا وقت ہمارے تعاقب میں گزرا۔ اس کے ساتھ بڑی عمر کی ایک عورت بھی تھی جو اس نوجوان خاتون کی سرپرست یا اتالیق نظر آتی تھی.....

"میری بچی کو وہ نوجوان خاتون مسلسل گھورے جارہی تھی' مجھے محسوس ہُوا جیسے اس کی آنکھوں میں پُراسرار سی چمک اتر آئی ہے۔ میں نے اسے اپنا واہمہ سمجھا اور مہمانوں میں گھل مل گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے بے خیالی میں کارنس کی طرف دیکھا' نوجوان خاتون کے ساتھ اس کی سرپرست بھی موجود تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے دونوں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی ہماری طرف بڑھیں۔ میں نے منہ پھیرلیا اور کنکھیوں سے دیکھنے لگا۔ میری بچی کے داہنے ہاتھ ایک کرسی خالی پڑی تھی' نوجوان خاتون اس پر براجمان ہوئی' دوسری عورت میرے پیچھے آکھڑی ہوئی۔ میں لاتعلق سا رہا' لیکن اس کے منہ سے اپنا نام سن کر چونک پڑا اور اس کی طرف گھبرا کر دیکھا۔ نقاب میں چھپے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ بڑی تکلفی سے بولی۔ 'ارے جنرل! مجھے نہیں پہچانا؟... بس بھول گئے اپنے وعدوں کا پاس بھی نہ رہا.....'

"اس سے قبل کہ میں کچھ سمجھ پاتا' اس نے تابڑ توڑ حملے شروع کر دیے۔ برسوں پرانی یادوں اور واقعات اور حادثوں کا کچھ یوں تذکرہ چھیڑا کہ میں سراپا حیرت بن گیا۔ اس کے بیان کردہ واقعات ہوبہو درست تھے۔ ذہن پر بہت زور ڈالا' مگر کچھ یاد نہ آیا کہ اس محترمہ سے کب اور کہاں ملاقات ہوئی تھی۔ سوچا زندگی میں کتنے ہی لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے اب بھلا کس کس کے نام اور چہرے یاد رکھے جائیں۔ ہمت کرکے اس سے نام پوچھا' وہ خوبصورتی سے یہ کہہ کر ٹال گئی کہ میں اپنی شخصیت ظاہر نہ کروں گی۔ تم خود یاد کرنے کی کوشش کرو۔۔۔

"اس اثنا میں نوجوان خاتون جس کا نام ملار کا بتایا گیا' میری بچی کے ساتھ گھل مل گئی۔ اس نے اپنا تعارف میرے ایک پرانے شناسا کی اکلوتی بیٹی کی حیثیت سے کرایا۔ میری بچی سادہ لوح تھی' اس کی باتوں میں آگئی اور اس کی شخصیت میں اس طرح جذب ہوگئی جیسے وہ گہری اور پرانی سہیلی ہو------

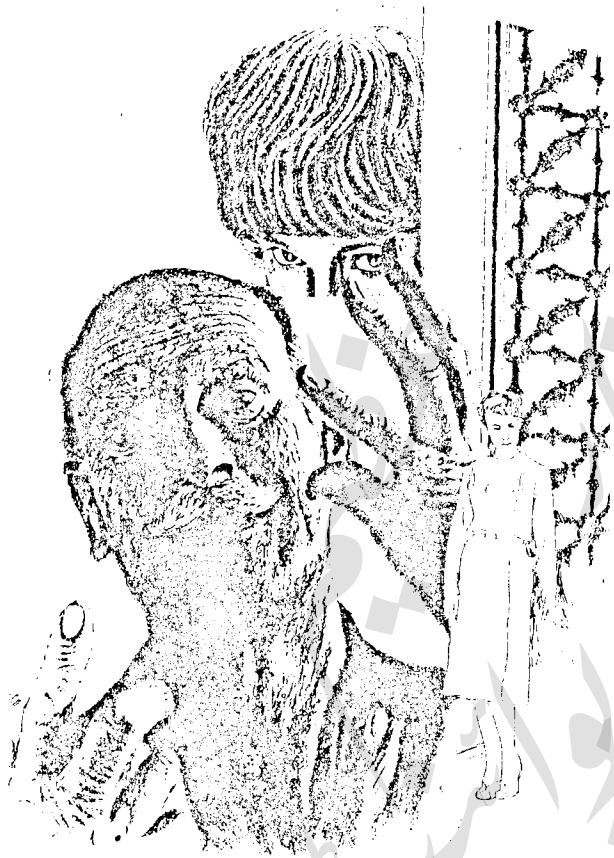

"اُدھر میں اُس ادھیڑ عورت سے باتیں کرتا رہا اور وہ شخصیت کو پُراسرار بناتی رہی۔ اتنے میں ایک خوش وضع آدمی اسے ڈھونڈتا ہُوا آگیا۔ اس نے کالا سوٹ پہن رکھا تھا۔ چہرہ غیر معمولی طور پر زرد جیسے بدن میں خون کی ایک بوند نہ ہو۔ وہ اجنبی عورت کے سامنے آداب بجالایا اور مدہم آواز میں نہایت شائستگی سے بولا۔

'میں چند ضروری باتیں گوش گزار کرنے کی اجازت چاہوں گا'۔۔۔

"اجنبی عورت تیزی سے اس کی طرف لپکی اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا' پھر چہرہ میری طرف پھیرتے ہوئے کہا۔ 'جنرل' میری جگہ رکھنا' فارغ ہوکر ابھی آتی ہوں'۔۔۔

"وہ مسکراتی ہوئی سیاہ پوش نوجوان کے ساتھ مہمانوں کے ہجوم میں غائب ہوگئی۔ اسی کی شخصیت میرے لیے پہلے سے زیادہ پُراسرار بن گئی تھی۔ زندگی کی گزرگاہ پر اس کے نقوش کہیں نظر نہ آئے۔ سوچا ملارکا کی باتیں سنوں' شاید اس کی گفتگو سے کوئی اشارہ مل جائے۔ چلنے کے لیے ایک قدم ہی اٹھایا تھا کہ اجنبی عورت واپس آگئی۔ سیاہ پوش نوجوان اس کے ساتھ تھا۔ قریب پہنچ کر کہنے لگی "بگھی آنے کی مادام کو فوراً اطلاع کردی جائے گی"۔ یہ کہہ کر اس نے تعظیماً گردن کو ہلکا سا خم دیا اور اُلٹے قدموں چلتا ہُوا نظروں سے اوجھل ہوگیا۔۔۔

"آپ کہیں جانے والی ہیں؟" میں نے الجھے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔۔

"ہاں' شاید چند ہفتے ملاقات نہ ہوسکے۔ مجھے آپ کی قیام گاہ کا علم ہے۔ جب بھی موقع ملا' ضرور چکر لگاؤں گی۔ ملارکا چند دن پہلے گھڑسواری کرتے ہوئے گھوڑے پر سے گر پڑی تھی اسے کمر میں شدید چوٹ آئی۔ ابھی تک پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر نے لمبا سفر کرنے سے منع کر رکھا ہے۔ آتے وقت ہم جگہ جگہ پڑاؤ کرتے رہے' اس لیے کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ اب مجھے دن رات سفر کرنا ہوگا۔ کام کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے' زندگی موت کا سوال ہے۔ اس کی تفصیل آپ کو واپسی پر سناؤں گی۔ اس وقت تک ملارکا آپ ہی کے پاس رہے گی۔" پُراسرار عورت جس کا نام کاؤنٹس تھا نے کہا۔۔۔

”اجنبی اور پُراسرار کاؤنٹس کے لہجے میں التجا سے زیادہ حکم کی جھلک تھی۔ میں شش و پنج میں پڑگیا۔۔۔

”عین اسی لمحے میری بچی اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے پاس آئی اور میرا ہاتھ تھام کر بڑی لجاحت سے بولی۔ ”ملارکا کی امی کہہ رہی ہیں‘ تو میری سہیلی کو رکھ لیجئے نا۔ ہم دونوں اکٹھے رہیں گے“۔۔۔

”کوئی اور وقت ہوتا‘ تو میں اسے صبر سے کام لینے کا مشورہ دیتا‘ مگر کاؤنٹس اور بچی نے مجھے کچھ سوچنے کا موقع نہ دیا۔ ان کے پیہم اصرار سے میری قوت مدافعت ٹوٹ گئی۔۔۔

”میری رضا مندی حاصل کرتے ہی کاؤنٹس نے ملارکا کو اپنے قریب بلایا اور اسے سمجھاتے ہوئے کہنے لگی۔ ”میری بچی‘ مجھے اچانک نہایت ضروری کام سے فوراً جانا پڑگیا ہے۔ تمہاری صحت طویل سفر کی اجازت نہیں دیتی۔ میری واپسی تک تم جنرل کے ہاں رہوگی۔ وہ میرے بہترین دوستوں میں سے ہیں۔ ان کے ہاں تمہیں کوئی تکلیف نہ ہوگی“۔۔۔

”ذرا دیر بعد سیاہ پوش خادم نے بگھی کے آنے کی اطلاع دی اور کاؤنٹس ہم سے رخصت ہوکر اس کے ساتھ باہر کی طرف چل دی۔ چلتے چلتے اس نے ملارکا کو بھینچ کر پیار کیا اور اس کے کان میں کچھ کہا‘ پھر میری طرف مڑی اور تقریباً سرگوشی کے سے انداز میں بولی۔ ”جنرل‘ ایک آخری درخواست ہے۔ میری غیر حاضری میں میرے حالات کی ٹوہ لینے کی کوشش نہ کیجئے بعض ناگزیر وجوہ سے میری شخصیت کا ابھی پردۂ راز میں رہنا ضروری ہے۔ کئی لوگ ہمارے درپے آزار ہیں۔میں نے ملارکا کو اچھی طرح سمجھا دیا ہے۔ وہ بھی کسی سے میرے بارے میں کوئی گفتگو نہ کرے گی۔“

ملارکا کی خواہش پر ہم کاؤنٹس کو الوادع کہنے بالکنی میں جاکھڑے ہوئے۔ نیچے پرانی وضع کی خوبصورت بگھی کھڑی تھی اور اس کے پاس تین چاق چوبند نوکر اور محافظ‘ کاؤنٹس کے بیٹھتے ہی بگھی چل دی۔ اس نے ایک مرتبہ بھی سر اٹھا کر ہماری طرف نہ دیکھا۔ شاید اسے بالکنی میں ہماری موجودگی کا احساس نہ ہوسکا۔

بگھی نظروں سے اوجھل ہوئی اور ہم واپس ہال میں آگئے جہاں رقص کا نیا دور شروع ہونے والا تھا۔ لڑکیاں کرسیوں پر بیٹھ گئیں اور میں گھوم پھر کر مہمانوں سے گپ شپ کرنے لگا۔ طلوعِ آفتاب تک ناچ کی محفل جمی رہی۔ اس کے اختتام پر واپس ہال میں آیا۔ دیکھا ملارکا غائب ہے اور میری بچی تنہا بیٹھی اونگھ رہی ہے۔ میں نے کندھا پکڑ کے ہلایا‘ تو ہڑ بڑا کر اُٹھ بیٹھی اور پھر برابر والی کرسی خالی دیکھ کر پوچھا۔ ”ملارکا کہاں ہے؟“

”کیا!“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”تمہیں نہیں معلوم؟“

”جی نہیں....“ میری بچی نے نیند سے بوجھل آنکھیں ملتے ہوئے جواب دیا۔ ”آپ کے جانے کے بعد وہ ڈانس کرنے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے بعد کہیں نظر نہیں آئی۔ میرا خیال تھا آپ کے ساتھ ہوگی‘ اس لیے اطمینان سے بیٹھی اونگھتی رہی۔“

مجھے پہلی مرتبہ شدت کے ساتھ اپنی بے وقوفی کا احساس ہُوا اور اپنے آپ پر رہ رہ کر غصہ آنے لگا‘ پھر ذمہ داری کا احساس غالب آگیا اور میں نے اپنے طور پر اسے تلاش کرنا شروع کر دیا۔ سارا لان اور نچلی منزل کے کمرے چھان مارے مگر بے سود۔ اس بھاگ دوڑ اور افراتفری میں گیارہ بج گئے۔ تھک ہار کر اپنے کمرے میں آرام کرسی پر گرپڑا اور سر پکڑ کر سوچنے لگا۔ اب کیا ہوگا۔

اسی سوچ بچار میں غرق تھا، اچانک دروازے پر دستک ہوئی اور ایک نوکر اندر داخل ہُوا۔ اس نے اطلاع دی ایک نوجوان خاتون جو بے حد پریشان معلوم ہوتی ہے۔ جنرل ڈاروف اور اس کی بھتیجی کے متعلق پوچھتی پھر رہی ہے۔ میں نے نوکر کو اسے فوراً بلا لانے کی ہدایت کی۔

ملارکا نے اپنے غائب ہونے کی سادہ سی کہانی سناتے ہوئے بتایا۔ ”ناچنے کے بعد میں بری طرح تھک گئی۔ چنانچہ ہال سے نکل کر بالائی منزل کی ایک خالی خواب گاہ میں چلی آئی اور وہاں دن چڑھے تک بے سدھ سوتی رہی۔ نوکر کسی کام

سے اندر نہ آتا تو شاید میں اور زیادہ دیر تک سوتی رہتی۔"

ملارکا کو ساتھ لیے ہم اسی دن واپس اپنے گھر آگئے۔ چند روز بعد عجیب و غریب اور پُراسرار واقعات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ سب سے پہلے ملارکا نے غنودگی اور تھکن کی شکایت کی۔اس کا کہنا تھا یہ حالیہ بیماری کا اثر ہے۔ دن چڑھے تک اپنے کمرے میں سوتی اور دوپہر سے پہلے کبھی باہر نہ آتی.......

"چند دن بعد اس کی عادات کے بارے میں کچھ اور باتوں کا انکشاف ہُوا۔ وہ ہمیشہ اندر سے کمرہ مقفل کرکے سونے کی عادی تھی۔ چابی قفل میں لگی رہتی۔ دوپہر سے قبل کوئی نوکر اس کے کمرے میں داخل نہ ہوسکتا۔ ایک دوبار صفائی کرنے والی خادمہ صبح سویرے اس کے کمرے میں گئی تو اس کا بستر خالی پایا۔ وہ غسل خانے میں بھی نہ تھی۔ خادمہ نے کوئی خاص دھیان نہ دیا۔ اس نے سوچا شاید ملارکا صبح کی سیر کرنے گئی ہے۔ شام کے وقت بھی اگر کبھی اس کے کمرے میں جانا پڑتا تو وہ اکثر غائب ہوتی.......

"باورچی نے اسے کئی مرتبہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے صبح صادق کی ملگجی روشنی میں باہر گھومتے دیکھا۔ اس کے دونوں بازو ہمیشہ پہلوؤں کی طرف جسم کے ساتھ چپکے ہوتے اور وہ ناک کی سیدھ میں چلتی ہوئی مشرقی سمت درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو جاتی۔ مجھے اس بات کا علم ہُوا۔ میں نے اندازہ لگایا وہ شاید نیند میں چلنے کی عادی ہے، لیکن معمہ یہ تھا ملارکا مقفل دروازے سے باہر کیسے نکل جاتی ہے۔ مجھے اس پہلو پر زیادہ غور کرنے کا موقع نہ ملا، کیونکہ جلد ہی نئی مصیبت میں گرفتار ہوگیا۔ میری بچی کی صحت غیر متوقع طور پر روز بروز گرنے لگی اور چند دنوں میں سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے۔ اندر ہی اندر کڑھتا رہتا، مگر کچھ بس نہ چلتا تھا۔ کئی ڈاکٹروں سے مشورہ کیا، کوئی اس کے مرض کی تشخیص نہ کرسکا۔ ابتدا میں وہ رات سوتے وقت ڈراؤنے خواب دیکھ کر چونک پڑتی۔ پھر خیالی پیکر بھی نظر آنے لگے جو کبھی ملارکا کے ایسے نظر آتے اور کبھی کسی جنگلی درندے کی صورت میں۔ یہ ہیولے ہمیشہ اسے اپنی پائنتی کی طرف بے قراری سے چکر کاٹتے دکھائی دیتے۔ اسی دوران میں اس پر غشی طاری ہونے لگتی۔ پھر اچانک گلے پر چبھن کا احساس ہوتا جیسے کسی نے دو تیز اور نوکیلی سوئیاں گھونپ دی ہوں۔ درد کی شدت سے تڑپ کر اٹھ بیٹھتی اور چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھالیتی"۔

میں دم سادھے بیٹھی تھی۔ یوں محسوس ہُوا جیسے میں خود اپنی کہانی جنرل کی زبانی سن رہی ہوں۔ ڈراؤنے خواب.....خیالی پیکر.....اور گلے پر سوئیوں کی چبھن.....اتنی حیرت انگیز مماثلت۔

جنرل کی معصوم بھتیجی جس پُراسرار مرض میں مبتلا رہی، اس کی تمام تر علامتیں اور کیفیتیں میرے مرض میں موجود تھیں اور ملارکا کی عادتیں ہو بہو ہماری خوبصورت مہمان کارمیلا کی عادتوں سے مشابہہ تھیں۔ اس حیرت انگیز مماثلت کا انکشاف ہونے کے بعد میرے دلِ ناتواں پر کیا کچھ بیت گئی، وہ میں الفاظ میں بیان نہیں کرسکتی۔ جنرل کی معصوم بھتیجی کے المناک تصور سے بے اختیار بار بار جھرجھری سی آجاتی۔

معاً بگھی ایک دھچکے سے رکی اور میں اپنے خیالوں سے چونک اٹھی۔ ہم منزل مقصود پر آپہنچے تھے۔ سہمی سہمی سی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتی نیچے اتری اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی جنرل اور والد کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ ہم تینوں ہی اپنے اپنے خیال میں گم تھے۔ خاموشی سے فاصلہ طے کرکے کھنڈر کے قریب پہنچے تو جنرل ٹھٹھک کر رک گیا اور ملبے کے ایک ڈھیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "اچھا' یہ ہے کارن سٹین کا قلعہ اور یہاں کے حکمرانوں کی عظیم الشان رہائش گاہ۔ بڑے خبیث اور ظالم تھے وہ لوگ' سفاکی اور درندگی کی داستانیں ان پتھروں میں دفن ہیں۔ میں انہیں نیست و نابود کرکے دم لوں گا...اور.....ہاں سنو' یہ آواز کیسی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کوئی لکڑ ہارا قریب ہی لکڑیاں کاٹ رہا ہے۔ اسے تلاش کرتے ہیں شاید وہ مطلوبہ معلومات بہم پہنچا سکے اور کاؤنٹس آف کارن سٹین مرکالا کے مقبرے تک ہماری رسائی ہوجائے"۔

"گھر میں ہمارے پاس مرکالا کی ایک بڑی اور خوبصورت تصویر ہے' واپسی پر دکھائیں گے۔" والد نے کہا۔

"اچھا!....." جنرل نے ناگواری سے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے میں کاؤنٹس آف کارن سٹین کو اصلی روپ میں دیکھ چکا ہوں۔ خدا کی لعنت ہو اُس پر"۔

"ناممکن.....اسے مرے ہوئے سو سال گزر چکے ہیں' کہیں خواب دیکھا ہوگا تم نے"۔ والد نے مذاق اڑانے کی کوشش کی مگر جنرل بدستور سنجیدہ رہا۔

"تمہارے ذہن میں اس کی موت کا جو تصور ہے اس کی نوعیت دوسری ہے۔ مرکالا کے جسم اور روح کا رشتہ ابھی پوری طرح منقطع نہیں ہوا۔ وہ ابھی زندہ ہے اور میرے یہاں آنے کا بڑا مقصد اس کا کھوج لگا کر بنی نوع انسان کو اس کے شر سے محفوظ کر دینا ہے"۔ جنرل کی باتوں سے شدید غم و غصہ اور جوش ٹپک رہا تھا۔ والد نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی سے اس کا منہ تکتے رہے۔

کھنڈر کے مغربی کونے میں بھاری بھرکم شہتیر زمین پر گرا پڑا تھا۔ جنرل اس کے پاس پہنچ کر رک گیا اور میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "بیٹی تم تھک چکی ہوگی' یہاں تھوڑی دیر ستا لیا جائے۔ میں اپنی سرگذشت بھی مکمل کرنا چاہتا ہوں"۔

میں سچ مچ بہت تھکی ہوئی تھی' فوراً بیٹھ گئی۔ جنرل نے آوازے دے کر لکڑہارے کو اپنے پاس بلایا جو قریب ہی ایک درخت کاٹنے میں مصروف تھا۔ کلہاڑا تھامے وہ چلا آیا۔ جنرل کو اس سے کوئی کام کی بات معلوم نہ ہو سکی۔ اسے مرکالا کے مقبرے کا علم نہ تھا' تاہم اس نے بتایا بوڑھا فارسٹ رینجر اس معاملے میں بڑی مدد کر سکتا ہے وہ کھنڈر کے چپے چپے سے واقف ہے۔ آجکل دو میل دور ایک قصبے میں فادر ولیم کے ساتھ رہتا ہے۔ قدرے پس و پیش کے بعد اس نے بوڑھے فارسٹ رینجر کو ساتھ لانے کی حامی بھرلی۔ وقت کی قلت کے پیش نظر بگھی کا ایک گھوڑا کھول کر اسے دے دیا گیا۔ اس نے اپنا کلہاڑا وہیں چھوڑا اور اسی وقت گاؤں کی طرف چل کھڑا ہوا۔

اس کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی جنرل نے اپنی سرگذشت کے اوراق الٹنا شروع کر دیے۔

"بچی کی بگڑتی ہوئی صحت سے پریشان ہو کر میں نے گراز کے ایک مشہور تجربہ کار اور عمر رسیدہ ڈاکٹر کو بلوا بھیجا۔ اس کے آنے میں کئی روز لگے۔ ایک مقامی ڈاکٹر کے ہمراہ اس نے مریضہ کا معائنہ کیا' پھر دونوں صلاح مشورے کے لیے ایک کمرے میں چلے گئے۔ میں بے ترتیب دھڑکنوں کے ساتھ دروازے کے باہر ٹہلتا رہا.......

"معاً" اندر سے اونچی آواز میں زور زور سے باتیں کرنے کا شور سنائی دیا۔ دونوں ڈاکٹر کسی بات پر جھگڑ رہے تھے۔ مجھ سے صبر نہ ہوسکا۔ بے اختیار دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ مجھے دیکھتے ہی مقامی ڈاکٹر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "جناب میرے فاضل دوست کا خیال ہے، آپ کو ڈاکٹر کی نہیں کسی جادوگر کی ضرورت ہے......"

کچھ پلے نہ پڑا۔ حیرت سے بوڑھے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے واضح اثرات تھے' تاہم اس نے بڑی ملائمت سے کہا۔ "میں مریضہ کے بارے میں اپنے نظریات کا تفصیلی ذکر بھی کسی مناسب وقت پر کروں گا۔ مجھے دلی رنج ہے جنرل' میرا علم اور تجربہ آپ کے کسی کام نہیں آسکتا۔ تاہم رخصت ہونے سے قبل میں چند ضروری باتیں آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں....."

پھر وہ میز پر جا بیٹھا اور تھوڑی دیر سوچنے کے بعد ایک کاغذ پر تیزی سے کچھ لکھنے لگا اور اسے تہ کر کے اٹھ کھڑا ہوا اور اسے میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میں نے اپنی تشخیص اس رقعے میں تحریر کر دی ہے۔ مختصراً الفاظ میں اتنا بتا دیتا ہوں کہ بچی کی بیماری عام بیماریوں سے یکسر مختلف ہے۔ آپ نے خاصی دیر کر دی۔ مریضہ بظاہر نیند میں ہے لیکن ایک دو روز کی مہمان ہے۔ میری صاف گوئی معاف کیجئے' اس کی جان بچانا چاہتے ہیں تو حملہ آور ہستی کو ٹھکانے لگانے کا بندوبست

کیجئے' اس میں خاصی احتیاط اور مہارت کی ضرورت ہے....."

"حملہ آور ہستی کون ہے؟" میں نے امید و بیم کی حالت میں پوچھا۔ ڈاکٹر نے میرے چہرے پر گہری نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "میں نے سب کچھ لکھ دیا ہے' میرے جانے کے بعد اسے غور سے پڑھ لیجئے....."

"دونوں ڈاکٹر جونہی رخصت ہوئے' میں نے جھٹ رقعہ کھول کر پڑھنا شروع کر دیا۔ وہ خرافات اور لایعنی باتوں کا پلندہ تھا۔ حد ہوگئی یہ ڈاکٹر کیسا ہے اسے تو کسی پاگل خانے میں بند ہونا چاہیئے' میں نے دل ہی دل میں کہا۔ اس نے رقعے میں لکھا تھا بچی کی بیماری کا اصل سبب ویمپائر ہے جو تمہاری بچی کا خون چوس رہی ہے۔ گردن پر ہلکا سانیلگوں نشان اور مرض کی دوسری علامات اس خیال کی تصدیق کرتی ہیں..... طب کی پرانی کتابوں میں اس طرح کے واقعات درج ہیں۔

ذہن' ڈاکٹر کی یہ توہم پرستانہ تشریح قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ اس کے باوجود رقعے میں لکھی ہوئی حفاظتی تدابیر پر عمل کرنے کا پروگرام بنایا.....

"رات کے وقت' میں بچی کی خواب گاہ سے ملحق تاریک ایک کمرے میں چھپ گیا اور ننگی تلوار سونتے ویمپائر کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ میری بچی جلد ہی گہری نیند سو گئی۔ اس کے سرہانے موم بتی روشن تھی رات کے ایک بجے میں نے اچانک دروازے کی دراڑ سے اندر جھانکا' اس کی پائنتی کی طرف کالی سی ایک چیز حرکت کرتی نظر آئی۔ اس کے خدوخال واضح نہ تھے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ پلنگ پر چڑھی اور خوابیدہ بچی کے گلے سے لپٹ گئی۔ اگلے ہی لمحے اس کی جسامت بڑھنا شروع ہوئی اور اس کا جسم تیزی سے پھولنے اور پچکنے لگا۔ یہ منظر دیکھ کر میرا کلیجہ منہ کو آنے لگا' پھر اپنے آپ پر قابو پایا اور تیزی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ آہٹ پاتے ہی وہ مکروہ شے پھرتی سے نیچے اتر کر پائنتی کی طرف سرک گئی۔

میں نے اسے ذرا قریب سے دیکھا' تو گھبرا کے پیچھے ہٹا۔ میرے سامنے ملار کا کھڑی تھی اور اس کی شرر بار آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔ میں نے

آؤ دیکھا نہ تاؤ' پوری قوت سے اس پر تلوار کا وار کیا۔ اس نے حیرت انگیز پھرتی سے اپنے جسم کو بل دیا اور فضا میں جیسے اڑتی ہوئی دروازے کے پاس جا رکی۔ وار خطا ہو جانے سے مجھ پر دیوانگی کا شدید دورہ پڑا میں تیزی سے اس کے پیچھے لپکا اور دوبارہ تلوار کا بھرپور ہاتھ مارا' لیکن وہ اچانک غائب ہوگئی۔ تلوار دروازے سے ٹکرائی اور ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی.....

"میں اس وقت کی محشر بداماں کیفیتیں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ رات بھر پاگلوں کی طرح صحن میں چکر کاٹتا اور اپنے سر کے بال نوچتا رہا۔ ملار کا پھر کہیں نظر نہ آئی' لیکن میری بچی بھی جانبر نہ ہو سکی۔ صبح ہوتے ہی اس نے دم توڑ دیا"۔

داستان ختم ہوئی تو چاروں طرف گہری سوگوار سی خاموشی چھا گئی اور اس نے بھائیں بھائیں کرتے کھنڈر اور وحشت ناک سناٹے سے ابھرنے والے تاثر کو زیادہ ہولناک بنا دیا۔ والد اپنا دھیان بٹانے کی خاطر مقبروں کے کتبے اور تختیاں پڑھنے میں مشغول ہوگئے۔ میں اپنے حالات کے بارے میں سوچنے لگی۔ معاً" اداس اور آسیب زدہ سناٹے میں کارمیلا کی کھنکتی ہنسی سنائی دی اور میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ اس کے آنے سے کچھ سہارا سا ہوا۔ وہ مادام لافونٹن کے ساتھ آئی تھی' لیکن وہ بلند ٹیلے کی اوٹ میں تھیں۔ ان کی آوازیں ہر لمحے قریب آتی جا رہی تھیں۔ ناگاہ پرانی اور شکستہ محراب کے پیچھے سے کارمیلا کا مسکراتا چہرہ نمودار ہوا۔ جنرل' قریب ہی درخت کا سہارا لئے سر جھکائے اداس کھڑا تھا اور آنکھوں میں امڈتا ہوا سیلِ اشک روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ قدموں کی چاپ سن کر اس نے سر اٹھایا اور پھر اس سے پہلے کہ میں کارمیلا کو اپنی طرف متوجہ کرتی' جنرل نے قریب ہی پڑا ہوا کلہاڑا اٹھایا اور ایک گرجدار نعرہ بلند کرتا ہوا اس کی طرف لپکا۔

گرجدار آواز سن کر کارمیلا نے اس سمت میں دیکھا اور ٹھٹھک کر رہ گئی۔ اگلے ہی لمحے اس کے چہرے پر شدید نفرت اور غصے کی علامتیں نمودار ہوئیں۔ مٹھیاں بھنچ گئیں اور یکسر مختلف شخصیت نظر آنے لگی۔ جنرل نے اس پر کلہاڑے

کا وار کر دیا لیکن کارمیلا نے پھرتی سے اچھل کر جگہ بدل لی۔ وار خطا گیا۔

جنرل دوبارہ حملے کے لیے کلہاڑا تول رہا تھا کہ بپھری ہوئی کارمیلا نے یکایک جست لگائی اور اس کا کلہاڑے والا ہاتھ پکڑ لیا۔ جنرل نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی بے پناہ کوشش کی' مگر بے سود۔ کارمیلا ایسی نحیف ونزار لڑکی کے جسم میں اس وقت نجانے کہاں سے اتنی طاقت آگئی تھی کہ مضبوط تن وتوش رکھنے والا جنرل بھی بے بس ہوکر رہ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کلہاڑے پر جنرل کی گرفت ڈھیلی پڑگی اور کلہاڑا ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے آرہا۔ کارمیلا اس کا ہاتھ نفرت سے جھٹک کر چھلاوے کی طرح غائب ہوگئی۔

جنرل لڑکھڑاتا دیوار کی طرف بڑھا اور ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا۔ اس کی پیشانی عرق آلود تھی اور رنگ پھیکا پڑ چکا تھا۔ میں گم صم بیٹھی خلا میں گھورتی رہی۔ یہ سارا واقعہ اس ڈرامائی انداز سے رونما ہوا کہ کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہ ملا۔ اس پر حقیقت سے زیادہ خواب کا گمان ہوتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد حواس بحال ہوئے تو مادام لافونٹن کو پہلو میں کھڑا پایا۔ وہ بار بار پوچھ رہی تھی۔ "کارمیلا کہاں ہے؟"

"میں نہیں جانتی۔ ایک منٹ پہلے سامنے والی شکستہ محراب میں داخل ہوئی تھی۔"

"میں راستے میں کھڑی تھی۔ میں نے اسے واپس جاتے نہیں دیکھا۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور مادام کارمیلا کارمیلا پکارتی رہی۔

جنرل' ستون کے ساتھ لگا' پیچ وتاب کھا رہا تھا۔ مادام لافونٹن کے منہ سے کارمیلا کا نام سنا' تو اس نے پوچھا۔ "کیا اس لڑکی کا نام کارمیلا تھا؟"

"جی ہاں۔" میں نے مختصر سا جواب دیا اور اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"ارے وہ تو ملارکا تھی' میری بچی کی قاتل۔ نام خواہ کوئی ہو' وہ اصل میں پُراسرار مرکالا کاؤنٹس آف کارن سٹین ہے۔"

اتنے میں لکڑہارا واپس آگیا۔ فارسٹ رینجر اس کے ساتھ تھا۔ رسمی علیک

سلیک اور مزاج پرسی کے بعد سنجیدہ گفتگو چھڑ گئی۔ فارسٹ رینجر نے اپنی جیب سے تہ کیا ہوا ایک بوسیدہ کاغذ نکالا اور اسے کھول کر ایک قبر کے تعویذ پر پھیلا دیا۔ پھر وہ سب اس پر جھک گئے۔ یہ کارن سٹین کے قلعے کا تفصیلی نقشہ تھا۔ فارسٹ رینجر اس پر پنسل سے آڑھے ترچھے نشان لگاتا رہا۔

میں دُور ہونے کی وجہ سے ان کی گفتگو سننے سے قاصر تھی۔ خاموش بیٹھی تعجب سے ان کی حرکات دیکھتی رہی۔ بحث مباحثے کے بعد انہوں نے نقشہ لپیٹ دیا اور سامنے ملبے کا ایک ڈھیر مرکزی نقطہ قرار پایا اور وہ مشرقی سمت میں مختلف زاویوں سے زمین ماپنے لگے۔ اس طرح جلد ہی ایک قبر کے سرہانے جاکر رک گئے۔ یہ ایک ٹوٹی پھوٹی قبر تھی اور سرہانے کا پتھر غائب تھا' چنانچہ اس میں دفن ہونے والی کی شخصیت کا پتا نہ چلتا تھا۔ فارسٹ رینجر نے لکڑہارے سے قبر کھدوانا شروع کی۔ جنرل بھی اس کے ساتھ شامل ہوگیا' نیچے سے بھاری بھرکم سنگی تابوت برآمد ہُوا۔ سب نے مل کر اسے باہر نکالا۔

جنرل نے دعائیہ انداز میں آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے اور بلند آواز میں کہا۔ "یارب العالمین تیرا لاکھ لاکھ شکر کہ تو نے مجھے اپنے مقصد میں کامیاب کیا۔ اب اسے ٹھکانے لگانے کی توفیق عطا کر' تاکہ نوعِ انسان اس خبیث بد رُوح کے شر اور کارستانیوں سے نجات پائیں۔"

تابوت کا بالائی حصہ مضبوطی سے بند تھا۔ اسے کھولنے میں بہت دشواری پیش آئی۔ ڈھکنا اٹھتے ہی میں نے آگے بڑھ کر تابوت کے اندر جھانکا لیکن ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔ وہاں خون ہی خون تھا اور اس کے بیچوں بیچ میری حسین و جمیل کارمیلا بڑے مزے سے لیٹی تھی۔ اس کی آنکھیں کچھ یوں کھلی تھیں جیسے وہ ابھی اٹھ کر بیٹھ جائے گی۔

جنرل کو اصرار تھا' یہ ملارکا ہے۔ بوڑھے رینجر نے بتایا کارمیلا' ملارکا یا مرکالا ایک ہی شخصیت کے تین روپ ہیں۔ کاؤنٹس آف کارن سٹین بڑی ظالم اور سفاک عورت تھی۔ لیکن اسے عشق میں ناکامی کا داغ اٹھانا پڑا اور اس نے

خودکشی کرلی۔ بنی نوع انسان سے انتقام لینے کے لیے بد روح کا روپ دھار لیا۔ علاقے کی تاریخ اور کارن سٹین خاندان کے بارے میں ان کی معلومات اور رائے سند مانی جاتی تھی۔ ان کے پاس لاتعداد پرانی کتابیں اور کارن سٹین خاندان کے افراد کی ذاتی ڈائیریاں محفوظ تھیں۔ ان کی بات سن کر مزید بحث ختم ہوگئی۔ ہم سب دوبارہ تابوت کی طرف متوجہ ہوئے۔

کارمیلا کی لاش بالکل صحیح حالت میں تھی۔ اعضا میں زندہ انسانوں کی سی لچک اور چہرہ دمک رہا تھا۔ یہ اس کے ویمپائر کی واضح علامات تھیں۔ ایک نوکیلا کھونٹا اس کے قلب میں بھونکا گیا۔ کارمیلا کے منہ سے فلک شگاف چیخ نکلی، پھر اس کی گردن تلوار سے کاٹ کر الگ کردی گئی اور اسے باقی جسم کے ساتھ جلا ڈالا۔ جنرل نے راکھ دریا میں بہنے کے لیے محفوظ کرلی۔

اس کام سے فارغ ہوکر ہم واپس گھر آئے، تو دن ڈھل چکا تھا۔ رات بھر کارمیلا کا معصوم اور خوبصورت چہرہ نظروں کے سامنے گھومتا رہا، لیکن حیرت کی بات اس رات کسی ڈراؤنے خواب نے پریشان نہ کیا۔ چند دن بعد والد مجھے میرو تفریح کے لیے اٹلی لے گئے اور وہاں میری صحت قابلِ رشک حد تک اچھی ہوگئی۔ کارمیلا کے تمام نقوش مٹ گئے اور میری زندگی میں خوشیاں رقص کرنے لگیں۔